اُردو طنز و مزاح پر مبنی دو ماہی برقی مجلّہ

ارمغانِ ابتسام

ستمبر تا دسمبر ۲۰۱۸ء

مُدیر:

نوید ظفر کیانی

اُردو طنز و مزاح پر مبنی دو ماہی برقی مجلّہ

ارمغانِ ابتسام

ستمبر تا دسمبر ۲۰۱۸ء

شمارہ نمبر ۱۸

مُدیر:

نوید ظفر کیانی

مشاورت:

کے ایم خالد

خادم حسین مجاہد

روبینہ شاہین

محمد امین

http://www.facebook.com/groups/837838569567305/

برقی ڈاک کا پتہ برائے خط و کتابت

mudeer.ai.new@gmail.com

حلقہ ارباب مزاح

مزاح نگار ڈائریکٹری

مرتب کرنے کا ارادہ رکھتا ہے حلقہ ارباب مزاح کی خواہش ہے پوری دنیا
میں بسنے والے ہر اس مزاح نگار کا تعارف اس میں شامل ہو جس کے قلم
نے کسی بھی ذی روح کے ہونٹوں پر مسکان دی ہو

زیادہ سے زیادہ آٹھ سو الفاظ پر مشتمل اپنا تفصیلی تعارف ان پیج فارمیٹ میں اپنی خوبصورت ترین تصویر (شادی والے دن کے علاوہ) حلقہ ارباب مزاح کو ای میل ایڈریس halqa.mezah@gmail.com پر ای میل کر دیں۔ آپ کا تعارف درج ذیل نکات کا احاطہ کرتا ہو۔

☆ پیدائش کا علاقہ (شہر اور ملک)، گردش دوراں نے کون کون سے علاقے دکھائے اور موجودہ سکونت کس شہر (ملک) میں ہے۔
☆ اسکول، کالج یونیورسٹی کے نام اور تعلیمی دور کا کوئی یادگار واقعہ
☆ لکھنے کا آغاز کتنی عمر اور کہاں اور کس ادیب سے متاثر ہو کر کیا، پہلی تحریر کہاں چھپی۔
☆ جرائد، اخبارات اور ویب سائٹس کے نام۔
☆ کسی ادبی شخصیت سے دوستی یا ملاقات کا کوئی واقعہ
☆ شائع شدہ کتابوں کے نام پبلشرز کی تفصیل کے ساتھ (اگر شائع ہوئی ہوں)۔
☆ مستقبل میں آنے والی کتابوں کے نام۔
☆ کسی ریڈیو یا ٹی وی کے پروگرام میں شرکت کی ہو تو چینل اور پروگرام کا نام۔
☆ حکومت یا کسی ادارے سے کوئی ایوارڈ حاصل کیا ہو تو اس کی تفصیل۔
☆ رہائش کا پتہ (آپشنل) ای میل ایڈریس (ضروری)، موبائل فون (آپشنل)
☆ فیس بک آئی ڈی (ضروری)، ٹویٹر آئی ڈی (اگر ہے تو)، سکائپ (اگر ہے تو)
☆ چند تحریروں کے ویب سائٹ لنک یا اپنی تحریر کے چند سیکن نمونے ضرور ای میل کریں۔

اگر فیس بک کے دوست اپنے قرب و جوار میں رہنے والے کسی مزاح گو شاعر، مزاح نگار یا کارٹونسٹ سے واقف ہوں تو ان کا تعارف حلقہ ارباب مزاح تک پہنچائیں تا کہ ان کا تعارف "مزاح نگار ڈائریکٹری" کی زینت بن سکے۔

مزاح نگاروں کا ایک با اعتماد، نمائندہ حلقہ

کیا کیا کہاں کہاں

اداریہ

پرانے چاول

قند شیریں

چوکے ہی چوکے

ادب و دب

مزاحیے

مزلیات کم غزلیات

جستہ خستہ

کالم گلوچ

قہقہہ نواز

دیسی لمرک

چوکے با تصویر

اِس کے علاوہ اُرسلانؔ بلوچ، ملک زادہ منظور احمد، محمد خالد اختر، ممتاز مفتی، کرنل اشفاق حسین، ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی، مشفق خواجہ، کرنل محمد خان وغیرہ کے جستہ جستہ فقروں، قہقہہ آور چٹکلوں اور ادارہ ہذا کے تشخیص کردہ شرارتی کارٹون، مجلّے کے مختلف صفحات پر۔

مشتری ہوشیار باش

ارمغانِ ابتسام کے گزشتہ شمارے archive.org کے ذیل کے ربط پر دستیاب ہیں:

https://archive.org/details/@nzkiani

ٹیسٹ ٹیوب لیڈرشپ

اداریہ

کچھ میڈیا اینکر زبان کی اصلاح کے حوالے سے جو کوشش کرتے ہیں وہ لائقِ تحسین ہیں لیکن انھی پروگراموں میں موجود بھانڈ اپنی جگتوں سے ان کا اثر زائل کر دیتے ہیں اور پھر انھی چینلز کے ڈراموں میں اردو کا جو پوسٹ مارٹم کیا جاتا ہے اسے دیکھتا ہے تو کہہ اُٹھتا ہے ع

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں

مثلاً ان ڈراموں میں جذبات کی جگہ جذباتوں، خواتین کی جگہ خواتینوں اور الفاظ کی جگہ الفاظوں جیسے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔ جمع کا یہ قاعدہ خالصتاً میڈیا کی ایجاد ہے، جس سے اہلِ نظر بھی اچھنبے میں ہیں۔ پھر کیا خواص اور کیا عوام، انگریزوں سے مرعوبیت کی کوئی حد ہی نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ انگریزی بڑی جامع زبان ہے، اس میں کتنے ہی رشتوں کے ایک نام ہیں مثلاً کزن جو چچازاد، خالہ زاد، پھوپھی زاد، تایا زاد سبھی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ یہی صورت انکل اور آنٹی کی ہے جو علی الترتیب چچا، ماموں، خالو، پھوپھا تایا، اور پھوپھی، ممانی، چچی، خالہ تائی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ دیکھا جائے تو یہ انگریزی کی خوبی نہیں خامی ہے کہ اس میں رشتے کی اصلیت کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ جتنی وضاحت اُردو میں موجود ہے انگریزی میں تو اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، بلکہ انگریزی میں تو یہ رشتے تعلق چھپانے کیلئے بھی کام آتے ہیں، مثلاً کوئی لڑکا اور لڑکی بغیر رشتے کے بیٹھے ہوں تو پوچھنے پر کزن کا رشتہ ہی سامنے آتا ہے۔ اب اس میں اتنے رشتے چھپے ہوئے ہیں کہ کوئی مزید تفتیش کیا کرے، وہیں زبان بند ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی ہوشیار بننے کی کوشش کرے تو اسے فرسٹ، سیکنڈ یا تھرڈ کزن کا بتا کر جان چھڑا لی جاتی ہے۔ کچھ ایسا ہی مسئلہ ''براوران لاء'' اور ''سسٹران لاء'' میں ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ دیور ہے یا جیٹھ، سالا بہنوئی یا ہم زلف اور سالی ہے یا بھابھی، دیورانی ہے یا جیٹھانی، نند یا سلج سالے کی بیوی؟ یہ وضاحت اردو میں موجود ہے کہ ہر لفظ سے اس کے رشتے کا جغرافیہ بآسانی معلوم ہو جاتا ہے۔ انگلش کی اصل خوبی کچھ اور ہے کہ اس میں ''واولز'' کی شکل میں اعراب لفظ کے اندر شامل ہوتے ہیں اور لفظ کا درست تلفظ کرنا آسان ہوتا ہے جبکہ اُردو فارسی اور عربی وغیرہ میں اہلِ زبان کے علاوہ اعراب کے بغیر درست تلفظ کرنا آسان نہیں ہوتا۔ ایک زبان، قوم اور مذہب کے لوگوں کا دوسری زبان، قوم اور مذہب والوں سے تعصب کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ عرب اپنی فصاحت و بلاغت کی وجہ سے باقی دنیا کو عجم (گونگا) کہتے تھے۔ آریہ خود کو تہذیب کا ضامن سمجھتے تھے۔ انہوں نے غیر آریہ اقوام کیلئے ''اناریہ'' کا لفظ متعارف کرایا جو رفتہ رفتہ ''اناڑی'' کی شکل اختیار کر گیا، جو بے شعور، بے وقوف اور ناتجربہ کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ اسی طرح بدھ مت کے پیروکاروں سے ناپسندیدگی کے لئے بدھو کا لفظ احمق، بے شعور اور بیوقوف کے معنوں میں استعمال ہونے لگا ورنہ اس لفظ کے حقیقی معنی عقل مند کے تھے۔ پارس والے عربوں کو جانگلی اور بدتہذیب سمجھتے تھے اور خود کو مہذب، حالانکہ امرد پرستی کی بیماری میں مبتلا تھے، جیسے آج مغرب اور امریکہ ہے کہ دنیا بھر کی اخلاقی بیماریوں کا شکار ہے اور خود کو مہذب سمجھتا ہے اور باقی دنیا کو غیر مہذب، ایسے ہی بدھ سادھو جو علم و عرفان کی اونچی منزل پہ پہنچ کر دنیا سے غافل ہو جاتے ہیں، ان کو ادھوت کہتے تھے۔ شراب کے نشے میں مدہوش ہونے والوں کو اسی نسبت سے ''دھت'' کہا جانے لگا۔ شہری دیہاتیوں سے اور دیہاتی شہریوں سے تعصب رکھتے ہیں اور ایک ذات والے دوسری ذات سے۔ اسی لئے آپ پٹھانوں، بٹوں، آرائیوں اور شیخوں کے لطیفے سنتے اور پڑھتے ہیں جو صحت مند رویہ ہرگز نہیں، نہ ہی یہ مزاح ہے۔ انفرادی خامی تو کسی میں بھی ہو سکتی ہے۔ اس سے پوری قوم کو نشانہ بنانا قرینِ انصاف نہیں، نہ یہ مزاح ہے اور خامی کس میں نہیں پائی جاتی، اللہ تعالیٰ ہمیں دوسروں کی بجائے اپنی خامیاں دیکھنے اور انہیں دُور کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

خادم حسین مجاہد

چچا عبدالباقی اور مچھلیاں

محمد خالد اختر

دراصل بھتیجے! مجھے جو دقت رہی ہے وہ یہ کہ مجھے ایسے حصہ دار نہیں ملتے جن میں سرمایہ لگانے کا حوصلہ ہو، ورنہ بزنس میگنیٹ بننا کون سی مشکل چیز ہے، ایک سگریٹ تو پلاؤ!!

چچا عبدالباقی اور میں ایک سنہری شام وکٹوریہ روڈ پر چہل قدمی کر رہے تھے۔ چچا اپنے حصہ داروں کی خصاصت پر اپنے خیالات کا اظہار کر رہا تھا۔ ہم کو اپنے پچھلے مشترکہ کاروبار میں (جس کا تعلق غالباً پرانے ٹکٹوں کی فروخت سے تھا اور جس میں چچا عبدالباقی، اس کا دس سالہ بیٹا اور میں برابر کے حصہ دار تھے) بڑا نقصان برداشت کرنا پڑا تھا۔ اس کے بعد سے ہمارے تعلقات قدرے کشیدہ ہو گئے تھے۔ چچا عبدالباقی کا اپنے حصہ داروں کی خصاصت کا ذکر مجھے ایک نرم گوشے میں چھونے کی خاطر تھا۔

اُس نے مجھے صفائی کی مہلت نہ دیتے ہوئے اپنی تقریر کو جاری رکھا۔

''ورنہ۔۔۔'' اُس نے سگریٹ کے دو لمبے لمبے کش لئے ''ورنہ بھائی بختیار! میں بڑے کام کا آدمی ہوں، آج تک اپنے سے اچھا آرگنائزر دیکھنے کی حسرت ہی رہی ہے۔ کیا میں نے تم سے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ پچھلے ہفتے جب میں سیکرٹری تربیتِ حیوان سے ملا تو ایک گھنٹے کی ہی گفتگو میں وہ میرا اِس قدر گرویدہ ہو گیا کہ کہنے لگا عبدالباقی صاحب، میں متعجب ہوں، میری سمجھ سے بالا ہے کہ اس قدر خوبیاں ایک واحد شخص میں کیسے اکٹھی ہو گئیں؟ آپ سچ سچ بتایئے، بھلا اِتنا عرصہ کہاں چھپے رہے؟؟ آپ کو تو کسی ملک میں سفیر ہونا چاہیئے تھا۔''

ایک فرمانبردار بھتیجے کی طرح میں نے سیکرٹری تربیتِ حیوان کی چچا کی قابلیت کے متعلق رائے سے اتفاق کرتے ہوئے خیال ظاہر کیا کہ چچا جیسے شخص کے لئے واحد موزوں جگہ سینٹر میں وزارت ہے۔

مسرت کی سلوٹیں اس کے گول دُودھ پیتے بچے کے سے چہرے پر نمودار ہوئیں۔ اس نے اپنا ہاتھ اپنے فربہ ہاتھ میں لے کر تشکرانہ اور رازداری کے اظہار کے طور پر دبایا ''بھئی بختیار! تم اُن معدودے چند آدمیوں میں سے ہو جو مجھے سمجھ پائے ہو لیکن عبدالباقی کو منسٹر کون بناتا ہے، یہاں تو بھتیجے، قابل آدمیوں کو نزدیک نہیں پھٹکنے دیتے ہیں۔''

ہم پیراڈائز سینما کے سامنے کوئی بیسویں دفعہ رُکے۔ ٹکٹ گھر کے سامنے ''کیو'' لگنا شروع ہو چکا تھا۔ ہم کچھ دیر کھڑے داخلے کے اُوپر لگے ہوئے فلم کے رنگین اشتہار کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے رہے۔ ہم دونوں اس انتظار میں تھے کہ ہم میں سے کون (دوسرے کو) فلم دکھانے کی دعوت دیتا ہے۔ میری جیب میں لے دے کے صرف ساڑھے بارہ آنے تھے اور چچا عبدالباقی اپنی جیب میں نقد ڈال کر گھر سے باہر آنے کے حق میں کبھی نہیں رہے۔

''پکچر کون سی ہے؟ سیمسن اینڈ ڈیلیلا؟؟'' چچا عبدالباقی

نے ظاہراً اتفاقیہ لہجے میں کہا ''اچھی معلوم ہوتی ہے۔ سُنا ہے، بیلیکل کہانی ہے۔''

''کیا خیال ہے، اسے دیکھا نہ جائے؟'' میں نے پُر اُمید نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ممکن تھا کہ وہ شائد زندگی میں پہلی مرتبہ اپنا اُصول بھول گیا ہو۔

''جیسے تمھاری مرضی بھتیجے!'' چچا عبدالباقی نے کہا ''اگر پکچر دیکھنے کی صلاح ہے تو ابھی سے کیو میں جا کر کھڑے ہو جاؤ۔''

مجھے اقرار کرنا پڑا کہ میری جیب میں کل بارہ آنے ہیں۔

''اوہو، بھئی بختیار، تم نے مجھے گھر کیوں نہ بتایا کہ تمھارا پکچر دیکھنے کا ارادہ ہے، میں پیسے جیب میں رکھ لیتا۔ ویسے بھتیجے، میرا یہ مشورہ ہے، بُرا ماننے کی ضرورت نہیں کہ جب تک جیب میں پیسے نہ ہوں، تمھیں لوگوں کو سینما دیکھنے کی دعوت دینے سے گریز کرنا چاہئے، یہ ایٹی کیٹ نہیں۔'' اس کے انداز میں قدرے رنجش کا اشارہ تھا۔ پھر اس نے کہا ''تم مجھ سے اگلے روز گروی کی دکان کے بارے میں پوچھ رہے تھے؟ یہاں پاس ہی کھارادر میں ایک گروی کا مکان ہے، جہاں گھڑیاں اور فونٹین پین وغیرہ گروی رکھے جاسکتے ہیں۔''

اس نے پُر اُمید نظروں سے کوٹ کی اُوپر والی جیب میں لگے ہوئے پارکر فونٹین پین کو دیکھا جسے میں نے اپنے دوست محمد منیر تنویر سے چند دنوں کے لئے مستعار لیا تھا۔

''اس وقت گھڑی میرے پاس نہیں ہے، پھر کسی وقت سہی۔'' میں نے جواب دیا۔

''فونٹین پین بھی گروی رکھے جاسکتے ہیں۔'' چچا عبدالباقی نے کہا ''پروپرائٹر میرا دوست ہے، چلو گروی نہ رکھنا، میرے ساتھ آؤ، دکان کے دیکھ لینے میں کوئی حرج نہیں۔''

''چچا، تم مجھے دکان دکھانے پر اتنے مصر ہو جیسے تم خود اسے چلا رہے ہو۔''

اس بات سے اسے کچھ تکلیف پہنچی اور ہم دونوں ایک دوسرے سے رُوٹھے اور کھنچے ہوئے پیراڈائز سے واپس ہو کر پٹری پر درمیان میں فاصلہ رکھ کر چلنے لگے۔ یک لخت میں نے دیکھا کہ چچا عبدالباقی کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا۔ جاسوسی ناول نگاروں کے الفاظ میں نعش کی طرح زرد۔ اُس نے اچانک ایک غوطہ لگایا اور پاس کی دکانوں میں سے ایک میں ایک لمحہ کے اندر اندر پھرتی سے غائب ہوگیا۔ میں کھڑا ہو کر چچا کی اِس عجیب حرکت پر تعجب کر رہا تھا۔ ایک طرحدار پگڑی پہنے خوفناک شکل کا انسان، جس کے چہرے سے مَن ٹنوں کے حساب سے برس رہا تھا، میرے روبرو آکر ٹھہر گیا۔

''یہ آدمی جو ابھی آپ کے ساتھ ساتھ آرہا تھا، کہاں چلا گیا ہے؟'' اس نے اپنی چھڑی ہلاتے ہوئے کہا۔

''کون سا آدمی؟'' میں نے معصومیت سے پوچھا۔

''وہ آدمی جو آپ کے ہمراہ تھا، اس کا نام عبدالباقی ہے۔''

''عبدالباقی؟''

''جی، عبدالباقی ـــ ابھی ابھی آپ کے ساتھ آرہا تھا۔'' طرحدار آدمی اب اپنے آپ کو بیوقوف محسوس کر رہا تھا ''ترکی ٹوپی پہنے ہوئے تھا، موٹا تازہ آدمی تھا۔ معصوم بچوں کا سا چہرہ تھا، چوکور شیشوں کی عینک پہنتا ہے، کراچی میں اس وقت غالباً سب سے مشہور چارسوبیس ہے۔''

''میں اسے نہیں جانتا۔'' میں نے کہا ''ویسے شکریہ، میں اس سے بچ کر رہوں گا۔''

''مجھے یقین ہے کہ وہ آپ کے ہمراہ تھا۔''

''ہوسکتا ہے، بہت ممکن ہے۔۔۔ آپ اس سے۔۔۔ عبدالباقی سے ملنے کے اس قدر مشتاق کیوں ہیں؟''

''اس کو میرا چار ہزار روپیہ دینا ہے۔ اس کے گھر جاؤ تو اندر سے کہلوا بھیجتا ہے کہ وہ گھر پر نہیں ہے۔''

''یہ تو آج کل کئی لوگ کرتے ہیں، میں خود اسی طرح کرتا ہوں۔''

طرحدار پگڑی والا شخص مجھے قاتلانہ نگاہوں سے گھورتا ہوا آگے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے اِرد گرد چچا عبدالباقی کی تلاش میں نظریں دوڑائیں، وہ بالکل غائب ہو چکا تھا اور مجھے کہیں نظر نہ آتا تھا۔ پھر میں نے ایک آواز سُنی ''بھتیجے، آل

کلیر ہو گیا؟''
آواز کی سمت دیکھتے ہوئے میں نے چچا عبدالباقی کی چوکور عینکوں کو ہئیر سیلون کے سوئنگ دروازے کے اوپر دمکتے ہوئے پایا۔
''آل کلیر ہے، آجائیں۔'' میں نے کہا۔
''اچھی طرح اطمینان کرلو کہ وہ آدمی واقعی چلا گیا ہے۔''
میرے اطمینان دلانے پر وہ سوئنگ ڈور سے باہر نکلا۔ اس نے مجھ سے آٹھ آنے اُدھار لئے اور ہیر سیلون میں حجامت کرانے کے لئے لوٹ گیا۔ اس نے کہا کہ حجام اُسترا لئے اس کا انتظار کر رہا ہے اور اس وقت حجامت بنوائے بغیر چل دینا شرافت سے بعید امر ہے۔ جس وقت حجامت کرا کے باہر نکلا تو میں نے اس سے اس طرح بھاگنے کی وجہ پوچھی۔
''یہ طرے والا آدمی کون تھا؟'' میں نے پوچھا ''مجھ سے کہہ رہا تھا کہ تم سے چار ہزار روپیہ لینا ہے۔''
''اِس شخص کا نام ایم اے خان ہے۔'' چچا عبدالباقی نے مجھے اطلاع دی ''یہ نہایت کم ظرف اور ذلیل انسان ہے، یہ موٹر سپئر پرزوں کے کاروبار میں میرا برابر کا حصہ دار تھا۔ اس کی خصاصت کی وجہ سے فرم کو سات ہزار روپے کا خسارہ ہوا۔ اس کا خیال ہے کہ میں چار ہزار روپیہ کا مال خورد برد کر گیا ہوں، دراصل بھتیجے، تم میں ایک مکمل حصہ دار بننے کی صلاحیت ہے، تم اور میں اگر مل کر کوئی کام شروع کریں تو۔۔۔''
چچا عبدالباقی میرا مکمل حصہ دار بننے کا درست ہی کہہ رہا تھا۔ ہماری دوستی اِتنی تباہ کن کاروباری شرکتوں کے بعد بھی فاتحانہ طور پر زندہ رہ گئی تھی لیکن پچھلے تجربات کی بناء پر میں نے اس موڑ کو، جو گفتگواب لینے لگی تھی، پسند نہ کیا اور محتاط ہو گیا۔
''مجھے ابھی ہیر کٹنگ سیلون میں ایک خیال سوجھا ہے۔'' چچا عبدالباقی نے اپنے بازو میرے بازو میں منسلک کرتے ہوئے کہا ''مجھے ہمیشہ اپنی بہترین سکیمیں شیو کراتے ہوئے سوجھتی ہیں ۔۔۔ میں چاہتا ہوں تم بھی اس پر غور کرو۔''
''میں اسے سننا چاہتا ہوں۔'' میں کراہا۔
''بھئی وہی ڈپٹی سیکرٹری تربیتِ حیوانات، جس نے پچھلے دِنوں ملاقات کی تھی اور جو میرا اِس قدر مداح ہے کہ وہ مجھے یہ ٹھیکہ دلوانے میں پوری مدد دے گا، وہ اپنے لئے منافع میں دس فیصد سے زیادہ کی بھی خواہش نہیں رکھتا۔ میں تم سے اِس معاملے میں بہت پہلے گفتگو کرنا چاہتا تھا اگر تم مجھے ملے ہی اِتنے دنوں بعد ہو۔''
''کیا وہ تمھیں سفارت دلوانے میں مدد نہیں دے گا؟'' میں نے پوچھا۔
چچا عبدالباقی نے میرے اوچھے وار کو نظر انداز کرتے ہوئے گورنمنٹ فشریز کی مچھلیوں کے ٹھیکے کے فوائد مجھ پر واضح کئے۔
''بھئی بختیار، یہ ایک ایسی بزنس ہے، جس میں نقصان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تو گھر بیٹھے بٹھائے نوٹ بنانے والی بات ہے۔ گورنمنٹ فشریز ڈیپارٹمنٹ کے ٹرالر مچھلیوں کے کیچ ہفتے میں دو روز لاتے ہیں۔ ہمارا کام محض اِتنا ہوگا کہ ڈاکس پر جا کر اس مال کو مچھلی کے تھوک بیوپاریوں کے ہاتھ نیلام کر دیں اور رقم جیب میں ڈال کر مزے سے گھر آجائیں۔ میں نے ابھی شیو کراتے ہوئے سارا حساب کر کے دیکھا ہے۔ ایک کیچ پر کم از کم پانچ ہزار روپیہ ہمیں بچتا ہے، یعنی س خرچ وغیرہ نکالنے کے بعد۔''
''تو چچا، یہ ٹھیکہ تم کیوں نہیں لے لیتے؟'' میں نے اپنے آپ کو اس سکیم سے علیٰحدہ کرتے ہوئے کہا۔
''اور مزے کی بات یہ ہے۔۔۔'' چچا عبدالباقی نے کہا'' کہ اس کے لئے سرمایہ کی بھی ضرورت نہیں۔ چار ہزار روپیہ سے کام شروع کیا جاسکتا ہے۔ یہ تو ڈپٹی سیکرٹری مجھ پر ذاتی طور پر احسان کرنا چاہتا ہے ورنہ اس ٹھیکے کے لئے تو بڑی تگ ودو اور سفارش کی ضرورت ہے۔۔۔ دراصل یہ ڈپٹی سیکرٹری میرا گرویدہ ہو گیا ہے۔''
''لیکن چچا، یہ چار ہزار کی رقم تم کہاں سے لو گے؟''
''بھئی بختیار، تمھارا خیال ہے کہ میں اس میں تمھیں حصہ دار نہیں بناؤں گا؟ تم کیسے سوچ سکتے ہو کہ اِتنے تعلقات کے بعد میں اِس قدر کمینگی کا مظاہرہ کروں گا۔۔۔ اس پر غور کرو بھتیجے! یہ سونے کی کان ہے، روپیہ کماؤ، بزنس میگنیٹ بنو۔۔۔''

ایک غرارہ پوش لڑکی ہمارے پاس سے گزری اور چچا نے اُسے دیکھتے ہوئے ہونٹوں کو سکیڑ کر سیٹی بجائی۔ دراصل اس وقت وہ اپنے آپ کو اپنی عمر سے بیس سال چھوٹا محسوس کر رہا تھا۔ اس کی چال میں بھی طفلانہ لچک آ گئی تھی۔ مچھلیوں نے مستقبل کو خوش آئند اور گلابی بنا دیا تھا۔

ہم چلتے چلتے وکٹوریہ روڈ کے آخیر میں ایک موٹر شوروم کے سامنے رُک گئے۔ بڑے بڑے شیشوں کے دروازے کے پیچھے بجلی کی تیز سفید روشنی میں چمکیلی موٹر کاریں ایک دوسرے سے ناک بھڑائے کھڑی تھیں۔ چچا عبدالباقی نے ان کو گہری دلچسپی سے دیکھا۔

''بھتیجے!'' چچا عبدالباقی نے کہا ''ذرا سوچو! مہینے کے آخر میں ہم دونوں کے پاس فسٹ کلاس موٹر کاریں ہوں گی۔ میں نے تو کیڈلاک خریدنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ڈپٹی سیکریٹری تربیتِ حیوان کے پاس بھی کیڈلاک ہے۔ ایک مہینے کے بعد ہم کراچی کے ''فش کنگ'' ہوں گے۔

چچا عبدالباقی شوروم میں جا کر کاروں کی قیمتیں دریافت کرنے کا آرزومند تھا لیکن میرے یہ بتانے پر کہ یہ کیڈلاک کاریں نہیں بلکہ گھٹیا میک کی کاریں ہیں، اس نے اپنا ارادہ تبدیل کر دیا۔

آگے چلتے ہوئے اس نے اپنے حصہ دار کو ایک اور فیاضانہ پیشکش کی۔

''اور بھتیجے!'' اس نے کہا ''اس دفعہ میں تم کو سرمایہ لگانے کے لئے نہیں کہوں گا، اس کے باوجود تمھارا پچاس کا حصہ ہوا۔ سرمائے کی ایک ایک پائی تک میری ہوگی، تمھیں صرف پہلے مجھے چار ہزار روپیہ بطور قرضِ حسنہ کے دینا ہوگا، ایک مہینے کے اندر تمھارا یہ چار ہزار تمھیں واپس مل جائے گا، ایک ایک پائی۔۔۔''

''میرے پاس تو ایک پھوٹی کوڑی نہیں۔'' میں نے کہا ''چچا اب پیچھے نہ مُڑ چلیں! سامنے میرے ٹیلر کی دکان ہے۔''

ہم پیچھے مُڑ کر چلنے لگے۔

''کیا تمھارا سارے کراچی میں ایک بھی ایسا دوست نہیں جو تمھیں پانچ ہزار کی رقم ایک مہینے کے لئے دے سکے۔۔۔ صرف ایک مہینے کے لئے۔'' اس نے پُرامید لہجے میں کہا ''اگلے روز تم مجھ سے اپنے دوست محمد منیر کا ذکر کر رہے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر تم اس کے پاس جاؤ تو وہ انکار نہیں کرے گا۔ دوست آخر اسی لئے ہوتے ہیں کہ بقوتِ ضرورت قرض دے سکیں۔۔۔ کیا خوبصورت لڑکی ہے۔۔۔'' اور اپنے ہونٹ سکیڑ کر

تیری میری رینچ نکالے! اور حکومت کیا ہوتی ہے

چچا عبدالباقی نے پھر سیٹی بجائی۔

''کیا خوبصورت لڑکی ہے'' کا ریمارک ایک سلونی، اُٹھی ہوئی ناک والی حسین سی چیز کے بارے میں کہا گیا تھا جو ہاتھ میں لیڈیز ہینڈ بیگ لٹکائے، اونچی ایڑیوں کی گرگابیوں پر ٹپ ٹپ کرتی ہمارے پاس سے گزری تھی۔ میں نے چچا عبدالباقی کو اِس قدر رومینٹک اور بشاش کبھی پہلے نہیں دیکھا تھا، جتنا اُس شام کو، وہ اُلٹے پاؤں پھر لڑکی کے پیچھے جانے کا خواہشمند تھا مگر میں نے اُس کو پھر یاد دلایا کہ اس طرف میرے ٹیلر کی دکان ہے۔

ہم فرئر ہال کی طرف چلتے گئے۔ مچھلیوں کے گلابی، روپہلی خواب دیکھتے اور شرکت کی شرائط پر بحث کرتے رہے۔ ہم نے مچھلیوں سے متعلقہ سب اُمور کو خوش اسلوبی سے طے کر لیا تھا۔ اگرچہ ہمیں زندگی میں مچھلیوں کے ساتھ اس سے زیادہ کوئی تعلق نہیں رہا تھا کہ وہ کبھی کبھار ہمارے دسترخوان کی نعمت بنتی تھی، پھر جس معاملہ فہمی اور کاروباری انداز سے ہم نے اس رات مچھلیوں کے متعلق باتیں کیں، اس نے ہمیں خود حیران کر دیا۔

دوسرے دن صبح نو بجے میں اور چچا عبدالباقی وکٹوریہ میں کلفٹن پر ڈپٹی سیکرٹری محکمۂ حیوانیات کے دفتر میں گئے۔ میں وکٹوریہ میں بیٹھا رہا اور عبدالباقی ڈپٹی سیکرٹری سے ملنے اندر چلا گیا۔ جب وہ ایک گھنٹے کے بعد واپس آیا تو بشاشت کی تصویر تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا جسے اس نے بڑے فخر سے میرے سامنے لہرایا۔ ڈپٹی سیکرٹری نے اسے اپنے دوست کے نام چٹھی دی تھی جو ایک ایسے شخص کو جانتا تھا جس کی ڈائریکٹر آف فشریز کے دفتر کے ہیڈ کلرک سے گاڑھی چھنتی تھی۔ حیوانیات کے دفتر سے ہم چھ میل کا فاصلہ طے کر کے جمشید روڈ پر اُس دوست کی کوٹھی پر پہنچے جس کے نام کی چٹھی تھی۔ کوٹھی کے پچھواڑے سے ایک گٹھا ہوا شخص جانگیا اور بنیان پہنے اور لوہار کی دھونکنی کی طرح ہانپتا ہوا ایک ہینڈ پمپ کے دستے کو اس تندی اور آہنی عزم سے چلا رہا تھا جیسے دنیا کے مستقبل کا اس پر دارومدار ہو۔ ہینڈ پمپ کے منہ سے ایک ربڑ کا پائپ کوٹھی کی دوسری منزل کو جاتا تھا۔

''معاف کرنا بھائی۔'' چچا عبدالباقی نے اس سے پوچھا ''کیا محمد احسن اشرفی صاحب اسی کوٹھی میں اقامت پذیر ہیں؟''

''بالکل'' اس آدمی نے پمپ پر اپنی مشقت کو روکتے اور اپنے ماتھے سے پسینے کو پونچھتے ہوئے جواب دیا ''قطعاً بلکہ محمد احسن یہ ناچیز ہے۔'' پھر اس نے اپنی ہمت کنذائی کی معذرت کرتے ہوئے کہا ''بدبخت نوکر پھر آج بھاگ گیا ہے۔ میں اوپر کی منزل میں رہتا ہوں، مجھے ہر صبح اوپر پانی پہنچانے کے لئے اس بدبخت پمپ سے دو گھنٹے دھینگا مشتی کرنی پڑتی ہے۔ میرے سات بچے ہیں اور وہ سب نہانے کے عادی ہیں۔ میں خود مہینے میں ایک دو دفعہ نہاتا ہوں، فرمایئے کیسے تشریف لائے ہیں۔''

''کریم الدین صاحب نے آپ کے نام ایک خط دیا ہے۔'' عبدالباقی نے اُس بتایا۔

''حاجی کریم الدین صاحب نے دیا ہوگا۔ مہربانی کر کے ان سے کہہ دیں کہ میں یہ مکان ہرگز ہرگز خالی نہیں کر سکتا۔ میں نے آپ سے عرض کیا ہے کہ میرے سات بچے ہیں۔''

''نہیں یہ مسٹر عبدالکریم صاحب، ڈپٹی سیکرٹری حیوانیات کی چٹھی ہے۔'' چچا نے اُسے تسلی دی۔

''مچھلی کے کنٹریکٹ کے متعلق تو نہیں؟'' اس آدمی نے اعتماد سے کہا۔

''ہاں، اُسی کے متعلق ہے، غالباً کریم الدین صاحب نے آپ سے اس سلسلے میں میرا ذکر ضرور کیا ہوگا۔ میرا نام ایچ اے باقی ہے۔''

''نہیں، آپ کا ذکرِ خیر تو نہیں آیا۔'' محمد احسن اشرفی نے کہا ''مجھے پچھلے دو ماہ سے محمد کریم الدین صاحب سے ملنے کا اتفاق نہیں ہو سکا۔ ہاں، اس عرصہ میں وہ مجھے سات آٹھ سفارشی خط بھجوا چکے ہیں کہ خط لانے والے حضرات کو گورنمنٹ فشریز کی مچھلیوں کا ٹھیکہ دلوانے میں ان کی مدد کروں۔''

ہم اس جواب سے اِتنے بھونچکا رہ گئے کہ کچھ ثانیے تک کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ آخر چچا عبدالباقی نے پوچھا ''تو گویا ان لوگوں کو ابھی تک کنٹریکٹ نہیں مل سکے؟''

''کنٹریکٹ ان میں سے ہر ایک کو مل چکا ہے، کچھ عرصے کے

بعد چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ ان میں سے دو اس وقت جیل میں ہیں۔''

''جیل میں؟'' چچا عبدالباقی نے ہڑبڑا کر احتجاج کیا۔

''بالکل! مطلقاً!! بدبختوں نے وقت پر گورنمنٹ کو ٹھیکے کی رقم ادا نہ کی تھی اور پھر صاحب، اُنھوں نے میری مسز اور مجھ پر دن دہاڑے الفنسٹن سٹریٹ میں گندے انڈے پھینکے۔ آپ حضرات تو اچھے خاصے معزز معلوم ہوتے ہیں۔''

''دیکھو مسٹر بختیار سیٹھ۔۔۔'' چچا عبدالباقی آنکھ میں نے ٹمٹماہٹ لئے میری طرف مخاطب ہوتے ہوئے کہا ''ہم لوگوں کی اخلاقی حالت کس قدر پست ہو چکی ہے، برسر بازار لیڈیز پر گندے انڈے پھینکنا اور پھر بیچارے اشرفی صاحب نے اُنہیں ٹھیکا لے کر دیا تھا۔''

''ہاں ایچ اے ساقی صاحب، دو دن میں نے اُن کو کنٹریکٹ دلوانے میں ضائع کیے۔''

''میرا نام ایچ اے باقی ہے۔'' چچا عبدالباقی نے پُر وقار انداز میں اسے دُرست کیا ''حاجی عبدالباقی، میں علیگ ہوں۔''

اوہ معاف کیجئے گا، آپ صاحبان تھوڑی دیر تک تشریف رکھئے، برآمدے میں دو سٹول رکھے ہیں، میں ذرا اِس کام سے فارغ ہولوں۔''

وہ آدھ گھنٹے تک فارغ ہو کر آیا۔ اب وہ ایک نیلی سفید پتلون اور ایک خوفناک امریکن بوشرٹ پہنے ہوئے تھا، جس کے انچ انچ پر اخباروں کی قتل، طلاق اور جارحانہ عشق کی سنسنی خیز کہنگو چھپی ہوئی تھیں۔ محمد احسن اشرفی ان شخصوں میں سے تھا جو خبروں کو پڑھنے کے بجائے اوڑھنے میں یقین رکھتے تھے۔

چچا عبدالباقی نے اُسے ڈپٹی سیکرٹری کا خط دیا، اشرفی نے اسے سرسری انداز سے اور بیدلی سے پڑھا۔

''آپ کا ڈائریکٹر آف فشریز کے دفتر میں رسوخ ہے۔'' چچا نے پوچھا۔

''رسوخ!'' اشرفی بولا ''میرا دوست ایک شخص کو جانتا ہے جو فشریز کے ہیڈ کلرک کو جانتا ہے، بلکہ وہ شخص اُس ہیڈ کلرک کا سگا ماموں ہے۔ میں آپ کو اُس دوست کے نام خط لکھ دیتا ہوں، اُسے گیارہ بجے سے پہلے مل لیجئے۔ اس وقت تک وہ گھر ہوتا ہے، اس کے بعد وہ مچھلیاں پکڑنے چلا جاتا ہے۔''

''مچھلیاں پکڑنے؟'' چچا نے چیں بہ جبیں ہو کر کہا۔

''ہاں! یہ اُس کی ہابی ہے۔۔۔ ہابی! کچھ عرصہ پہلے اُس کی ہابی ٹکٹیں جمع کرنا تھی۔ اُس سے پہلے وہ ۱۹۳۰ء کے بنے ہوئے مرتبان جمع کرنے کا شوق کیا کرتا تھا۔ اُس سے پہلے جب وہ اسکول میں میرا ہم جماعت تھا، اُس کی ہابی ایک صندوق میں مینڈک پکڑ پکڑ کر بند کرنا تھا۔۔۔ آپ جانتے ہیں، بعض لوگ ہابی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ آپ لوگ اب جانے کی کریں ورنہ وہ گھر پر نہیں ملے گا۔''

چچا عبدالباقی نے اُسے بتایا کہ اس نے اس کے نام ایک خط دینے کا وعدہ کیا تھا۔

''خط ضروری نہیں ہوگا۔'' اُس نے کہا ''آپ اس سے کہہ دیں کہ میں نے آپ کو بھیجا ہے۔''

ہم نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کوٹھی سے باہر آ کر وکٹوریہ میں بیٹھنے ہی لگے تھے کہ چچا کو یاد آ گیا کہ اشرفی نے ہمیں دوست کا نام اور پتا تو بتایا ہی نہیں۔ ہم پھر واپس اُس کے پاس گئے۔ اُس نے کہا کہ ہم تھوڑی دیر انتظار کر سکیں تو وہ ہمارے ساتھ چلے گا۔

ہم نے اس کرم فرمائی پر اس کا شکریہ ادا کیا۔ اس نے ہم سے درخواست کی کہ ہم اسے مزید شرمندہ نہ کریں اور یہ کہ ہماری امداد کرنا اس کا فرض ہے۔

اس کے بعد ہمیں سٹولوں پر بٹھا کر وہ اوپر چڑھ گیا۔

آدھ گھنٹے کے بعد جب وہ نیچے آیا تو اس کے ساتھ پانچ چھوٹے اشرفی اور تھے۔ اگر دنیا میں ان سے زیادہ بدتمیز اور ناخوشگوار بچے اور کہیں ہیں تو میں نے اُنہیں نہیں دیکھا۔ وہ اپنے باپ کے بچپن کے مختلف مراحل کی نمائندگی کرتے تھے اور اشرفی چھاپ واضح طور پر ان کی پیشانی پر ثبت تھی۔

''معاف کیجئے، سیٹھ عبدلفانی صاحب، مجھے قدرے دیر ہو گئی۔'' اس نے معذرت چاہی۔

''میرا نام عبدالباقی ہے۔'' چچا نے وقار سے کہا۔

''اوہ عبدالباقی۔۔۔ہاں تو صاحب، بات یہ ہوئی کہ بچے ابھی سکول کے لئے تیار نہیں ہوئے تھے۔ آپ حضرات اگر بُرا نہ مانیں تو بچوں کو سکول چھوڑنے کے بعد عبدالحنان کے گھر چلیں گے۔ آپ ٹیکسی میں آئے ہیں ناں؟''

''نہیں وکٹوریہ میں!'' چچا نے اطلاع دی۔

''وکٹوریہ میں بھی ٹھیک ہی ہے، اگرچہ بچوں کو دیر تو ہو جائے گی۔ میں اپنی کار لے چلتا لیکن اس کا سٹیرنگ ٹوٹ گیا ہے۔''

اشرفی کے بچوں کو ان کے سکولوں میں چھوڑنے میں ہمیں کوئی ڈیڑھ گھنٹہ لگا۔ وہ مختلف سکولوں میں پڑھتے تھے، جن میں ایک اپنی سینا سینا لائنز کی طرف تھا اور دوسرا میری ویدر کلارک ٹاور کے پاس۔ ویسے ان میں سے کوئی بھی سکول جانے کا شائق نہ تھا۔ وہ سب کلفٹن جانا چاہتے تھے اور بے حد بگڑے ہوئے بچے تھے اور ہم اجنبی مہمانوں سے بھی ضرورت سے زیادہ بے تکلف تھے۔

بچوں کو سکولوں میں چھوڑنے کے بعد محمد احسن کو یاد آ گیا کہ اس کی بیوی کے لئے ایک سویٹر اور بچوں کے لئے جرابیں، صابن، ہیر آئل وغیرہ خریدنے ہیں۔

''آپ حضرات بُرا نہ مانیں۔'' اس نے بولٹن مارکیٹ کے پاس وکٹوریہ ٹھہراتے ہوئے کہا ''تو میں یہاں سے کچھ ضروریات کی چیزیں خرید لوں۔ بدبخت بچے صابون اور تیل دو روز میں ختم کر دیتے ہیں۔ میں ابھی منٹ میں آیا۔''

وہ پورے ایک گھنٹے کے بعد آیا اور معلوم ہوتا تھا کہ اس نے مارکیٹ کے اردگرد کی ساری دکانوں کو چھان مارا ہے۔ اس نے کئی سویٹر، جرابوں کے جوڑے اور صابن اور ہیر آئل کی بوتلیں دکانوں پر دیکھیں لیکن وہ سویٹر، وہ جرابیں، صابون اور ہیر آئل نہ تھا جو وہ خریدنا چاہتا تھا، اس لئے وہ صرف ایک ربڑ کا چھوٹا گیند خرید کر لایا اور اس کے متعلق بھی اسے شکایت تھی کہ دکاندار نے اُسے لوٹ لیا ہے۔

''بدبخت دکانداروں نے ہر چیز کے بھاؤ چڑھا رکھے ہیں۔''

اُس نے کہا ''اگر آپ حضرات بُرا نہ مانیں تو میں ایک منٹ کے لئے جوتا بازار بھی ہو آؤں؟''

مختصراً یہ کہ جوتا بازار میں ڈیڑھ گھنٹہ لگانے کے بعد جہاں سے اُس نے لوہے کا ایک کفگیر خریدا، اُس نے ہمیں اطلاع دی کہ اب اس کے دوست کے ہاں جانا فضول ہے کیونکہ وہ اب وہ یقیناً مچھلیاں پکڑنے جا چکا ہوگا۔

''اگر آپ بُرا نہ مانیں۔۔۔'' اُس نے کہا ''تو مجھے کوٹھی پر چھوڑ دیں، معاف کیجئے، آپ حضرات کو بے حد تکلیف ہوئی۔ کل نو بجے آپ پھر میری کوٹھی پر تشریف لے آئیں تو بہتر ہوگا، بدبخت وکٹوریہ بہت وقت لیتی ہے۔''

ہم نے اُسے اُس کی کوٹھی پر چھوڑا۔

چچا عبدالباقی نے اس سے پوچھا ''آپ ہمیں اپنے دوست کا پتا بتا دیجئے، ہم ان سے خود ملنے کی کوشش کریں گے۔''

''نہیں صاحب، یہ کوئی بات نہیں ہے، میں خود آپ کے ساتھ جاؤں گا۔'' اُس نے کہا ''عبدالحنان ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔''

''ان کا نام عبدالحنان ہے؟'' چچا نے پوچھا۔

''بالکل، مطلقاً'' محمد احسن اشرفی نے کہا۔

''غالباً وہی تو نہیں جو سویٹ میٹ مرچنٹ ہیں؟''

''نہیں، یہ اور ہیں، یہ مولوی عبدالحنان ہیں۔''

''کہاں رہتے ہیں؟''

اُس نے ذرا تامل کے بعد ہمیں میریٹ روڈ پر ایک پتا بتایا مگر ساتھ ہی اس نے مخلصانہ مشورہ دیا کہ ہم اس کو ہمراہ لئے بغیر عبدالحنان سے ملنے کی ہرگز کوشش نہ کریں۔

''نہیں صاحب، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔'' چچا عبدالباقی نے اسے یقین دلایا۔

وکٹوریہ میں لوٹتے وقت چچا عبدالباقی نے، جو اس شخص کے خلاف بھرا بیٹھا تھا، جی بھر کر اپنا غبار نکالا ''اس اشرفی کے بچے کو دیکھو، یہ کوئی انسانیت ہے، یہ خرید کرنا ہے، وہ خرید کرنا ہے، یہاں چلو، وہاں چلو، جیسے وکٹوریہ اس کے باپ کی ہے۔ بختیار بھائی، کل اس شخص کے یہاں آنے کے بجائے سیدھے مولوی عبدالحنان کے

پاس چلیں گے، تم نے دیکھا، میں نے اس سے عبدالحنان کا پتا کیسی حکمتِ عملی سے اگلوایا، وہ اسے نہیں بتانا چاہتا تھا۔"

جب ہم وکٹوریہ کو چچا کے مکان پر رخصت کیا تو وکٹوریہ والا سات روپے سے کم لینے پر رضامند نہ ہوا۔ میں نے ڈوبتے ہوئے دل سے کرایہ ادا کیا۔ چچا عبدالباقی پاس کھڑا بے تعلقانہ انداز میں دیکھتا رہا۔

مولوی عبدالحنان میریٹ روڈ پر ایک تنگ و تاریک فلیٹ میں رہائش پذیر تھا اور ہم نے اس کا پتا بڑی مشکل سے ڈھونڈا۔ وہ خود بھی انتہائی تنگ و تاریک قسم کا آدمی نکلا۔ بانس کی طرح لمبا اور سارے کا سارا ہڈیوں کا ڈھانچہ۔ وہ ایک مشینی قسم کا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس کے اعضاء ناگہانی دھچکوں کے ساتھ حرکت میں آتے تھے۔ اس کی ٹھوڑی سے ایک چھوٹی سی کارڈینل ریشیلیو (Cardinalrichiliew) ٹائپ داڑھی معلق تھی۔ ایک نہایت ہی بوسیدہ اور شرمناک داڑھی۔ جس وقت ہم اس کے پتے پر پہنچے، وہ نہایت قدیمی پلس فور اور ایونگ کیپ پہنے اور ہاتھ میں مچھلی کا کانٹا پکڑے سیڑھیوں سے نیچے اُتر رہا تھا۔ ہم نے اسے عین موقع پر پکڑا تھا ورنہ وہ گھر پر ہمیں یقیناً نہ ملتا۔

ہم نے اُسے بتایا کہ ہم کو محمد احسن اشرفی صاحب نے اس کے پاس بھیجا ہے اور اس نے فوراً ہم سے پوچھا کہ آیا ہماری تشریف آوری گورنمنٹ کی مچھلیوں کے ٹھیکے سے متعلق ہے؟ ہم نے اسے یقین دلایا کہ یہی ہمارے حاضر ہونے کا مقصد ہے۔ چچا عبدالباقی نے اس کی قیافہ شناسی کی مناسب الفاظ میں داد دی۔

اس نے کہا کہ وہ ہمیں ضرور یہ ٹھیکہ دلوانے میں حتی الامکان تگ و دو کرے گا اور چونکہ ہمیں اشرفی صاحب نے بھیجا ہے اس لئے وہ ہم سے معمولی کمیشن چارج کرے گا۔

کمیشن کے ذکر نے ہمیں حیران کر دیا۔ چچا عبدالباقی نے اسے بتایا کہ ہم دراصل ڈپٹی سیکرٹری کریم الدین صاحب کے اپنے آدمی ہیں اور یہ کہ ہمارا خیال نہ تھا کہ کمیشن دینے کا کوئی سوال پیدا ہوگا۔

ایک انتہائی تکلیف کے آثار اس کے چہرے پر نمودار ہوئے۔

"کیا آپ کو معلوم نہیں؟" اُس نے کہا "کہ ڈائریکٹر فشریز کے عملے کو دیئے دلائے بغیر یہ کام نہیں ہو سکتا۔ اپنے لئے تو مجھے ایک پائی تک کی خواہش نہیں، ویسے آپ کو خود خیال کرنا چاہیے کہ

مجھے کتابوں پر ریویو لکھنے میں ملکہ حاصل ہے۔ اور میں انہیں پڑھے بغیر ہی ریویو لکھ سکتا ہوں۔ یہ خدا کی دین ہے۔ جس طرح بعض لوگ شاعر یا پیدائشی مختصر افسانہ نویس ہوتے ہیں۔ غالباً میں ایک پیدائشی تبصرہ نگار ہوں۔ پچھلے دو تین سال کے عرصہ میں میں نے ادیب سازی کے سلسلہ میں جو کام کیا ہے۔ وہ آپ سے پوشیدہ نہ ہوگا میرا ریویو کرنے کا طریقہ یہ ہے۔ "خیال نو" کا ایڈیٹر جو میرا دوست ہے مجھے کتابیں ریویو کرانے کے لیے بھیجتا ہے۔ میں ان کو ادھر ادھر سے الٹ کر کسی صفحہ کو کھول کر دو تین سطریں پڑھتا ہوں۔ مثلاً

اس نے کہا۔ "چائے کی پیالی پیو!"

بھورے خاں نے کہا "شکریہ میں ابھی ابھی لیمن پی کر آیا ہوں۔"

اور پھر کتاب کو بند کر کے اس پر تین چار صفحے کا ریویو گھسیٹ دیتا ہوں۔ اگر کتاب ذرا اہم ہوئی تو میں اسے اپنے بھانجے کو (جو آٹھویں جماعت میں تعلیم پا رہا ہے) پڑھنے کے لیے دے دیتا ہوں۔ اور رات کو سوتے وقت اس سے کہتا ہوں۔ کہ مجھے اس کا پلاٹ سنائے۔ اگر اس کے پلے کچھ نہ پڑا تو سمجھ لیتا ہوں کہ کتاب فی الواقعی ہائی برو ہے۔ اور اپنے ریویو میں اسے وقیع اور عالمانہ بتاتا ہوں اب تک یہ طریقہ بہت کامیاب رہا تھا۔ کتنا کامیاب، یہ آپ کو اس شہرت سے اندازہ ہو سکتا ہے، جو اس سلسلے میں مجھے حاصل ہے۔ خود میرے ریویوں پر ریویو لکھے جا چکے ہیں اور مجھے ادب کا ہونہار ترین نوجوان نقاد تسلیم کیا جا چکا ہے۔ "خیال نو" جو اس وقت اردو ادب کی آواز ہے۔ اپنے ہر شمارے میں میری تصویر کے نیچے یہ چھاپتا ہے "مسٹر شداد دشمی"۔ اردو کے ہونہار ترین نوجوان نقاد، وغیرہ وغیرہ۔

"تنقید نگاری سے توبہ" از محمد خالد اختر

یہ ٹھیکہ لینا سخت مشکل کام ہے، آیئے، اوپر چل کر دفتر میں بیٹھیں۔"

ہم سیڑھیاں چڑھ کر اوپر اُس کے دفتر میں داخل ہوئے۔ اس کا دفتر ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس کے کونے میں ایک نل اور ایک بالٹی ظاہر کرتے تھے کہ غسل خانہ بھی یہی ہے۔ ایک میز کے آر پار دو کرسیاں پڑی تھیں۔ ایک کی نشست اُدھڑ جانے کی وجہ سے غائب تھی۔۔۔ نل کے اوپر ایک رنگین تصویر ایک کیل سے لٹک رہی تھی جس میں قائداعظم اور لیاقت علی خان چاند ستاروں والی ٹوپیاں اور ۱۸۶۰ء کی ترکی فوج کی وردیاں پہنے اور مجاہدانہ شمشیروں سے لیس مسطفانہ انداز میں مسکرا رہے تھے۔

اُس نے جلدی سے اپنے آپ کو دفتر کی واحد قابلِ استعمال کرسی پر متمکن کرتے ہوئے بغیر نشست والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"تشریف رکھئے، معاف کیجئے گا، کرسی یہاں ایک ہی ہے، آپ میں ایک صاحب میز پر بیٹھ سکتے ہیں۔"

چچا عبدالباقی نے میز پر بیٹھنے کو ترجیح دی۔ میں بے نشست کرسی کے بیرونی چوبی فریم کے سرے پر اٹک کر بیٹھ گیا۔

"آپ اطمینان سے ہو بیٹھئے۔" اُس نے میرے ساتھ خوش اخلاقی برتی۔ اس نے اپنی پلس فور کی جیب میں سے ایک پرانا ٹائپ اور کاغذ میں لپٹی ہوئی تمباکو کی پڑیا نکالی اور تمباکو کو اپنی ہتھیلیوں میں مسلتے ہوئے اس نے اپنی ماتمی آنکھوں سے ہمارا جائزہ لیا۔

"مجھے سگریٹ کی عادت نہیں۔" اس نے کہا "اس لئے میں آپ کو سگریٹ پیش کرنے سے معذور ہوں۔ اگر آپ کی جیب میں پائپ ہو تو یہ تمباکو حاضر ہے۔" اس نے پائپ کو منہ سے لگاتے اور سلگاتے ہوئے کاروباری باتوں کا آغاز کیا۔

"ہاں تو صاحبان!" اس نے کہا "کچھ دیئے دلائے بغیر ٹھیکے کا مل جانا ناممکن ہے۔" اس نے متعدد کمیشنوں اور نذرانوں کی فہرست گنوائی جن کا دیا جانا ضروری تھا۔ ایک تو اس کلرک کا کمیشن تھا جو ہم سے ٹینڈر لے گا، ورنہ وہ اسے گم کر سکتا ہے۔ پھر اس شخص کا کمیشن ہو گا جو دوسرے ٹینڈر دینے والوں کے سر بمہر ٹینڈروں کو کھول کر ہمیں ان کا آفر بتائے گا تاکہ ہم اپنے ٹینڈر میں سب سے زیادہ آفر سے ایک دو پیسے زائد کا آفر کریں، پھر ہیڈ کلرک تھا۔

اس نے اصرار کیا کہ ہم چائے پئیں۔ بدقسمتی سے اس کی بیوی کہیں باہر تھی اور چائے گھر پر تیار نہ ہو سکتی تھی۔ اس لئے وہ ہمیں نیچے "دی اسٹیٹ پہلوان ہوٹل" میں لے گیا۔ چچا عبدالباقی اور میں نے چائے کی ایک ایک پیالی پی، کیونکہ ہم ناشتہ کر کے آئے تھے۔ مولوی عبدالحنان نے چائے کی پیالی کے ساتھ چار ٹوسٹ اور آملیٹ بھی ختم کئے۔ اُٹھتے ہوئے اس نے چچا عبدالباقی کو کاؤنٹر پر بل ادا کرنے کے لئے کہا، چچا نے مجھ سے چار روپے ادھار لے کر بل ادا کیا۔

مولوی عبدالحنان چاہتا تھا کہ کمیشنوں کی رقم جو اس کے حساب کے مطابق ساڑھے تین سو بنتی تھی، فوراً اس کو دے دی جائے۔ پھر جس جس سے نمٹنا ہو گا، وہ خود نمٹ لے گا اور ہمارے لئے دردِ سر ہی نہ رہے گا۔ چچا عبدالباقی نے کاروباری ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے کہا کہ ہم ضروری کمیشن وغیرہ خود دیں گے۔ اس سے مولوی عبدالحنان کو بڑا صدمہ پہنچا۔ اس نے کہا کہ اس کے دل کو دکھ پہنچا ہے کہ ہم اس پر اعتماد نہیں کر رہے۔ اس نے ہمیں کئی ایسی پارٹیوں کے نام گنوائے جنہوں نے اُسے پچاس پچاس ہزار تک کی رقم بغیر رسید کے سونپ دی تھی۔

ہوٹل تک ہم ٹیکسی لے کر ڈائریکٹر آف فشریز کے دفتر گئے۔ مولوی عبدالحنان ہمیں باہر بنچ پر بٹھا کر خود ایک کمرے میں چلا گیا۔ آدھے گھنٹے کے بعد وہ باہر آیا اور اس نے ہمیں اندر آنے کا اشارہ کیا۔ اس کے پیچھے پیچھے ہم ایک بڑے کمرے میں سے، جس میں کئی زرد رو بیڑیاں پیتے ہوئے کلرک میزوں پر ٹانگیں رکھے ہوئے گپیں ہانک رہے تھے، ایک چھوٹے کمرے میں داخل ہوئے۔ ایک بڑی میز کے پرلی طرف فائلوں کے پہاڑ کے پیچھے ایک بھینگی آنکھوں والے قدرے ترش رو شخص نے اُٹھ کر ہم سے مصافحہ کیا۔ میں نے اس کی آنکھوں کو حیرت سے دیکھا۔ وہ سامنے

ہماری طرف دیکھنے کے بجائے اطراف کی دیواروں کو دیکھتی معلوم ہوتی تھیں۔ یہ ہیڈ کلرک تھا، جس کے ہاتھ میں ہماری قسمت تھی۔

''اچھا تو آپ گورنمنٹ فشریز کے ٹھیکے کے ٹینڈر دینا چاہتے ہیں۔'' اس نے دونوں دیواروں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس ٹھیکے کے لئے بڑی سخت کمپٹیشن ہے۔ پچھلے دو دنوں میں ہمیں بڑی بڑی معتبر پارٹیوں سے پچاس کے لگ بھگ ٹینڈر موصول ہو چکے ہیں۔ آپ چونکہ عبدالحنان صاحب کے خاص آدمی ہیں، اس لئے آپ کی ہر طرح مدد کرنا میرا اخلاقی فرض ہے۔ یہ دیکھئے، یہ سب ٹینڈر ہیں۔'' اس نے ایک پرلدی ہوئی ایک مبہم ڈھیری کی سمت اشارہ کیا۔ اس نے اپنی آواز دھیمی کر دی ''سب سے زیادہ آفر کھنڈا والا کمپنی نے اپنے ٹینڈر میں دیا ہے۔ یعنی آٹھ ٹن کے کیچ کا چار ہزار روپے، آپ چار ہزار ایک روپے کا ٹینڈر دے دیں۔''

اس نے ایک ٹینڈر فارم ہماری طرف بڑھایا۔ چچا عبدالباقی نے مولوی عبدالحنان کی ہدایت کے مطابق اسے پُر کیا۔ ہیڈ کلرک نے ہمیں ایک ہزار روپے بطور ضمانت کے اسی روز یا اس سے اگلے روز گورنمنٹ فشریز میں داخل کر دینے کی ہدایت کی۔

''ٹریژری رسید آپ یا بھائی عبدالحنان کو دے دیں یا براہِ راست مجھے پہنچا دیں، میں خود اسے آپ کے ٹینڈر کے ساتھ نتھی کرنے کے بعد ٹینڈر کو مہر لگا دوں گا، لیجئے پان سے شوق کیجئے۔''

اس کے بعد مولوی عبدالحنان چچا عبدالباقی کو ایک طرف لے گیا۔ ان کے درمیان کچھ دیر کھسر پھسر ہوتی رہی۔ پھر چچا عبدالباقی مجھے ایک طرف لے گیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ ٹینڈر قبول کرانے کے لئے دو سو روپے پر فیصلہ ہوا ہے۔

''تمھارے پاس دو سو روپے ہیں؟'' اُس نے رازدارانہ اندا میں پوچھا۔

مجھے اُس روز ایک بزرگ کی معرفت بوڑھے آدمی نے تین سو روپے بھجوائے تھے جو اُس وقت میری جیب میں تھے۔ مجھے خیال آیا کہ صاف انکار کر دوں کہ میرے پاس روپے نہیں ہیں مگر چچا نے مجھے ٹیکسی کا کرایہ ادا کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ ویسے بھی چچا کے اندر دوسرے لوگوں کی جیبوں میں پڑے ہوئے نوٹوں کو سونگھنے کی حس حیرت انگیز طور پر تیز ہے۔

کانپتے ہوئے ہاتھوں سے میں نے دو سو روپے کے نوٹ چچا عبدالباقی کے ہاتھ میں دے دئے۔ چچا مولوی عبدالحنان کو ایک طرف لے گئے اور نوٹوں کو اس کی جیب میں ڈال دیا۔ عبدالحنان نے ہیڈ کلرک کے پیچھے چپکے سے جا کر نوٹوں کے کچھ حصے کو ہیڈ کلرک کی جیب میں منتقل کر دیا۔

اس رسم کے بعد ہیڈ کلرک پہلے سے زیادہ ترش اور گھبرایا ہوا ہمیں وداع کرنے کے لئے اُٹھا'' آپ حضرات سے مل کر بڑی خوشی ہوئی، اور کوئی خدمت ہو تو بندہ ہر طرح سے حاضر ہے۔''

دفتر کے باہر پہنچ کر چچا عبدالباقی نے مجھے سرزنش کی ''دیکھو بختیار، تمھیں وہاں ہیڈ کلرک کے سامنے روپے نکالنے میں ہچکچاہٹ کا اظہار نہیں کرنا چاہئے تھا، تمھیں ایسے کاموں کا تجربہ نہیں اور پھر تم یہ سمجھو کہ یہ دو سو روپے تم نے نہیں دئے بلکہ میں نے دئے ہیں، میں نے گویا یہ دو سو روپے کی رقم میں سے دئے ہیں جو تم بطور قرض دینے والے ہو۔''

کھارادر کے پاس سے گزرتے ہوئے مولوی عبدالحنان نے مجھ سے پندرہ روپے اُدھار لئے۔ اس نے ایک پھیری والے سے کریم۔ پاؤڈر، سستی لپ اسٹک اور ایک دیسی عطر کی شیشی خریدی۔ ہم نے اُسے میرٹ روڈ پر اس کے فلیٹ پر چھوڑا۔ اس نے ہم سے کہا کہ اگلے روز ہم ڈائریکٹر آف فشریز کے دفتر جاتے ہوئے اسے ضرور ساتھ لے لیں۔ چچا عبدالباقی نے اس سے وعدہ کر لیا۔

''یہ مولوی عبدالحنان بڑے کام کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔'' راستے میں چچا عبدالباقی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا ''اس کی ڈائریکٹر آف فشریز کے دفتر میں بڑی جان پہچان ہے اور ہیڈ کلرک تو اس کا مرید ہے۔ اس کنٹریکٹ کو حاصل کرنا بڑا مشکل ہے، ذرا سوچو، دو روز میں پچاس ٹینڈر اور بڑی بڑی کمپنیوں کے کیوں نہ ہوں۔ بھتیجے ایک کیچ پر پانچ ہزار کا منافع وہ پڑا ہے۔۔۔ یہ بیچارہ کریم الدین علیگ نکلا، اُدھر مولوی عبدالحنان نے بھاگ دوڑ کی کہ ہمارا چانس اس قدر روشن ہو گیا ورنہ رسوخ کے بغیر

کون پوچھتا ہے۔ اچھا! آج ہی چار ہزار روپے کا انتظام کر کے مجھے فوراً دے دو۔ محمد منیر تنویر سے لینے کی کوشش کرو۔ ہاں یہ آج کا کمیشن اور ٹیکسی وغیرہ کا خرچا اگر تم چاہو تو چار ہزار روپے سے وضع کر سکتے ہو۔''

''محمد منیر کے بارے میں مجھے یقین نہیں کہ وہ چار ہزار روپے دے گا۔'' میں نے کہا۔

''وہ تمھارے باپ کی ہڈیوں کا ایکسپورٹ ایجنٹ ہے۔'' چچا عبدالباقی نے مجھے ڈھارس دی'' وہ بوڑھے آدمی کے حساب سے ہی تمھیں یہ رقم دے سکتا ہے۔ بوڑھے آدمی کو اس کا پتہ بھی نہیں چلے گا۔ ایک مہینے کے اندر ہی تم یہ رقم محمد منیر کو لوٹا سکتے ہو۔''

دوسری صبح میں محمد منیر سے میکلوڈ روڈ پر اس کے دفتر میں ملنے گیا۔ محمد منیر تنویر دوسرے تیسرے مہینے اپنے اسٹاف کو تبدیل کرتا رہتا ہے۔ میں نے مس سینڈو کی بجائے ایک نئی لیڈی ریسپشنسٹ کو ڈیسک کے پیچھے بیٹھے ہوئے پایا جو میرے اور محمد منیر تنویر کے بے تکلفانہ تعلقات کو نہیں جانتی تھی۔ وہ ایک کافی حسین اور پیاری چیز تھی اور اگر چہ ہم خلقی طبعاً طبقۂ اناث سے دور رہنے کے قائل ہیں تاہم ہم شروع سے نسوانی حسن کے قدر دان رہے ہیں۔

محمد منیر تنویر کے پاس اس وقت کوئی ملاقاتی تھا اور لیڈی ریسپشنسٹ نے مجھے کافی دیر انتظار کرایا۔ ملاقاتی کے جانے کے بعد ریسپشنسٹ نے میرا چٹ اندر بھجوایا اور تنویر نے فوراً مجھے اندر بلوالیا۔

محمد منیر تنویر مجھ سے اُٹھ کر ملا، اس نے ایک گرم جوش اور پُر اعتماد مصافحہ کیا'' آؤ بھئی چاچے، اتنے عرصہ تم ملے ہی نہیں۔'' محمد منیر تنویر نے ملی جلی اُردو اور پنجابی میں کہا'' کہاں رہتے ہو تم؟''

اس نے بجلی سے کام کرنے والی گھنٹی بجائی اور چپراسی کو چائے لانے کے لئے کہا۔ اس نے میز کی دراز میں چھپائے ہوئے پانچ سو پچپن کا سگرٹوں کا ٹن نکال کر میری طرف بڑھایا۔

''چاچا، ہماری نئی ریسپشنسٹ دیکھی ہے؟'' اس نے گھومنے والی گدی دار کرسی پر تقریباً لیٹتے ہوئے اور سگریٹ کا ایک پف چھت کی طرف پھونکتے ہوئے کہا، ہے ناں فسٹ کلاس! داد دے ہماری چوائس کی!! واقفیت کرادوں تمھاری اس سے؟ آج چلو میٹروپول، یہ بھی آ رہی ہے، ڈنر سوٹ ہے تمھارے پاس؟''

''میرے پاس کہاں ہے ڈنر سوٹ!''

''پھر تو مشکل ہے چاچا، تم نے ڈنر سوٹ بھی نہیں بنوایا۔ اچھا اور سنا کیا بنتا ہے۔ اور میاں پیسے کما، عیش کر، دیکھ میں چند سال پہلے کیا تھا۔ اب میری شان دیکھ۔ لارڈ بوگی بوگی کل مجھے ہنگری کے ''مغل'' موٹر سائیکلوں کی سول ایجنسی دے گیا ہے۔ میں ایک امریکن فرم کے اشتراک سے ملیر میں ایک بولٹ نٹ بنانے کی فیکٹری بھی بنوا رہا ہوں۔ یہ ہو گیا تو بس پھر تو میں واقعی میگنیٹ ہو جاؤں گا۔ محمد منیر تنویر دی بولٹ نٹ کنگ آف پاکستان، عیش کرا کے دکھاؤں گا تمھیں میاں، بجر بٹو، لے چائے پی۔''

میز پر فون کی گھنٹی بجی اور محمد منیر تنویر اپنی گھومنے والی کرسی پر اس قدر صفائی اور مستعدی سے ریسیور اُٹھانے کے لئے گھوما کہ میں ششدر رہ گیا۔

''جی ہاں، ایک مہینے کے اندر اندر مال آجائے گا، شپ ہو چکا ہے، ایک تہائی پیشگی ادا کرنا ہو گا۔''

''پھنس گیا۔'' محمد منیر تنویر نے ریسیور رکھتے ہوئے مجھے اطلاع دی'' چاچا، میری کتاب دیکھی یم نے؟ ''ترانۂ تنویر'' اور اس نے گھنٹی بجائی۔ اپنے دفتر کے ایک کلرک کو بلوایا۔ اس نے اسے حکم دیا کہ مجھے ''ترانۂ تنویر'' کی ایک جلد پیش کرے۔

محمد منیر تنویر اسکول کے ایام میں غزلیں اور نظمیں کہا کرتا تھا اور کسی قدر ادیب مشہور تھا۔ ''ترانۂ تنویر'' بھی اُنہی دنوں کی غزلیات کا مجموعہ تھا (ویسے اس میں سے بعض غزلیں قاضی شیر حسن انگر، جلد ساز کی جودتِ طبع کا نتیجہ تھیں، جو سکول کے طالب علموں اور دوسرے گاہکوں سے مکمل غزل موزوں کر دینے کے چار آنے چارج کیا کرتے تھے۔)

کلرک نے کتاب کی ایک کاپی مجھے لا کر دی۔ محمد منیر تنویر نے ''ترانۂ تنویر'' کو بیحد خوبصورت انداز میں طبع کرایا تھا۔ جلد نیلے مراکو چمڑے کی تھی اور اس پر سنہری الفاظ میں کتاب اور مصنف کا نام کندہ تھا۔ اندر کا کاغذ چمکیلا بہترین آرٹ پیپر تھا اور کتاب اس

اہتمام کے ساتھ چھاپی گئی تھی جیسے تاج اور پیکو کے عکسی قرآن شریف، قیمت پانچ روپے تھی۔

''دیکھ چاچا، کتاب چھپوائی ہے ناں پھر پورے تین ہزار روپے اس پر لاگت آئی ہے۔ میرے خیال میں پورے پاکستان میں میں واحد بزنس میگنیٹ ہوں، جس کو شعر و ادب میں کافی دسترس ہے۔ میں نے ''ترانۂ تنویر'' کی جلدیں گورنر جنرل اور سب منسٹرز کو بھجوائی ہیں۔''

اس نے کلرک کو گھنٹی بجا کر بلوایا۔

''بھئی وہ ''ترانۂ تنویر'' کی ایک جلد تم نے مولوی تمیز الدین خان صاحب کو بھجوا دی تھی ناں؟''

''ابھی نہیں جنابِ عالی۔'' کلرک نے جواب دیا۔

''یہ آج ہی بھجوا دیجئے۔'' محمد منیر تنویر اپنے اسٹاف سے خوش اخلاقی برتتا ہے ''اور ایک کاپی ڈپٹی کنٹرولر امپورٹ ایکسپورٹ کو بھی بھجوانی ہے۔''

''لا چاچا'' اُس نے کہا ''تیری جلد کو آٹو گراف کر دیں۔'' اور اس نے کتاب کے سرِ ورق پر ''بختیار خلجی کی نذر۔۔۔ محمد منیر تنویر'' لکھ دیا۔

''ارے مولانا، میں نے عرصہ ہوا شعر و شاعری چھوڑ رکھی ہے ورنہ اگر لکھتا رہتا تو اس وقت تمھارے جوش، فراق وغیرہ جتنا مشہور ہوتا۔ اصل میں ادیب بننے کا بھی ایک وقتی شوق ہوتا ہے۔ اچھا چاچا! کل میں نے لارڈ بوگی بوگی کے آنر میں ڈنر دیا ہے، تم بھی آؤ گے؟ ڈنر سوٹ ہے تمھارے پاس؟''

میں نے اُس سے کہا کہ تھوڑی دیر پہلے بھی میں اُسے بتا چکا ہوں کہ میرے پاس ڈنر سوٹ نہیں ہے۔

''ایک ڈنر سوٹ تو بنوا چھوڑ چاچا!'' اُس نے مجھے ترحم آمیز نظروں سے دیکھا ''تو بھی اُسی طرح حاجی بغلول کا حاجی بغلول رہا۔۔۔''

''محمد منیر تنویر۔۔۔'' میں نے آخر کہا ''ہم اسکول میں اکٹھے تھے؟''

''ہاں چاچا، بالکل تھے۔''

''ہم لنگوٹیے دوست تھے؟'' میں نے کہا۔

''چاچا۔۔۔ بات کر۔''

''کیا تم مجھے آج چار ہزار فی الفور ادھار دے سکتے ہو؟ صرف ایک مہینے کے لئے؟''

محمد منیر تنویر کی پُر اعتماد خوش مزاجی اس کے چہرے سے ایک چھلکے کی طرح اُتر گئی۔ وہ غمگین ہو گیا۔

''سچ؟''

''بالکل سچی بات ہے!'' اور میں نے مچھلیوں کا ٹھیکہ حاصل کرنے کے بارے میں اپنی کوششوں کا اس سے ذکر کیا۔ مجھے یہ نہیں معلوم کہ اس نے اس اسکیم کے بارے میں کیا رائے قائم کی مگر اس نے کچھ سوچ کر جواب دیا ''کل تم میرے پاس آتے تو میں تمھیں چھ ہزار تک دے سکتا تھا، پر آج۔۔۔''

''یہ تمھیں کرنا پڑے گا محمد منیر تنویر۔ چچا عبدالباقی۔'' میں نے کہا ''ہم کلاس فیلو تھے، میں نے تمھارے میٹرک کے امتحان کی فیس داخلہ دی تھی۔''

''اچھا ٹھہریئے۔'' وہ اب برفانی طور پر پُر تکلف ہو گیا، جیسے ہم اجنبی ہوں۔ اس نے گھنٹی بجائی۔ کلرک کے آنے پر تنویر نے اسے چار ہزار کا چیک لکھ کر دیا کہا سے فوراً کیش کرا لائے۔ اس نے ایک اسٹامپ لگے کاغذ پر مجھ سے چار ہزار روپے کی رسید لے لی۔

جب کلرک کیش لے آیا تو میں نوٹوں کو اندر کی جیب میں ٹھونس کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ محمد منیر تنویر نے مجھ سے مصافحہ کیا مگر وہ پہلے کی سی گرمجوشی بالکل مفقود تھی۔ مجھے یقین ہے کہ میرے جانے کے بعد اس نے اسٹینو کو بلوا کر بوڑھے آدمی کے نام خط ڈکٹیٹ کروایا ہو گا کہ میں بوڑھے آدمی کے حساب میں سے چار ہزار روپے اس سے لے کر گیا ہوں۔

اگلے دن کوئی نو بجے مولوی عبدالحنان کو ہمراہ لے کر ہم بولٹن مارکیٹ کے سامنے ٹریژری میں ایک ہزار جمع کرانے کے لئے گئے۔ کھڑکی کے آگے روپیہ جمع کرانے والوں کا ایک بیحد لمبا کیو تھا۔ چچا اور میں اس میں کھڑے ہو گئے۔ کیو آہستہ آہستہ آگے چلنے

لگا اور جب ہم خدا خدا کر کے کھڑکی کے پاس پہنچے تو اس پر ''ٹریژری کلوز'' کی تختی لگی ہوئی تھی۔ معلوم ہوا ٹریژری گیارہ بجے بند ہو جاتی ہے۔ دوسرے روز ہم نے علی الصبح کوئی پانچ بجے ہی ٹریژری کے باہر آ کر کھڑے ہو گئے۔ آٹھ بجے ہمیں پتہ چلا کہ ہم کیو میں سب سے پہلے اور آخری تھے۔ آج ٹریژری میں چھٹی تھی۔ تیسرے روز ہم روپیہ وصول کرنے والے کلرک کے پاس پہنچ گئے لیکن اس نے روپیہ جمع کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ پہلے سب ٹریژری میں جا کر فارم داخل کرایئے کہ ہم اتنی رقم اس مد میں جمع کرا رہے ہیں۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ سب ٹریژری کہاں ہے۔ آخر ایک شخص نے بتایا کہ وہ میونسپل کارپوریشن کے بازو میں ہے۔ ہم فوراً بھاگم بھاگ سب ٹریژری میں پہنچے۔ آدھ گھنٹے کے بعد فارموں والی کھڑکی کے پاس پہنچے تو پتہ چلا کہ چھپے ہوئے فارم ختم ہو چکے ہیں۔ ایک پان چباتے ہوئے کلرک نے سڑک کے پار ایک ٹائپ کرنے والے کی دوکان کی طرف اشارہ کیا اور کہا ''وہاں سے آپ کو ٹائپ شدہ فارم آٹھ آنہ فی فارم کے حساب سے دستیاب ہو جائیں گے۔''

ٹائپ والے کی دوکان کا نام ''دی رائل ٹائپنگ سکول'' تھا۔ پروپرائٹر (جو ایک سفید پتلون اور خاکی پیٹی کا فوجی کوٹ پہنے ہوئے تھا) نہایت خوش اخلاق شخص ثابت ہوا۔ اس نے ہمیں کرسیوں پر بٹھایا۔ ہمیں دو فارم دیئے اور کہا کہ ہم انہیں بھر سکتے ہیں۔ اس نے ہم سے ایک آنہ فی فارم چارج کیا۔ فارموں کو بھر کر ہم پھر فارم لینے والے کلرک کے پاس پہنچے۔ وہ اُس وقت چائے پی رہا تھا۔ چائے پی کر اُس نے اطمینان سے بیڑی سلگائی۔ بیڑی ختم کرنے کے بعد اس نے ہم سے فارم لے لئے اور چالان بنا کر ہمارے حوالے کیا کہ اسے روپیہ جمع کراتے ہوئے ٹریژری میں دے دیں۔ چالان لے کر ہم واپس ٹریژری کو بھاگے۔ وہ بند ہو چکی تھی۔ اس سے اگلے روز ہم صبح چار بجے ٹریژری کے باہر جا کر کھڑے ہوئے۔ اس دفعہ ہم کیو میں سب سے پیش تھے۔ آٹھ بجے کلرک کے آنے پر ہمارا روپیہ واقعی جمع ہو گیا اور ہم نے ٹریژری رسید لے کر اطمینان کا لمبا سانس لیا۔

ٹریژری رسید ہم نے مولوی عبدالحنان کو جا کر دی کہ اسے ہیڈ کلرک کو پہنچا دے۔ مولوی عبدالحنان سے اب کافی گاڑھی چھننے لگی تھی۔ اس حد تک کہ ایک دو دفعہ اس نے مجھے اپنا قدیمی پائپ بھی پینے کے لئے دیا۔ چچا عبدالباقی نے اس کو زیادہ دوست بنانے کی خاطر گھر کے دو پرانے مرتبان جو ۱۹۱۰ء سے بھی بہت پہلے کے خرید شدہ تھے، اُس کو تحفہ نذر کئے (پرانے مرتبان جمع کرنا مولوی عبدالحنان کی ہابیوں میں سے ایک تھی)۔

مجھ پر مولوی عبدالحنان خاص طور پر مہربان ہو گیا۔ ہماری اُس سے ملاقات کو چار روز ہی ہوئے تھے کہ اس نے مجھے اپنے دفتر میں ایک طرف لے جا کر پوچھا کہ آیا میں اس کی لڑکی سے شادی کرنا چاہوں گا، جس نے اسی سال میٹرک پاس کیا تھا اور ابھی ابھی شادی کے قابل ہوئی تھی۔ میں نے شائستہ انداز میں ایسا کرنے سے اپنی معذوری ظاہر کی۔ میرے انکار سے اسے صدمہ پہنچا۔ یہ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ اس کی لڑکی کم از کم چالیس برس کی تھی اور قطعی طور پر بہری ہونے کی وجہ سے اب تک کنواری تھی۔

کوئی سات روز کے بعد مولوی عبدالحنان سے ملنے پر اس نے ہمیں یہ خوشخبری دی کہ ہمارا ٹینڈر منظور ہو گیا ہے۔ چچا عبدالباقی نے مولوی عبدالحنان کی پیٹھ ٹھونکی کہ سب اس کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ مولوی عبدالحنان نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے اپنے کمیشن کا مطالبہ کیا۔

ہم نے یہ ظاہر کیا کہ ہم اس کا مطلب نہیں سمجھے۔ اس کو ساتھ لے کر ہم فوراً ڈائریکٹر آف فشریز کے دفتر پہنچے۔ ہیڈ کلرک نے ہم سے شرائط کے کاغذوں پر دستخط کرائے اور ہمیں ہدایت کی کہ ہم سرِ دست دو ہزار روپے کی رقم ٹریژری میں ڈائریکٹر فشریز کے نام کریڈیٹ کرا دیں۔ اس نے ہمیں یہ اطلاع دی کہ ہمارا پہلا فشری ٹرالر جمعہ یا سنیچر کی شام کو کیماڑی گودی میں لگ جائے گا اور یہ کہ ہم ڈائریکٹر کا سرٹیفکیٹ ٹرالر کے فورمین کو دکھا کر مال کی ڈلیوری لینے کے لئے تیار رہیں ورنہ نقصان کی صورت میں فشریز ڈیپارٹمنٹ پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوگی۔

''میری رائے میں عبدالباقی خاں۔۔۔'' مولوی عبدالحنان

چچا عبدالباقی کو ہمیشہ عبدالباقی خاں کہہ کر پکارتا تھا " آپ ٹرالر کو ان لوڈ کرانے کے بجائے ڈاکس پر ہی مال کو نیلام کرا دیں، اس سے آپ ان کو مارکیٹ میں فروخت کرنے کی بک بک سے بچ جائیں گے۔"

ہمیں یہ مشورہ بڑا اچھا لگا۔اسی روز کراچی کے "توپ و تفنگ" میں ایک اشتہار دے دیا گیا کہ مچھلیوں سے دلچسپی رکھنے والے حضرات جمعہ یا سنیچر کو بولی دینے کے لئے کیاڑی ڈاکس پر جہاں چارٹن مچھلی کا نیلام ہوگا، تشریف لے آئیں۔

"جمعہ کی شام کو۔۔۔" چچا عبدالباقی نے کہا "پانچ ہزار روپیہ ہماری جیب میں ہوگا، بھتیجے بختیار! میں ابھی سے اپنی جیب میں اسے چھلکتے ہوئے محسوس کر رہا ہوں۔"

جمعہ کے روز ہم دوپہر کے بارہ بجے ہی کیاڑی ڈاکس پر جا پہنچے۔ ہمارا فشنگ ٹرالر ابھی کہیں دکھائی نہ دیتا تھا۔مولوی عبدالحنان نے جو ہمارے ہمراہ تھا، کہیں سے پتا کر کے ہمیں بتایا کہ ٹرالر غالباً شام کے پانچ بجے چھ نمبر گودی میں برتھ ہوگا۔ ہم نے ایک دو گھنٹے حاجیوں کے جہاز کو دیکھنے میں صرف کئے۔ چار بجے کے قریب تین چار کاروباری قسم کے لوگ نمبر ۶ گودی پر منڈلاتے ہوئے ہمیں نظر پڑے۔مولوی عبدالحنان انہیں پہچانتا تھا۔اُس نے کہا کہ یہ بولی دینے والی پارٹیاں ہیں۔ بقول اس کے ان میں سے ایک کراچی فشنگ مارکیٹ کی سب سے زبردست پارٹی تھی، کم از کم پانچ چھ لاکھ کی مالیت کی۔

چچا عبدالباقی اپنے بہترین پُر وقار انداز میں مسکراتا ہوا ان کی طرف گیا۔

"آپ صاحبان تھوڑی دیر انتظار کیجئے۔" اس نے کہا "فشنگ ٹرالر ایک آدھ گھنٹے تک گودی میں لگ جائے گا۔اسی وقت ہم نیلام کا آغاز کریں گے۔"

"کیچ کتنا ہے اندازاً؟" ایک لال داڑھی والے شخص نے پوچھا۔

"چارٹن کے اریب۔" ایک میلے کوٹ اور گول ٹوپی والے میمن نے کہا "ہم کو اور بھی کام ہے نا، سالا، ادھر مچھلی کا دھندہ ہی تو نہیں ہے۔"

مولوی عبدالحنان نے چچا عبدالباقی اور مجھ کو ایک طرف لا کر سمجھایا کہ پارٹیاں بہت بڑی بڑی ہیں اور ان کو اس طرح جانے دینا بہت بڑی غلطی ہوگی۔اس نے کہا کہ نیلام کے لئے ضروری نہیں کہ ٹرالر کے آنے پر ہی کی جائے۔اس کا آغاز ابھی سے کیا جا سکتا ہے۔

چچا کی خواہش تھی کہ میں نیلام کروں لیکن میں نے اس کام میں بالکل تجربہ نہ ہونے کی بناء پر صاف انکار کر دیا۔ آخر چار و ناچار چچا نے اپنے آپ کو گودی پر پڑے ہوئے ایک لکڑی کے کریٹ پر کھڑا کر لیا۔ چار پانچ بولی دینے والے حضرات، ڈاکس کے کچھ مزدور اور سات آٹھ بچے اس کے گرد جمع ہو گئے۔

"خاموش صاحبان۔" چچا عبدالباقی نے ایک بہترین پیشہ ور نیلام کرنے والے کے لہجے میں کہا "گورنمنٹ فشریز کی چارٹن مچھلی جو ٹرالر ابھی لا رہا ہے، نیلام کی جاتی ہے۔ بولئے صاحبان، چارٹن فسٹ کلاس کوالٹی اور ہر قسم کی تازہ مچھلی کے لئے، پامفرٹ، جھینگا اور رنگارنگ مچھلی کے لئے، بولئے صاحبان۔۔۔"

"پانچ روپے۔" کالے کوٹ اور گول ٹوپی والے میمن نے بولی دی۔ دو تین آدمی ہنسے۔

"کیا۔۔۔ پانچ ہزار کے مال کے لئے پانچ روپے؟" عبدالباقی نے کہا۔

"پانچ روپے بارہ آنے۔" ایک سبز داڑھی والے نے جس کا چہرہ مجھے بے حد آشنا سا لگا تھا، آواز دی۔

"چھ روپے!" کالے کوٹ والے نے کہا۔

"آپ لوگ مذاق کر رہے ہیں۔" چچا عبدالباقی نے سرزنش کی "اگر آپ اسی طرح بولی دیں گے تو ہمیں مجبوراً نیلامی کو بند کرنا پڑے گا۔"

"دو سو روپے۔" مولوی عبدالحنان نے جو بولی دینے والوں میں جا شامل ہوا تھا، آواز دی۔

"دو سو روپے! دو سو روپے!! آیئے، کم از کم پانچ ہزار کے مال کا دو سو روپے۔" چچا نے مجمع کی حوصلہ افزائی کی۔

’’دوسوروپے بارہ آنے۔‘‘ کالے کوٹ والا بولا۔

’’دوسوایک۔‘‘ سبز داڑھی بلی۔

’’چارسوروپے۔‘‘ مولوی عبدالحنان نے پھر بولی کو اوپر چڑھا دیا۔

’’چارسوروپے، آیئے چارسوروپے صاحبان، چارٹن فسٹ کوالٹی، فسٹ کوالٹی، تازہ بہترین فش کے ساتھ، یہ سمندر کی مچھلی ہے، دریائے لیاری میں پکڑی ہوئی مچھلی نہیں۔‘‘ چچا عبدالباقی کا لہجہ اب پرامید اور پراعتماد تھا۔

’’چارسوایک۔‘‘ پھر کالے کوٹ والے نے کہا۔

’’چارسوبیس۔‘‘ سبز داڑھی والے نے اچھلتے ہوئے چچا عبدالباقی کی سمت بازو سے اشارہ کیا۔

’’چارسوبیس صاحبان، چارسوبیس، بحیرۂ عرب کی خوبصورت اور ستھری چارٹن مچھلی کے لئے صرف چار سو روپے۔ آیئے صاحبان، وہیل مچھلی جتنی بڑی بڑی مچھلی۔‘‘ چچا سر اپا نیلام کرنے والا تھا۔

’’ایک ہزار روپے۔‘‘ مولوی عبدالحنان بولا۔

یہ سلسلہ کچھ دیر تک چلتا رہا، آخر بولی گیارہ سو تک آ کر رک گئی اور چچا عبدالباقی کی ساری منتوں کے باوجود کوئی بھی عبدالحنان کی آخری بولی کو بڑھانے کے لئے تیار نہ ہوا۔ ہماری چڑھتی ہوئی امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ ہمیں یعنی چچا عبدالباقی کو پورا یقین تھا کہ بولی چار ہزار سے اوپر جائے گی۔

’’آپ حضرات تشریف لے جایئے۔‘‘ چچا نے خشمگیں ہو کر کہا۔ ’’آپ نے ہمارا وقت ضائع کیا ہے۔‘‘

کاروباری آدمی آپس میں مشورہ کرنے لگے۔ آخر سبز داڑھی والا آدمی چچا کے پاس آیا ’’دیکھو، بارہ سوروپے میں بات پکی کرو۔ مارکیٹ میں تم کو اس سے آدھی رقم بھی نہیں ملے گی۔ مچھلی بہت آنے کی وجہ سے نرخ بڑے گرے ہوئے ہیں، یہ میرا آخری بڈ ہے۔‘‘

’’جہنم میں جاؤ۔‘‘ چچا عبدالباقی نے اس سے کہا۔ وہ چڑ گیا تھا۔

’’حاجی صاحب، گرم مت ہو۔‘‘ سبز داڑھی والے نے تحمل سے کہا ’’میں نے تمھارے فائدے کی بات کی ہے۔‘‘ میں سوچنے لگا کہ میں نے اس شخص کو کہاں دیکھا ہے؟

’’جایئے صاحب۔‘‘ چچا عبدالباقی نے کہا ’’میں نے کہہ دیا کہ میں مچھلے فروخت نہیں کرنا چاہتا، میں ایک مچھلی بھی فروخت نہیں کروں گا۔‘‘

مجمع سے دور ہٹ کر ایک بھوری سی مونچھوں والا چھوٹا سا آدمی مولوی مولوی عندالحنان سے کہہ رہا تھا۔ ’’اس فشنگ ٹرالر کا ڈوب جانا ہی ٹریجڈی ہے۔ بار بر ماسٹر کہتا تھا کہ اس کے پیندے میں سوراخ تھا۔‘‘

میں بدحواس ہو کر چچا عبدالباقی کی طرف بھاگا اور اُسے ٹرالر کو ڈوبنے کی خبر سے مطلع کیا۔ اس نے بڑی دلیری سے اس خبر پر یقین کرنے سے انکار کر دیا۔ اتنے میں مولوی عبدالحنان اپنی پیس فورس میں ایک ماتمی چال چلتا ہوا آیا۔ اس نے کہا کہ ٹرالر کے ڈوب جانے سے اسے بیحد افسوس ہے۔

’’یہ کوئی اور ٹرالر ہوگا بھتیجے۔‘‘ چچا عبدالباقی نے مردانگی سے کہا ’’یہ ٹرالر ہمارا نہیں ہوسکتا۔‘‘

مولوی عندالحنان کو یقین تھا کہ یہ ہمارا ہی ٹرالر تھا۔

چچا عبدالباقی نے کسٹم ہاؤس کے دفتر سے بار بر ماسٹر کو رنگ کر کے دریافت کیا کہ آیا کسی فشنگ ٹرالر کے ڈوبنے کی اطلاع آئی ہے۔ بار بر ماسٹر نے جواب دیا کہ اسے علم نہیں لیکن اگر یہ فشریز ڈیپارٹمنٹ کے ٹرالروں میں سے ایک ہے تو اسے اس کے ڈوبنے پر بے حد خوشی ہوگی کیونکہ ان ٹرالروں نے بار بر کو خواہ مخواہ بلاک کر رکھا ہے۔

ہم نے آٹھ بجے رات تک ٹرالر کا انتظار کیا۔ جب وہ نہ آیا تو ہمیں یقین ہوگیا کہ وہ ضرور ڈوب گیا ہوگا۔

’’اس کا مطلب ہے۔‘‘ میں نے کہا ’’اب ہمیں اگلے ہفتے تک دوسرے ٹرالر کیچ کا انتظار کرنا پڑے گا۔‘‘

عبدالحنان نے ہمیں بتایا ’’گورنمنٹ نے اس ٹرالر کی مچھلی آپ کو شرائط کے ساتھ فروخت کر دی ہے۔ اگر خدانخواستہ یہ ٹرالر

ڈوب گیا ہے تو نقصان آپ کو برداشت کرنا پڑے گا۔ اگلے کیچ کے لئے آپ کو مزید رقم جمع کرانا ہوگی۔"

جب ہم ڈاکس سے واپس ہوئے تو چچا اور میں دنیا کے غمگین ترین آدمی تھے۔

رات کو ۹ بجے مولوی عبدالحنان مجھ سے میرے فلیٹ پر ملنے کے لئے آیا۔ اس کے ہمراہ ایک چوڑے منہ ایک چپٹی ناک والی ایک چالیس سالہ عورت تھی۔ اس نے اونچی ایڑیوں والی گرگابیاں اور فراک پہنی ہوئی تھی۔ اس کی ایک ٹانگ جراب کے بغیر تھی۔

میرے دروازہ کھولنے پر عبدالحنان نے کہا "میں اپنی بیٹی سے تمھارا تعارف کرانے آیا ہوں۔ تم اسے نہایت کم سخن اور مخلص پاؤ گے۔"

میں نے محض اخلاقاً اس خاتون کو بیٹھنے کی دعوت دی۔ اس نے مجھے کوری احمقانہ نظروں سے دیکھا۔

"اِس سے کچھ کہنا فضول ہے۔" عبدالحنان بولا "یہ بالکل بہری ہے۔"

"بڑے افسوس کی بات ہے۔" میں نے ہمدردی جتائی۔

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا" عبدالحنان نے مجھے ایک طرف لے جا کر سرگوشی سے کہا۔

"مولوی عبدالحنان، تمھارا اس سے کیا مطلب ہے؟" میں نے معصومیت سے پوچھا۔

"کچھ نہیں، کچھ نہیں۔" عبدالحنان نے پہلو بدل کر کہا "اچھا مسٹر بختیار، مجھے کل شام کے لئے ڈنر سوٹ درکار ہے۔ محمد احسن صاحب اشرفی نے مجھے اور چند اور دوستوں کو کل رات ڈنر پر بیچ لگژری میں مدعو کیا ہے۔ مدعو تو انھوں نے دراصل میری بیٹی شریفن کو کیا ہے لیکن چونکہ اس کو ریکوسٹ کرنے کے لئے ضرور کوئی ہمراہ ہونا چاہیے اس لئے میرا جانا ضروری ہے۔ چاہو تو تم بھی اس کے ساتھ جا سکتے ہو۔"

میرے پاس ڈنر سوٹ نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

عبدالباقی خاں کے پاس ہے؟" اس نے پوچھا پچھلے سال اس کے پاس غالباً ڈنر سوٹ تھا۔ وہ آج کل اس کے ڈرائنگ روم میں ٹیبل کلاتھ کا کام دے رہا ہے۔"

"تمھارے کسی اور دوست کے پاس ہے، مسٹر بختیار؟ مجھے ڈنر سوٹ کہیں نہ کہیں سے ضرور لے دو۔"

میں نے اسے جلد ٹالنے کے لئے محمد منیر تنویر کے نام ایک تعارفی خط لکھ دیا کہ اگر ممکن ہو تو وہ اپنا ڈنر سوٹ ایک رات کے لئے مولوی عبدالحنان کو دے دے۔

"مولوی عبدالحنان" میں نے لکھا "بڑے شریف اور مرنجاں مرنج بزرگ ہیں اور ان کی لڑکی شریفن کا ایک عیب بہرہ پن ہے۔ ورنہ بڑی پرکشش اور سلیقہ شعار خاتون ہیں۔"

عبدالحنان اور اسکی بیٹی تھوڑی دیر اور ٹھہرے۔ عبدالحنان اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ جانے سے پہلے اس نے مجھ سے پانچ روپے مانگے جو میں نے اسے دے دیے۔

اگلے دن ہم فشریز کے دفتر میں گئے۔ وہاں ٹرالر کے ڈوبنے کی اطلاع نہیں پہنچی تھی۔ ہیڈ کلرک نے کہا کہ ڈیپارٹمنٹ کے پاس لے دے کے یہی ایک کام کا ٹرالر تھا۔ باقی پانچ ٹرالر پیندوں میں سوراخوں کی وجہ سے ایک مدت سے بیکار پڑے تھے۔ فشریز ڈیپارٹمنٹ نے انگلستان سے چار ہزار ماہوار پر ایک ٹیکنیکل ایکسپرٹ کی خدمات حاصل کی تھیں جو ڈیپارٹمنٹ کو سوراخوں کے بند کرنے کے متعلق مشورہ دے گا۔

ہیڈ کلرک سے ملنے کے بعد مولوی عبدالحنان اور ہم مزید تفتیش کی خاطر کیماڑی ڈاکس پر جا نکلے۔ نمبر ۲ گودی پر ایک زنگ آلود ٹیڑھی فشل والی چیز کھڑی دھواں چھوڑ رہی تھی۔ اس سے مچھلی کی تیز بو آ رہی تھی۔ یہ ہمارا ٹرالر تھا۔ اس کے ڈوب جانے کی خبر کسی نے یونہی اُڑا دی تھی۔

ہم نے فیصلہ کر لیا تھا کہ مچھلی کو نیلام کرنے کے بجائے ہم اسے خود مارکیٹ کر کے فروخت کریں گے۔ تین ہزار روپیہ تو ہم کو ٹھیکے کی شرائط کے مطابق حکومت کو ادا کرنا تھا اور یہ ظاہر تھا کہ جب تک ہم اس کو کم از کم چار ہزار میں فروخت نہ کر دیں، یہ ہمارے لئے گھاٹے کا سودا تھا۔ نیلام میں بولی بارہ سو سے اوپر نہ گئی تھی۔ اس قیمت کو قبول کر لینے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

ہم نے ٹرالر کے فورمین کو مل کر فشریز کا خط دکھایا اور اس نے کہا کہ ہم مچھلی کی ڈلیوری لے سکتے ہیں۔ ہم نے فوراً مچھلیوں کو گودی پر اَن لوڈ کرانا شروع کر دیا۔ چچا عبدالباقی نے مجھے شہر میں ایک سو خالی بوریاں لانے کے لئے بھیجا۔ جب میں بڑی مشکل سے خالی بوریاں لے کر آیا تو مچھلیوں کو اس میں بھرنے کا کام شروع ہوا جو کہیں شام کے پانچ بجے جا کر ختم ہوا۔

مچھلیوں کو چھ اونٹ گاڑیوں میں لدوا کر ہم روانہ ہوئے۔ کل والے بولی دینے والوں میں سے ایک دو آج بھی موجود تھے۔ ان میں سبز داڑھی والا بھی تھا۔ اب وہ چچا عبدالباقی کے پاس آیا۔

''بارہ سو روپے میں دے دو، باقی خرچہ میں ادا کر دوں گا۔ تمھارے فائدے کے لئے کہہ رہا ہوں۔'' اس نے پیش کش کی۔

''میں تم سے کئی بار کہہ چکا ہوں۔'' چچا عبدالباقی نے اکڑ کر اسے بتلایا ''کہ میں یہ مچھلی فروخت نہیں کروں گا۔''

''فروخت آپ کیسے نہیں کریں گے۔ آخر اتنی چارٹن مچھلی آپ کیا کریں گے۔''

''یہ ہماری مرضی ہے کہ ہم اس سے جو بھی کریں۔ تم کو کیا؟ بتاؤں تمھیں ہم کیا کریں گے؟ ہم ان کو غرباء میں تقسیم کر دیں گے، یا ان کو کھا لیں گے یا ان کو واپس سمندر میں پھینک دیں گے لیکن تمھیں ہرگز نہ بیچیں گے۔'' چچا عبدالباقی غصے میں تھا۔

''آپ کو اسے سمندر میں غالباً واپس پھینکنا پڑے گا، مارکیٹ میں اسے کوئی دیکھے گا بھی نہیں۔''

''جہنم میں جاؤ۔'' چچا گرجا۔

''میں تمھارے فائدے کی بات کر رہا ہوں۔'' سبز داڑھی والے نے کہا ''تم پچھتاؤ گے۔''

''میرا پیچھا چھوڑو، میں نے کہہ دیا ہے کہ یہ مچھلی فروخت نہ ہوگی، کیا میں پولیس کو بلاؤں، بختیار، پولیس کو بلاؤ۔''

''جہنم میں جاؤ۔'' سبز داڑھی نے جاتے ہوئے وار کیا۔

''میں تمھیں وہاں پہنچا کر رہوں گا۔'' چچا نے اسے اطمینان دلایا۔

چنا کریک دا کی کسٹم چوکی پر کسٹم والوں نے ہمارا بڑا وقت ضائع کیا۔ ایک ریلوے گارڈ کی سی ٹوپی والے شخص نے ہم سے دو درجن بوریاں کھلوا کر اندر جھانکا۔ غالباً اس کے نزدیک اس امر کا قوی امکان تھا کہ ہم مچھلیوں میں سونا چھپا کر لے جا رہے ہیں۔ پورے تین گھنٹے ان لوگوں نے ہمیں خراب کیا اور آخر میں انہوں نے ایک درجن بوریاں اٹھوا کر اپنے پاس رکھ لیں، جن کی وہ فرصت کے وقت اچھی طرح جانچ پڑتال کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اس میں مجھے سبز داڑھی والے کا ہاتھ معلوم ہوا۔ اس نے شائد کسٹم والوں کو ہمارے خلاف کر دیا تھا۔ میں نے اسے اس عرصہ میں کئی دفعہ کسٹم کے ایک انسپکٹر کے ساتھ ہم نوالہ و ہم پیالہ انداز میں سرگوشیاں کرتے ہوئے دیکھا۔ اس نے ضرور بتایا ہوگا کہ ہم اسمگلر ہیں اور فی الواقع چچا عبدالباقی گودی پر کام کروانے کے بعد اپنی چڑھی ہوئی آستینوں کے ساتھ کویت یا بحرین کی طرف کا کوئی مشکوک قزاق یا اسمگلر ہونے کا تاثر دیتا تھا۔

کسٹم سے گزرنے کے بعد میں نے سبز داڑھی والے کو نگاہ میں رکھا۔ وہ اب ہمارے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ یکلخت اس نے ایک حرکت کی جو مجھے بڑی عجیب لگی۔ اس کی داڑھی ایک طرف سے اُتر گئی تھی اور وہ اسے ہاتھ سے جمانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے اس کو چپکانے کے لئے صحیح قسم کی گوند استعمال نہیں کی تھی۔ فوراً مجھے پتہ چل گیا کہ اس کا چہرہ کیوں اتنا آشنا تھا۔ یہ شخص محمد احسن اشرفی تھا، مصنوعی داڑھی کے ساتھ۔

میں نے چچا عبدالباقی کو جا کر بتایا کہ میری رائے میں سبز داڑھی والا شخص محمد احسن اشرفی تھا۔

''بختیار، تم میں چہروں کو یاد رکھنے کا ملکہ مطلق نہیں ہے۔'' اس نے کہا ''محمد احسن اشرفی کی داڑھی نہیں تھی۔''

جب میں نے اسے داڑھی کو جمانے کا واقعہ سنایا تو اس نے اس پر غور کیا۔

''ہاں، میں بھی سوچ رہا تھا کہ میں نے اسے کہیں دیکھا ہے، اس کے نقوش محمد احسن اشرفی سے بہت ملتے جلتے ہیں۔ اچھا ذرا ٹھہرو۔''

چچا عبدالباقی سبز داڑھی والے کی طرف گیا۔

''ہاں تو بارہ سو روپے آپ نے کہے تھے؟'' اس نے کہا۔

''اور ان لوڈنگ وغیرہ کا خرچہ بھی دوں گا'' سبز داڑھی والے نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''بارہ سو روپے۔۔۔'' چچا عبدالباقی نے سوچنے کی ایکٹنگ کی ''ذرا قبلہ معاف کیجئے، آپ کی داڑھی میں دو تنکے الجھے ہوئے ہیں۔'' ایک پھرتیلی حرکت سے چچا نت سبز داڑھی کو ہاتھ سے جھٹک دیا۔ داڑھی بالکل صاف ایک گال اور ٹھوڑی سے اُتر آئی اور محمد احسن اشرفی کے آشنا نقوش نمایاں ہو گئے۔ اشرفی نے داڑھی کو پھر جلدی سے جمانے کی کوشش کی۔

''تم محمد احسن اشرفی ہو۔'' چچا عبدالباقی نے فاتحانہ للکار سے اسے چیلنج کیا۔

''تم نے میری داڑھی پر کیوں ہاتھ ڈالا؟'' اشرفی بولا ''برسرِ بازار تم نے میری ہتک کی ہے، بہت سے لوگ دیکھ رہے تھے۔''

''تمھاری داڑھی جعلی ہے اور تم یقیناً اشرفی ہو۔''

''داڑھی میری اپنی ہے، کھال میں چند حیاتیات کی کمی کی وجہ سے یہ کبھی کبھی جھڑنے لگتی ہے۔'' اشرفی نے کہا ''تمھیں اسے جعلی کہنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔۔۔ تمھارا محمد احسن اشرفی جائے جہنم میں، میرا نام حاجی چراغ دین ہے۔''

''اب رہنے بھی دو مسٹر اشرفی۔'' چچا نے مسکراتے ہوئے کہا ''ہم نے تمھیں پہچان لیا۔ ویسے یہ بتاؤ کہ اس طرح کرنے سے تمھارا آئیڈیا کیا ہے؟''

''محمد احسن کی ایسی کی تیسی، میں حاجی چراغ دین، صدر انجمن مچھلی فروشاں کراچی ہوں۔'' اشرفی نے اصرار کیا ''بولو تم مچھلی بارہ سو میں فروخت کرتے ہو یا نہیں؟''

''تم ایک کمینے رذیل شخص ہو۔'' چچا نے کہا۔

فشریز کا ہیڈ کلرک ہمیں آگے پل پر رکشہ میں آتا ہوا ملا۔ اس نے دیر سے پہنچنے پر معذرت کی اور چچا عبدالباقی کو ایک طرف لے جا کر کہا ''تین من مچھلی ابی سینا لائنز میں کوارٹر اٹھارہ میں پہنچا دیں، میری لڑکی کی کل شادی ہے۔ عبدالحنان آپ کو جگہ دکھا دے گا۔''

ہیڈ کلرک رکشہ میں واپس چلا گیا۔

فش مارکیٹ میں مایوسی ہماری منتظر تھی۔ جیسا کہ محمد احسن اشرفی عرف حاجی چراغ دین نے پیشگوئی کی تھی۔ وہاں کوئی بھی ہماری مچھلی کو خریدنے پر تیار نہ ہوا۔ بیشتر مارکیٹ والوں کا سلوک ہمارے ساتھ تمسخرانہ اور ترحم آمیز تھا۔ انہوں نے فوراً بھانپ لیا تھا کہ ہم مچھلی کے بیوپار کی ابجد سے بھی نابلد ہیں۔ وہ لوگ دو یا تین بار کھلم کھلا ہنسے اور عبدالباقی اور میرے بارے میں ایسی ایسی باتیں کہنے لگے جو کبھی نہیں جا سکتیں۔ آخر ایک بوڑھے دوکاندار نے ہمیں سمجھایا ''میاں، یہاں کا سارا مچھلی کا بزنس بڑے بڑے ٹھیکیداروں کے ہاتھ میں ہے، جنہوں نے آپس میں ایکا کر رکھا ہے، اگر تم اس مچھلی کو یہاں مفت بھی دو گے تو کوئی نہیں لے گا۔''

محمد احسن اشرفی عرف حاجی چراغ دین چچا کے پاس آیا ''میں نے آپ کو بتایا تھا کہ مچھلی ایسے نہیں بک سکتی۔ بارہ سو روپے میں اب بھی سارا لاٹ لینے کے لئے تیار ہوں خرچہ۔۔۔''

''اشرفی، تم ایک دھوکے باز ہو۔'' چچا عبدالباقی نے کہا ''تم لوگوں نے ہمیں ناکام بنانے کے لئے یہ سازش کی ہے۔ میرا نام عبدالباقی نہیں ہوگا اگر میں نے تمھیں ایک بھی مچھلی فرخت کی۔''

''اشرفی اشرفی کیا کہتے ہو، میں حاجی چراغ دین ہوں۔''

آٹھ بجے جب ہم مچھلی کو مارکیٹ میں بیچنے میں کامیاب نہ ہو سکے تو عبدالباقی نے فیصلہ کر لیا کہ اسے فی الحال چچا کے مکان، واقع جیل روڈ، کے احاطہ میں سٹیک کرا دیا جائے۔ چچا کو اس امر کا یقین تھا کہ ایک دو روز میں مچھلی کے تھوک فروش اسے چار ہزار دینے پر رضامند ہو جائیں گے۔

ہم نے ابھی امید نہیں کھوئی تھی مگر حالات ناموافقت اختیار کر رہے تھے۔ پچھلے تجربوں کی بناء پر میں نے اندازہ لگایا کہ چچا کی ایک اور سکیم سرمایہ لگانے والے حصہ دار خلجی کو چار ہزار کے زیاں میں مبتلاء کر کے اپنے ناگزیر اور حسرت ناک انجام تک پہنچ چکی ہے۔

ہم نے مچھلی کے بوروں کو چچا کے مکان کے پچھلے احاطہ میں

ڈھیر کر دیا۔ یہ احاطہ پہلے بھی کئی بار مختلف اور عجیب وغریب اشیاء کے سٹور کا کام دے چکا تھا۔ پاس کے ہمسائے دیوار پر سے ہمیں بوروں کے ڈھیر لگاتے دیکھتے رہے اور جو اجرت ہمیں اونٹ گاڑی والوں کو دینی پڑی اس ڈر سے یہاں نہیں دی جاتی کہ کوئی اس پر یقین نہیں کرے گا۔

دو تین دن مارکیٹ میں سرتوڑ کوششوں کے باوجود ہمیں مچھلیوں کا کوئی خریدار نہیں ملا۔ چچا عبدالباقی نے آخر تجویز پیش کی کہ ہم مچھلیوں کو تھوک فروخت کرنے کے بجائے پرچون میں بیچیں۔ ایک بورڈ "فش سپلائی کمپنی" چچا عبدالباقی کے مکان کے پھاٹک پر لگا دیا گیا۔ اس کے نیچے ہی گاہکوں کے لئے مختلف قسم کی مچھلیوں کی فہرست ان کی قیمتوں کے ساتھ چسپاں کر دی گئی۔ چچا عبدالباقی اور میں نے پورا ایک دن مختلف مچھلیوں کی قیمت مقرر کرنے میں صرف کیا۔ پہلے دن کوئی بھی گاہک مچھلی خرید کرنے کے لئے نہ آیا۔ چچا عبدالباقی لوگوں کی مچھلیوں سے اس قدر بے اعتنائی سے متحیر اور خفا تھا۔

مولوی عبدالحنان شام کو البتہ اپنی بوسیدہ پلس فور میں آیا۔ ہم نے اس دن سے جب سے ہم نے ٹرالر سے مچھلیاں لائے تھے، اس کی شکل نہیں دیکھی تھی اور چچا عبدالباقی کو یقین تھا کہ وہ بھی محمد احسن اشرفی اور دوسرے لوگوں کی طرح ہمیں تباہ کرنے کی سازش میں شریک ہے۔ آتے ہی اس نے مجھے اپنا پائپ پینے کی پیشکش کی، جسے میں نے خودداری کے جذبے کے تحت قبول نہ کیا۔ اس نے ہمارا حوصلہ بڑھایا۔ پھر اس نے ہمیں اطلاع دی کہ میٹھادر کے راحت جان ہوٹل کے منیجر حاجی حسین بخش نے اس کا داماد بننا منظور کر لیا ہے۔ شرائط پر دستخط وغیرہ ہو چکے ہیں اور ڈھائی سو روپے پر فیصلہ ہو گیا ہے۔ اس نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے میں نے ایک نادر موقع ہاتھ سے کھو دیا ہو۔

عبدالحنان نے وعدہ کیا کہ آئندہ سے وہ برائے نام کمیشن پر باقی فشریز کمپنی کے سیلز مین کی حیثیت سے کام کرے گا اور ایک دو روز تک اپنے ہونے والے داماد حاجی حسین بخش سے کم از کم پندرہ سیر مچھلی کا آرڈر لے آئے گا۔ ہم نے شکر رنجی کی بناء پر اس کے دوغلے پن کو جانتے ہوئے اس سے زیادہ کھل کر باتیں نہ کیں۔ جاتے ہوئے مولوی عبدالحنان اپنی باسکٹ اور پلس فور کی جیبوں میں پانچ چھ مختلف قسم کی مچھلیاں ڈال کر لے گیا۔ انہیں وہ باقی فش سپلائی کمپنی کی مچھلیوں کے نمونے کے طور پر اپنے داماد کو دکھانے کا آرزومند تھا۔

"یہ مولوی عبدالحنان کام کا آدمی ہے۔" چچا عبدالباقی نے کہا "ممکن ہے کہ یہ محمد احسن اشرفی وغیرہ سے نہ ملا ہوا ہو۔ اب ہوٹلوں کے آرڈر شروع ہو جائیں گے۔ ہم بازار سے کہیں کم قیمت پر سپلائی کر رہے ہیں۔ تم ایک کام کرو۔ کل اپنی جیب میں ایک نوٹ بک لے کر کراچی کے بڑے بڑے ہوٹلوں مثلاً میٹروپول، پیلس وغیرہ کے منیجروں سے ملاقات کرو اور اُن سے مچھلیوں کے آرڈر بک کر لو۔ اس سے تمہیں سیلز مین کے کام کا تجربہ ہو جائے گا۔

چار دن کے بعد مچھلی سڑنے اور بو چھوڑنے لگی۔ یہ اس قدر تیز اور بے پناہ تھی کہ آدمی اسے دو فرلانگ دور سے سونگھ سکتا تھا۔ مسز عبدالباقی نے چچا کو الٹی میٹم دیا کہ اگر یہ مچھلی یہاں سے فوراً اُٹھوا نہ دی گئی تو وہ اپنے میکے چلی جائے گی۔ چچا عبدالباقی نے مجھ سے عورتوں کی خودغرضی اور تنگدلی کی شکایت کی۔

اسی دن ساتھ کی کوٹھیوں اور مکانوں کے ہمسائے ایک وفد کی صورت میں چچا کے پاس آئے۔ انہوں نے شکایت کی کہ مچھلی کی سرانڈ کی وجہ سے ان کی زندگی ناقابلِ برداشت ہو گئی ہے اور یہ کہ اسے یہاں سے فوراً اٹھوا دیا جائے۔

چچا نے اس پر تعجب کا اظہار کیا۔

"یہ میرا مکان ہے۔ یہاں میں چاہوں تو گھوڑے باندھ سکتا ہوں، بکرے ذبح کر سکتا ہوں، آلو کاشت کرا سکتا ہوں۔ بحیثیت مالک مکان یہ حقوق مجھے حکومت کی طرف سے حاصل ہیں۔ آپ لوگوں کو مچھلی کی بو ناپسند ہے تو آپ کہیں اور جا سکتے ہیں۔ مجھے تو یہ بو نہایت خوشگوار لگتی ہے۔"

وفد سخت غصے میں رخصت ہوا۔ اس کے ممبروں نے چاچ کو دھمکی دی کہ وہ ہیلتھ آفیسر کو رپورٹ کریں گے۔

مولوی عبدالحنان اس عرصہ میں تین چار دفعہ آیا۔ اس نے

ہمیں بتایا کہ وہ آرڈر بک کرنے کے لئے پوری جان مار رہا ہے۔ آخری دفعہ وہ پورے چار بورے وہاں سے اُٹھوا کر اپنے داماد کے لئے لے گیا۔

''میرے داماد کی حالت آج کل اتنی اچھی نہیں۔'' اس نے کہا ''اسے مہینے کے آخر میں بل بھجوا دو۔ اس وقت وہ اسے ادا کرنے کے قابل ہوگا۔''

دوسری دفعہ ایک اور پیشکش لایا، جس سے اس پوری سازش کا حال، جو ہمیں تباہ کرنے کے لئے کی گئی تھی، ہم پر کھل گیا۔ تب ہمیں پتہ چلا کہ ہماری بربادی کی سازش ایک منظم منصوبہ بندی کے تحت پلین کی گئی ہے اور یہ کہ غنڈوں کا ایک پورا سینڈیکیٹ ہمارے خلاف کام کرتا رہا ہے۔

مولوی عبدالحنان کراچی کے ایک فش کنگ کی پیشکش لایا۔

''عبدالباقی خاں، وہ سارے لاٹ کے لئے چار سو روپے دینے کو تیار ہے۔ میرے خیال میں اب تم اسے بیچ دو، مال سڑ رہا ہے۔''

''چار سو؟'' چچا عبدالباقی نے کہا ''اس فش کنگ کا نام کیا ہے؟''

''حاجی چراغ دین، جس نے اس دن ڈاک پر بولی دی تھی۔''

''تمہارا مطلب محمد احسن اشرفی سے ہے؟''

مولوی عبدالحنان کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

''نکل جاؤ۔'' چچا عبدالباقی گرجا ''تم سب لوگ ہمیں تباہ کرنے کی سازش میں شریک ہو۔ میں تمہاری شکل نہیں دیکھنا چاہتا۔ براہ مہربانی میرے وہ مرتبان، جو میں نے تمھیں دیے تھے، واپس کر دو۔''

عبدالحنان کو ان الفاظ نے صدمہ پہنچایا۔

''عبدالباقی خاں، میں نے آپ کی خاطر اتنی دوڑ دھوپ کی، رات دن ایک کیا، ایک ہفتے سے میں فشنگ کے لئے نہیں جا سکا، اس سے میری صحت پر اثر پڑا ہے۔''

''مولوی عبدالحنان'' چچا عبدالباقی نے کہا ''اب سچ سچ بتاؤ، تم نے کتنے ٹینڈر دینے والوں کو اس طرح خراب کیا۔''

''عبدالباقی خاں، مجھے فی الواقعی تمھاری اس بدظنی سے دلی صدمہ پہنچا ہے۔''

''اچھا اب دور ہو جاؤ، میں تمھاری شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتا۔''

دور ہو جانے سے پہلے عبدالحنان نے مجھے ایک طرف لے جا کر یقین دلایا کہ اگر میں نے اس کی بیٹی شریفن کے متعلق اپنی رائے تبدیل کر دی ہو تو وہ مجھے اپنی دامادی میں لینے کے لئے تیار ہے کیونکہ شریفن کو راحتِ جاں ہوٹل کا منیجر پسند نہیں آیا۔

''چارجز'' اُس نے کہا ''صرف ڈیڑھ سو روپے ہوں گے۔''

عبدالحنان کے چلے جانے کے بعد چچا عبدالباقی نے تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد کہا ''بھتیجے بختیار، ان سب لوگوں نے مچھلیوں کے ٹھیکیداروں کو تباہ کرنے کی منظم سازش کی ہے۔ میں اب اس سنڈیکیٹ کا طریقۂ کار سمجھ گیا ہوں۔ پہلے نئے شکاروں سے ٹینڈر رولایا جاتا ہے اور ان کو خوب لوٹا جاتا ہے، پھر ٹینڈر کو ایک مجوزہ پلین کے مطابق قبول کر لیا جاتا ہے۔ ٹرالر کے کیچ کی نیلام پر ایک ہزار سے زیادہ بولی نہیں دی جاتی اور بیچارہ ٹھیکیدار یہ جانتے ہوئے کہ وہ مارکیٹ میں مال کو کھپا نہیں سکتا، آخر مال کو اسی قیمت پر فروخت کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس طرح ٹھیکیدار بیچارے کا بالکل پلستر ہو جاتا ہے اور یہ لوگ سارا فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ یہ محمد اشرفی، مولوی عبدالحنان اور فشریز کا ہیڈ کلرک سب اس انجمن کے ممبر ہیں۔ حقیقتاً یہ لوگ اس ریکٹ کو ایک باقاعدہ بزنس فرم کی لائینز پر چلا رہے ہیں۔ تم اخباروں کے دو تین ایڈیٹروں کو جانتے ہو، اس ریکٹ کے خلاف اس میں لکھو۔ ان کو ایکسپوز کرو۔''

''مگر ڈپٹی سیکرٹری تعلیم و تربیت حیوانات؟''

''وہ بھی اِن لوگوں میں شامل ہے۔ وہ شکار پھانستا ہے۔ دیکھو بختیار، کتنا بڑا ریکٹ ہے۔''

چچا عبدالباقی اور میں بیٹھے اس سینڈیکیٹ کے ممبروں کی کمینگی اور ذلالت پر گرم بحث کر رہے تھے کہ نیچے سے کچھ شور سنائی دیا۔

تھوڑی دیر بعد چچا کے لڑکے عبدالرحمن نے آ کر ہمیں بتایا کہ دو پولیس مین اور بہت سے آدمی نیچے ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔

''اُن سے کہو، میں گھر پر نہیں ہوں۔'' چچا عبدالباقی نے غسل خانے کا رُخ کرتے ہوئے کہا۔

''میں نے اُن سے کہہ دیا ہے کہ آپ گھر پر ہیں۔''

''کتنی دفعہ عبدالرحمن میں نے تم کو سمجھایا ہے۔۔۔ اچھا ان کو اوپر بلا لاؤ۔''

''میں نیچے نہیں جاؤں گا۔'' چچا عبدالباقی اس نازک موقع پر بھی وقار اور سرد جرأت کا نمونہ تھا۔

ایک دھاری دار ریشمی سوٹ میں ایک موٹا سا آدمی اپنے ساتھ پولیس مین لئے اوپر آیا۔

''آیئے صاحبان، تشریف رکھئے۔'' چچا عبدالباقی نے کہا ''سنایئے، کیسے آنا ہوا۔۔۔ بختیار، انہیں سگریٹ پیش کرو!''

''نہیں، میں بیٹھوں گا نہیں۔'' نو وارد نے روکھے پن سے کہا ''میں ہیلتھ آفیسر ہوں، محلے والوں نے آ کے مجھ سے درخواست کی ہے کہ آپ نے یہاں مچھلی اسٹاک کی ہے، جس کی سرانڈ کی وجہ سے ان کی صحت خطرہ میں ہے۔ بڑی سرانڈ smell ہے۔''

''مجھے تو نہیں آ رہی۔'' چچا عبدالباقی نے کہا ''کیوں بختیار! تمھیں آ رہی ہے؟''

''آپ یہاں میونسپل قواعد کے مطابق مچھلی اسٹاک نہیں کر سکتے۔ یہ کوئی مارکیٹ نہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ مجھے یہ گلتی سڑتی مچھلی فوراً یہاں سے اُٹھوا کر دور پھینکوانا پڑے گا۔ اس کا سارا خرچہ بھی آپ کو دینا ہوگا اور میونسپل کمیٹی شہریوں کی صحت کو خطرے میں ڈالنے کی بناء پر آپ کے خلاف مقدمہ دائر کرے گی۔''

''سنو۔۔۔'' چچا عبدالباقی نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا ''یہ ڈیموکریسی ہے کہ ایک شخص اپنے گھر میں مچھلی بھی اسٹاک نہیں کر سکتا۔''

چچا اور میں بالکونی سے میونسپل کمیٹی کے آدمیوں کو چھکڑوں میں مچھلی کے بورے لادتے ہوئے دیکھتے رہے۔ ہمارا دل خون کے آنسو رو رہا تھا مگر بے بس تھے۔ پانچ چھ پولیس مین بھی ڈیوٹی پر موجود تھے۔ ظاہراً یہ مچھلی پھینکوانے کے لئے جا رہی تھی۔ بعد میں ہمیں پتہ چلا کہ کئی بورے مارکیٹ میں فروخت ہوئے۔

یہ اس مچھلی کے قصے کا خاتمہ تھا لیکن یہاں ایک چھوٹے سے واقعہ کا ذکر کرنا نامناسب نہ ہوگا۔

اس کے چند دن بعد چچا عبدالباقی اور میں الفنسٹن سٹریٹ میں مٹر گشت کر رہے تھے۔ اچانک ہم نے سامنے سے محمد احسن اشرفی مع بچوں کی پوری فوج کی فوج کو آتے دیکھا۔ وہ ابھی کچھ دُور تھے۔ چچا نے میری بانہہ ٹھوہ کر کہا ''بختیار، ادھر آ جاؤ۔''

ہم ایک چھوٹی گلی میں ہو لئے۔ چچا نے یہاں ایک اسٹال سے دو درجن کچے انڈے خریدے۔ اس نے ایک درجن انڈے مجھے دے دیئے۔

جب اشرفی ''کنٹی جنٹ'' سامنے سڑک سے گزری تو ہم نے اُن کو نشانہ باندھ باندھ کر انڈے مارے۔ یقین ہے کہ وہ سب اپنے نشانوں پر لگے۔ دوسرے ہی لمحے میں اور چچا عبدالباقی گلی میں بھاگتے ہوئے پیراڈائز کے ہجوم میں مل جل گئے۔ پکچر کا نام ''موبی ڈک'' تھا۔ یہ ایک اچھی پکچر تھی۔

محمد خالد اختر ۲۳ رجنوری ۱۹۲۰ء کو اللہ آباد ضلع بہاولپور میں پیدا ہوئے۔ وہ پیشہ کے اعتبار سے الیکٹرونک انجینئر تھے۔ لکھنے کا آغاز اُنہوں نے اوائل عمری ہی سے کر دیا تھا۔ اُنہوں نے نثر کے بیشتر میدانوں میں طبع آزمائی کی اور اپنا لوہا منوایا۔ ناول نگاری، افسانہ نگاری، سفرنگاری، مزاح نگاری، سوانح نگاری سب پر طبع آزمائی کی اور خاصی کامیابی سے کی۔ اُن کا مزاح خاصا شستہ اور جاندار ہے۔ وہ مشہور مزاحیہ کردار چچا عبدالباقی کے کردار کے خالق تھے، اس ضمن میں اُنہوں نے بہت سی کہانیاں لکھی ہیں۔ اُن کی تصانیف میں بیس سو گیارہ (ناول)، چاکیوڑہ میں وصال (ناول)، کھویا ہوا افق (افسانے)، چچا عبدالباقی (مزاحیہ افسانے)، یاترا (سفر نامہ)، ابن جبیر کا سفر (سفر نامہ)، دو سفر (سفر نامے) وغیرہ شامل ہیں۔ ۲ رفروری ۲۰۰۲ء کو کراچی میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

سیّد عارف مصطفیٰ

آم ہیں تو ٹھاٹھ ہیں

جو کوئی تمیز سے آم کھا سکتا ہے، اس سے یقیناً ڈرنا چاہیئے کیونکہ اِس قدر منظم شخص تو کچھ بھی کرسکتا ہے۔۔۔ خود کو معتدل و غیر موذی ثابت کرنے کے لیئے یہ بات ہمارے دوست خواجہ نے ایک بار اس وقت کہی تھی کہ جب وہ تازہ تازہ دریائے آم سے تیر کے پار اترے تھے اور اس کی موجوں میں سے ایک لہر اُن کی مونچھوں پہ ٹھہری ہوئی تھی۔ وہ جب بھی آموں کے مورچہ سے پلٹتے ہیں تو کافی دیر یہ کنفیوژن رہتا ہے آیا انہوں نے آم کھائے ہیں یا آموں نے انہیں کھایا ہے کیونکہ اِس گھمسان کے آثار پوری طرح اُن کی مونچھوں اور چہرے ٹھوڑی پہ ہویدا رہتے ہیں۔۔۔

یوں کہہ لیجئے کہ ایسا لگتا ہے، جیسے اُنھوں نے آم نہیں کھائے بلکہ آموں کا رد الفساد کیا ہے۔ اُن کے اس مقولے کی وجہ سے اب بہت سے ایسے لوگ اپنے آپ کو سادہ و بے ضرر ثابت کرسکتے ہیں کہ جو طبعی طور پہ تمیز سے آم نہیں کھا سکتے۔

خواجہ صاحب کا کہنا یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو بیک وقت دونوں ہاتھوں سے کھائی جاتی ہے وہاں قاعدوں قرینوں کا کیا کام۔۔۔ اور آم کی بابت تو اُن کا فرمانِ زرّیں یہ ہے کہ "کوئی یا تو آم کھالے یا تمیز کرلے۔" اُن کے خیال میں "آم تمیز سے کھائے تو جاسکتے ہیں لیکن پھر ان میں ذائقہ بھی نہیں رہتا۔" اُن کے اِسی فرمان کے بعد سے تو اب کئی یاروں کو تو گویا بدتمیزی کا کھلا لائسنس سا مل گیا ہے اور اب وہ ذرا کھل کھلا کے آموں کے بھرے تھال کے ساتھ وہ کچھ کرتے ہیں کہ جو کوئی سستا سا ویلن کسی فلم میں مہنگی سی ہیروئن کے ساتھ کرتا ہے کہ جسے اُس کی آبرو کے بکھیڑوں کو جلد سے جلد نپٹانے کا فریضہ سونپا گیا ہوتا ہے۔ یاروں کی جس محفل میں کہیں آم کٹنے کی اطلاع پائیں تو یہ متاثرین آم، ہری مکھی سے بھی جلد جائے وقوعہ پہ پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔

لیکن وہ بھی کیا کریں، آم کے بارے میں بلاخوف تردید یہ

بات کہی جاسکتی ہے کہ آموں کے موسم میں عام آدمی کے لیئے کرنے کے اہم کام بس دو ہی ہیں آم کھائے یا آم کھانے کے انتظار میں رہے اور یا پھر فالتو وقت میں پالتو محبوب کو انبوا کی ڈالیوں پہ جھلنا جھلایا جائے۔ صرف انبوا کی ڈالیوں ہی پہ کیوں، تو صاف ظاہر ہے کہ جب اس کی ڈالیوں پہ جھلنا جھلایا جائے گا تو جذبات سے لبریز عاشق زار کے جذباتی جھونٹوں کے جھٹکوں کی بدولت بہت سارے پکے آم اس محبوبہ کی جھولی میں بیٹھے بٹھائے ہی آن گریں گے اور گود بھرائی مکمل ہوتے ہی محبوبہ کو آم سمیٹ کر یہ جا وہ جا ہونے میں دیر نہیں لگائے گی اور پھر روایتی طور پہ محبوب کے نصیب میں آم اور اس کے پاپڑ آتے ہیں جبکہ نامراد عاشق کے حصے میں باغ کا مالی اور اس کے جھانپڑ آتے ہیں۔

آم کی فضیلت کا کیا بیان کریں، یہ سائنسی طور پہ جو بھی ہو لیکن اس کی بابت یہ جان لینا بھی نہایت ضروری ہے کے یہی وہ پھل ہے کہ جس کے طبی فوائد کے بارے میں حکماء وفضلا عموماً اس سے دوگنا چوگنا بتا دیتے ہیں جتنا کہ خود انہیں معلوم ہوتا ہے اور اسی وجہ سے ان کے پاس علاج کے لیئے زیادہ تر وہی سعادت مند مریض آتے ہیں جنھوں نے حکیم صاحب کی ہدایت پہ اور اُن کے دست شفاء کے آسرے پہ تابڑ توڑ آم کھا کے لگاتار دستوں کی مسلسل جزاء پائی ہوتی ہے اور پھر وہ جیسے تیسے مطب پہنچ کے پیٹ پکڑ کے دائیں بائیں دیکھ کے سرسراتی آواز اور سرگوشیانہ انداز میں اس سیزن میں آموں کی پانی پت کے گھمسان میں میں اپنی ذاتی فتوحات کی داستان بیان کر رہے ہوتے ہیں، لیکن اس کے برعکس اکثر ایلوپیتھک ڈاکٹروں کا رویہ بہت ہشیاری پہ مبنی ہوتا ہے اور وہ آموں کے خواص کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتاتے، شاید نہیں بلکہ یقیناً اس لیئے کہ اگر وہ جانتے بوجھتے بھی آم کی خاصیتیں پوری طرح بیان کردیں تو پھر سننے والے پورا سیزن بس آم سے ہی طاقت پائیں گے اور اُن کے طاقت کے سیرپ مریضوں کی راہ تکتے تکتے اپنی طاقت اور وہ خود کئی مریض کھو بیٹھیں گے۔ کاش یہ ڈاکٹر اس راز سے وقف ہوتے کے اکثر حکیموں کے بڑے بڑے مالیاتی مسائل آموں کے موسم میں یا حکیموں کے نزدیک طویل دستوں کے سیزن میں خوش اسلوبی سے حل ہو پاتے ہیں اور اس سیزن کے لدتے ہی کوئی حکیم اپنا کوٹھا پکا کراتا دیکھا جاتا ہے تو کوئی اپنی دختر نیک اختر کو سرخ جوڑے میں بابل کی دعائیں لیتی جاسنا رہا ہوتا ہے۔ محض آم کے بل پہ حاصل ہونے والی اتنی بڑی بڑی خوشیوں کو مدنظر رکھ کے آم کی طاقت سے بھلا کیسے انکار کیا جاسکتا ہے۔

آموں کی طاقت صرف حکماء ہی نہیں، ادب پہ بھی اثر انداز ہوئی ہے، بالخصوص شاعروں کے اعصاب پہ تو آم ہی چھایا ہوا ہے اور اسی اعصاب زدگی نے آم کو پھلوں کا بادشاہ بنایا ہے۔ اختر شیرانی ہوں کہ عباس تابش یا حفیظ جالندھری ہوں کہ اختر الایمان،

پچھلے دنوں ہمیں ایک رجسٹری موصول ہوئی، کھول کر دیکھا تو اس میں سے ایک ولیمے کا اشتہار برآمد ہوا جس کا مضمون کچھ یوں تھا۔

''بچوں، بوڑھوں اور نوجوانوں کو اطلاع دی جاتی ہے کہ مورخہ ۴ نومبر ۱۹۸۹ء بروز ہفتہ بمقام اکھاڑہ ہیر غازی شہید ایک عظیم الشان ولیمہ دنگل ہوگا، جو خواتین و حضرات بوٹیوں پر جھپٹنے، پلٹنے اور پلٹ کر جھپٹنے میں ید طولیٰ رکھتے ہوں اُن کی شرکت ہمارے لئے باعث کروڑ مسرت ہوگی۔ ولیمہ دنگل میں شمولیت کے لئے عمر اور وقت کی کوئی قید نہیں۔ اس دنگل میں گوجرانوالہ، سیالکوٹ، وزیر آباد، قصور اور شکر گڑھ کی روسٹ مرغی کھانے والی، ثابت کوفتے نگلنے والی، بکرے کی ران ہڑپ کرنے والی، دہی کے کونڈے اور پانی کے ڈرم پینے والی مشہور و معروف ٹیمیں حصہ لے رہی ہیں۔''

نیز اس دنگل میں چھوٹے چھوٹے مقابلے بھی ہوں گے جو شوربہ پینے والوں، زردہ اور چٹنی سلاد کھانے والوں کے درمیان ہوں گے۔ ولیمہ دنگل کے سرپرست اعلیٰ ''جی بھر چکا'' صاحب اور ریفری جناب دولہا صاحب عرف چپ شاہ ہوں گے۔''

مزاج بخیر از تنویر حسین

سب کے سب پیڑوں پہ بور آنے سے لے کر کوئل کے کوکنے اور پپیہے کی چہکار تک ہر جگہ آموں کے بوجھ تلے دبے نظر آتے ہیں یادوں کے سب موسم اور ہجر کے سارے دُکھ اِسی پھل کے تذکرے کے ساتھ جوڑے گئے ہیں تاہم عجیب بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنے کلام میں کہیں بھی کسی جگہ آموں کو محبوب سے تشبیہ کے لیئے استعمال نہیں کیا، حالانکہ یہاں ہر حلیئے اور جسامت کی تشبیہ کے لیئے آم کی کوئی نہ کوئی قسم دستیاب ہے۔ چھوٹی موٹی سی گول مٹول محبوبہ کو انور رٹول اور فجری سے ملایا جاسکتا ہے، درمیانی سی جسامت والی کو سرولی سا کہنے میں بھی کوئی حرج نہیں ،اگر محبوب سرو قامت ہے تو سندھڑی سا بتانا عین درست ہے، مناسب صحت ہو تو چونسہ بھی قرار دیا جاسکتا ہے، تاہم چند دیگر اقسام کی بابت کچھ مسائل بلکہ رزائل بھی درپیش ہو سکتے ہیں کیونکہ بہت فربہ و ضخیم محبوبہ کو بیگن پھلی سا ٹھہرایا جانا رسک سے خالی نہیں اور کرلاتی و پھدکتی و اچھلتی سی چال والی نازنین کو لنگڑے آم سے تشبیہ دینے کے بعد خود کو لنگڑا ہونے سے بچا پانا ہرگز یقینی نہیں۔

یہ بھی تحقیق سے ثابت ہے کہ آم کے علاوہ چند شعراء کے یہاں البتہ سیب کا ذکر بھی ملتا ہے کہ جسے محبوب کے گالوں کی تشبیہ کے لیئے استعمال کیا گیا ہے لیکن یہ اُن وقتوں کی بات تھی کہ جب سیبوں کو سینت کے رکھنے کے لیئے کولڈ اسٹوریج نہیں ہوا کرتے تھے۔۔۔ ورنہ کولڈ اسٹوریج کے جو سیب فروخت کے لیئے عام طور پہ دستیاب رہتے ہیں انہیں دیکھتے ہوئے ایسے گالوں والی محبوبہ کے لیئے تصور میں جانی کے بجائے صرف نانی کا شفیق چہرہ ہی ابھرتا ہے۔ باقی رہے دیگر پھل جیسا کہ کیلے ناشپاتی اور آڑو وغیرہ تو اُن کی طبعی شکل ہی ایسی ہے کہ خوف فسادِ محبوب سے اُن کا تشبیہی استعمال بدرجہ حرام گمان کیا جاتا ہے۔

ہمارے خیالی صاحب اپنے ایام جوانی میں آم سے ویسے ہی دور رہا کرتے تھے جیسے اہل تقویٰ کبائر سے، لیکن پھر جیسے ہی انہیں غالب کے حوالے سے اس مشہور لطیفے سے آگہی ہوئی کہ گدھا آم نہیں کھاتا، تب سے وہ سیزن میں آم کی دو چار پھانکیں چوڑ لیا کرتے ہیں۔ کسی کے گدھا ہونے کی سند غالب دیتا ہو تو دانشوری کی آبرو بچانے کے لیئے بہتر راہ یہی ہے کہ بس چپ چاپ ہر سیزن میں چند گواہوں کی موجودگی میں دو چار آم کھا ہی لیئے جائیں لیکن اس کے باوجود کئی اب بھی ایسے ہیں جو آم نہیں کھاتے لیکن پھر بھی چار ٹانگوں پہ نہیں صرف دو ٹانگوں ہی پہ چلتے نظر آتے ہیں لیکن ہم تو ایسوں میں نہیں بلکہ ویسوں میں ہیں کہ جیسے ہمارے دوھیالی اکبر الہٰ آبادی تھے اور یوں بارے جن کے سامنے اگر کہیں ذرا آم کا ذکر بھی ہو جائے تو آن کی آن منہ میں پانی بھر جاتا ہے اور آنکھوں کا پانی یکدم مر جاتا ہے اور اسی مشترکہ آمیانہ خصلت کے باعث ہم بھی اکبر الہٰ آبادی کے الفاظ میں یہ کہنے پہ مجبور ہیں کہ۔

نہ کوئی آپ یار کا پیغام بھیجئے
اِس فصل میں جو بھیجئے بس آم بھیجئے
ایسا ضرور ہو کہ انہیں رکھ کے کھا سکوں
پختہ اگرچہ بیس تو دس خام بھیجئے
معلوم ہی ہے آپ کو بندے کا ایڈریس
سیدھے الہ آباد مرے نام بھیجئے
ایسا نہ ہو کہ آپ یہ لکھیں جواب میں
تعمیل ہوگی پہلے مگر دام بھیجئے

سید عارف مصطفٰی کا تعلق کراچی سے ہے۔ موصوف سیاسی تجزیہ کار اور ایک درد دل رکھنے والے بلاگر ہیں۔ خاصی دبنگ شخصیت کے مالک ہیں اور سچ کہنے اور لکھنے میں کسی قسم کے لحاظ کے قائل نہیں۔ ایک بہت اچھے انشاء پرداز ہیں اور فکاہی اندازِ بیان کی وجہ سے خاصے مقبول ہیں۔ اُردو کو پاکستان کی سرکاری زبان بنانے کی تحریک میں اِن کی مساعی جمیلہ کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ اُردو طنز و مزاح کے فروغ میں بھی اِن کا خاصا ہاتھ ہے، کراچی جیسے آلام زدہ شہر میں فکاہی مجالس برپا کرنا انہیں کا کام ہے۔ ارمغانِ ابتسام کے لیے مستقل لکھنے والوں میں شامل ہیں۔

عائشہ تنویر

زبان یارِ من ترکی

ریسرچز کہتی ہیں، بچپن میں انسان میں زیادہ زبانیں سیکھنے کی اہلیت ہوتی ہے۔ جتنی زیادہ زبانیں بچے سیکھتے ہیں، اس سے ان کی ذہانت میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ آئندہ زندگی میں زیادہ کامیاب ہوتے ہیں۔

اب ریسرچ کہتی ہے تو بالکل درست کہتی ہوگی۔ شاید اسی لیے ہمارے خطے کے لوگ اتنے ذہین و فطین ہیں کہ نہ چاہتے ہوئے بھی ان کا دو، چار زبانوں سے تعلق تو رہتا ہے لیکن ریسرچز یہ نہیں بتاتیں کہ بچے اگر ہم جیسے تھوڑے کم ذہین ہوں (اب اپنے لیے کند ذہن کا لفظ استعمال کرنا تو اچھا نہیں لگتا ناں) تو یہ زیادہ زبانیں سکھانے کی کوشش ان کے ننھے منے ذہن کا بیڑا غرق کر دیتی ہیں۔

بات سمجھانے کے لیے ہم آپ کو اپنی خاندانی تاریخ سے آگاہ کرتے ہیں۔

ہمارے دادا جان تقسیم کے وقت انڈین پنجاب میں مقیم تھے۔ اب چاہیے تو یہ تھا کہ ہجرت کرتے اور پاکستانی پنجاب میں آ کر سکون لیتے لیکن اللہ جانے ان پر ہجرت میں کتنے مصائب بیتے کہ وہ انڈیا سے نکلے تو صوبہ سندھ میں آ کر دم لیا۔

دادا، دادی کے ساتھ ان کی واحد متاع ہمارے والد تھے۔ باقی آبادی انہوں نے پاکستان کے مفاد میں یہاں آ کر بڑھائی اور چونکہ اس وقت "بچے دو ہی اچھے" کا مقولہ نہیں تھا سو ان کے اچھے،

برے کافی بچے ہو گئے۔

اب ہمارے دادا، دادی پر سے اپنا پنجابی رنگ اُتر تا نہ تھا اور باقی پھپو، چچا تو سندھ کی پیداوار تھے سو ان پر سندھ کی چھاپ نمایاں تھی۔ وقت کی ضرورت کے پیشِ نظر ہمارے پورے دڈھیال نے بیک وقت پنجابی اور سندھی زبان پر قدرت حاصل کرلی۔

اب ہجرت تو ہمارے والد صاحب کی گھٹی میں ہی تھی سو تعلیم حاصل کرنے کے شوق میں یہاں وہاں پھرتے وہ کراچی آ گئے۔

کراچی سیلف میڈ لوگوں کا شہر ہے، محنت کرنے والوں کے لیے یہاں مواقع کی کمی نہیں۔ ہمارے والد نے محنت کی، اپنا مقام بنایا اور اپنے والدین اور بہن بھائیوں کو بھی کراچی بلوا لیا لیکن یہاں آ کر ایک نئی مشکل کا سامنا پڑ گیا۔

کراچی میں مختلف قوموں کے لوگ آباد ہیں جو گھروں میں اپنی مادری زبان اور آپس میں رابطے کے لیے اردو زبان استعمال کرتے ہیں۔

سو اُردو سیکھنا سب کے لیے لازم ٹھہرا۔

اب ہمارے دادا، دادی پنجابی میں اردو کا تڑکہ لگاتے تو چچا، پھپو سندھی لہجے میں پنجابی اور پنجابی لہجے میں اردو، سندھی بولنا بھی سیکھ گئے۔

یہاں سے شروع ہوئی ہماری داستانِ غم، ہم جو اتنے باکمال نہ تھے کہ بیک وقت اتنی زبانوں پر دسترس حاصل کرتے۔

ہماری والدہ کراچی کی پیدائش، سو ہمارے والدین گھر میں ہم سے اردو میں بات کرتے۔ دادا، دادی پنجابی بولتے اور اسکول میں سندھی اور انگریزی بھی ہمارے نصاب کا حصہ تھیں۔

ہم گھر میں پنجابی بولنا چاہتے تو سب مذاق اڑاتے کہ کیا اردو لہجے میں ٹوٹی پھوٹی پنجابی ہے۔ اس سے بہتر اردو میں بات کرلو۔

باہر والوں کو لگتا کہ ہم پنجابی لہجے میں اردو بولتے ہیں اور ہم بس وہ دیوار ڈھونڈتے جس سے ٹکر ماریں۔

ہمیں یاد ہے، بچپن میں ایک دفعہ دادا جان نے ہم سے کہا ''اندروں مینوں سرہانہ لا دے!''

اب ہمارے ننھے ذہن نے پورے جملے کا ترجمہ کرلیا ''اندر سے مجھے سرہانہ لا دو۔''

لیکن یہ سرہانہ کیا بلا ہوتی ہے، ہم اس سے ناواقف تھے۔ بچپن کے دن تھے، میرے بھی کوئی جان پہچان نہ تھی ورنہ ان سے ہی مدد لیتے۔

سرہانے میؔر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

یہاں ہم بتادیں کہ سرہانے کا پنجابی تلفظ اردو کے لفظ ''سرانہ'' سے ملتا جلتا ہے لیکن اس زمانے میں تو ہم سرانہ اور سرہانے دونوں سے لاعلم تھے۔ سو اندر کمرے میں گئے، آئے، گئے، آئے اور ایسے کتنے ہی چکر لگا ڈالے لیکن سمجھ نہ آیا کہ کیا چیز دادا کو پیش کریں اور ہماری کیٹ واک دیکھ کر ہمارے دادا نے غصے میں اردو کا تڑکہ چھوڑا اور خالص پنجابی میں جو کچھ ہمیں کہا، ہمیں اس کا ایک لفظ سمجھ نہ آیا بس لہجے کی گھن گرج سے پتہ چلا کہ خاصی بے عزتی ہوگئی ہے۔

جہاں تک بات میر کی ہے تو میؔر کا اسلوب، بہت سادہ ہے، یہ ہم نہیں کہتے، ہمارے نوٹس کہتے ہیں لیکن جب ہم نے پہلی بار پڑھا۔

دور بہت بھاگو ہو ہم سے، سیکھ طریق غزالوں کا
وحشت کرنا شیوہ ٹھہرا، اچھی آنکھوں والوں کا

تو ہم کتنی ہی دیر ''غزالوں'' کے معنی میں الجھے رہے۔ اب ظاہر ہے میؔر، غزالہ آنٹی کی بات تو کر نہیں رہے تو آخر اتنی ساری غزالوں کون۔ بہت سوچ بچار کے بعد آخر ہم اس نتیجے پر پہنچے جیسے حسین لڑکیوں کو نازنین، دلنشین، دلربا کہہ دیا جاتا ہے تو غزالوں بھی ان کے ہی لیے ہے۔ تب ہی تو میؔر نے اچھی آنکھوں کی بات کی لیکن غزالوں کی بنیاد جنگل میں ہرن سے جا ملے گی یہ تو ہمارے ذہن کے آخری گوشے میں بھی نہ تھا۔

اردو کا ایک اور کرشمہ بھی آپ کو بتاتے چلیں، بچپن میں ایک

کوئی ہمارے گھر چلا آئے تو چچی فوراً اُٹھ کر پاس جا بیٹھے گی۔ اخلاق اور خلوص ختم ہے اس پر۔ پھر یہ بتانا شروع کر دے گی کہ پڑوسن نے کیا پکایا ہے۔ اس کے میاں کو دہی بڑوں سے کیوں رغبت ہے اور دہی بڑوں میں کس مقدار میں ہونا چاہیے اور بڑے کس مقدار میں۔ دہی بڑے کھانے سے کون سی بیماری لاحق ہو جاتی ہے اور اس کے اپنے بھتیجے کو افسانہ نویسی کی شکایت ہے اور افسانہ اسے کہتے ہیں جس کا نہ منہ نہ سر، البتہ سر میں درد ضرور پیدا کر دے، یعنی کسی خاتون کو عام چیزوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا ہو تو وہ صرف ایک چاچی کے پاس آ بیٹھے۔

غبارے از ممتاز مفتی

بار ہمارے بھائی نے بچوں کی کہانی پڑھتے سوال کیا'' آپی یہ بلونگرا کیا ہوتا ہے؟''

''بلونگرا؟'' ہم نے بے توجہی سے دہرایا ''بلونگر ہوگا کسی جگہ کا نام!!''

''نہیں، نہیں یہ بلونگرا ہی ہے۔''

اس کے اصرار پر مجبوراً ہم نے کہانی پر نظر دوڑائی اور لوٹ، پوٹ ہوگئے۔ وہاں بلونگڑہ لکھا تھا۔

بہر حال پنجابی سیکھنے میں ناکامی کے بعد ہم نے اپنی توجہ سندھی کی طرف مبذول کی لیکن اللہ معاف کرے سندھی کے چھپن حروف تہجی اور ان پر جا بجا نقطے۔

سندھی حروف تہجی یاد کرنے میں ہی ہمیں نانی کی نانی یاد آ گئیں۔

اب امتحان تو دینا تھا سو سندھی لکھنے کا طریقہ ہم نے یہ نکالا کہ گھر سے سیکھی گئی پنجابی اور سندھی کا آمیزہ بنا کر اردو حروف تہجی کو سندھی انداز میں لکھتے اور آخر میں پورے پیراگراف کو اوپر نیچے نقطوں سے سجا دیتے۔

اس زمانے میں پی ٹی وی پر سندھی خبریں، ڈرامے اور بچوں کے پروگرام بھی آیا کرتے تھے۔ سو ہم نے سندھی سیکھنے کے لیے ٹی وی کا سہارا لیا، سندھی لکھنے میں تو ہم کامیاب نہ ہو سکے لیکن اداکاروں کے تاثرات سے ڈرامہ سمجھ لیتے۔ اپنی یہ سندھی مہارت

جب ہم نے اپنی سندھی زبان بولنے والی سہیلی پر آزمائی تو اس کا سندھی لہجہ سن کر منہ کی کھائی۔ ہماری محنت تو کامیاب تھی لیکن شاید اس کے تاثرات درست نہ تھے۔

آج کل ہماری سندھی ''تھنجو نالو چا آھی؟''۔۔۔ ''مھنجو پولڑو آھی!'' تک محدود ہے۔

جس طرح ہم نے زمانہ طالب علمی میں سندھی پڑھی، ہمارے والد صاحب نے فارسی پڑھی تھی۔ خود اردو میں بھی فارسی کے بے شمار الفاظ شامل ہیں سو فارسی سے شد بد حاصل کرنے کے لیے ہم اکثر ابو سے فارسی محاورات کے معنی پوچھا کرتے۔

جواب جاہلاں، باشد خاموشی ۔۔۔ تو ہم نے منہ توڑ جواب دینے کے لیے یاد کیا ہوا تھا۔

اس کے علاوہ ہمارا پسندیدہ تھا۔ خرباش، برادر خورد مباش۔

ہمارے حال پر پورا اترتا تو آپ کو بھی آتا ہوگا۔

زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم

فارسی کے بعد باری آئی عربی کی۔ جو اردو کے آباء میں سے تو ہے ہی اور مقدس قرآن کریم کی زبان ہے سو مدرسے میں پڑھتے ہی تھے۔

عربی سے ہماری اتنی ہی واقفیت تھی جتنی کرنل اشفاق حسین کو انٹرنیشنل لینگویج اسکول میں ایڈمیشن لینے سے پہلے تھی۔ یعنی چند سورتیں اور کلمات کے معنی رٹنے تک اور ناظرہ پڑھنے تک۔

(بحوالہ جنٹلمین اللہ اللہ، تصنیف کرنل اشفاق حسین)

بچپن سے ہم نے تمام تعلیم سرکاری اداروں میں ہی حاصل کی تو انگریزی نے ہمیں اتنا پریشان نہیں کیا۔

بس یہ تھا کہ ہم انگریزی کو ایسا مضمون سمجھتے جو بالخصوص ہماری پرسنٹیج (فیصد نمبر) گرانے کے لیے ہی بنایا گیا ہے۔

انٹر تک اردو میڈیم میں پڑھنے کے بعد ہم کراچی یونیورسٹی کے درشن کرنے پہنچے۔ معلوم ہوا یہاں تدریسی زبان انگریزی ہے۔

انگریزی سمجھنا ہمارا مسئلہ نہیں تھا لیکن ہم ایسی انگریزی لکھیں جو دوسرے بھی سمجھ جائیں یہ معرکے سے کم نہیں تھا۔

ہماری کیمیا کی لیب ٹیچر نے پریکٹیکل کروا کے جرنل لکھ کر چیک کروانے کو کہا تو ہمارے ہاتھوں کے توتے، چڑیا، مینا سب اڑ گئے۔ پریکٹیکل جرنل میں اپنی گلابی انگریزی تحریر کر کے ہم نے میڈم کے حوالے کی۔

میڈم نے ایک نظر جرنل پر اور دوسری ہم پر دوڑائی۔

''دیکھو بیٹا! آپ نے لکھا Caught test tube with test tube holder اب کیچ کا مطلب تو ہوا کسی چیز کو اچھال کر پکڑنا۔ سو آئندہ ٹیسٹ ٹیوب جیسی نازک چیزوں کے ساتھ یہ کرتب مت کیجیے گا اور یہاں hold کا لفظ استعمال کر لیجیے گا۔''

مسکراتے لہجے میں، مدھم آواز کے ساتھ ایسی ٹھنڈی بے عزتی کہ ہمیں پسینے آ گئے۔ مقام شکر تھا کہ یہ گفتگو صرف ہم دونوں تک محدود تھی اور اس سے حظ اٹھانے کے لیے کوئی قرب و جوار میں موجود نہ تھا۔

دھیرے سے ''سوری'' اور ''جی اچھا'' جیسے چند الفاظ بول کر ہم پلٹے تو بھی میڈم کی مسکراتی نگاہیں خود پر جمی محسوس ہو رہی تھیں۔

وہ دن اور آج کا دن ہم نے تمام زبانیں چھوڑ کر تہیہ کر لیا کہ صرف اردو سیکھیں گے، آخر یہی ہماری قومی زبان ہے۔

آج کل ہم لغت لے کر یہ ڈھونڈتے پھر رہے ہیں کہ ہجوم میں جو دھرنے کی جگہ نہیں ملتی وہ تِل ہے یا تَل۔ آپ کو معلوم ہو تو ضرور بتایئے گا۔

عائشہ تنویر صاحبہ کا تعلق کراچی سے ہے۔ محترمہ نے ریاضی میں ایم ایس سی کیا ہوا ہے۔ میدان ادب میں نووارد ہیں لیکن اندازِ بیان کی پختگی اور لب و لہجے کی چلبلاہٹ اور بیساختگی سے اُن کے ذکاہی معیار کا پتہ چلتا ہے۔ طنز و مزاح، بچوں کی کہانیاں اور سماجی و معاشرتی موضوعات کو تختۂ مشق بنایا ہے۔ مختلف خواتین کے جرائد کے لیے لکھتی ہیں۔ ''ارمغان ابتسام'' کے لیے مستقل لکھنے والوں میں شامل ہیں۔

ٹوتھ برش نامہ

حماد احمد

کہتے ہیں کہ دنیا بھر کے ریسرچرز ایک جگہ پر یہ جاننے کے لئے اکٹھے ہوئے کہ ٹوتھ برش کس ملک کی ایجاد ہے؟۔طویل ترین نشست کے بعد سب نے متفقہ فیصلہ کیا کہ ٹوتھ برش پاکستان میں ایجاد ہوا۔مقامی میڈیا نے ریسرچرز سے اس کی وجہ پوچھی تو سب کا متفقہ جواب یہ تھا کہ ٹوتھ برش صرف ایک دانت کو نہیں بلکہ تمام دانتوں کو صاف کرتا ہے۔لہذا اگر یہ پاکستان کے علاوہ کہیں اور ایجاد ہوا ہوتا تو یقیناً ''ٹوتھ برش''Tooth Brush کی بجائے ''ٹیتھ برش'' Teeth Brush ہوتا۔

گرامر کے لحاظ سے ''ٹوتھ برش'' صرف اس وقت استعمال ہونا چاہئے جب کسی بچے کا صرف پہلا اور اکلوتا دانت باہر آ گیا ہو یا پھر اس وقت کہ جب کسی بوڑھے انسان کا صرف اور صرف ایک ہی دانت باقی رہ گیا ہو۔ باقی تمام مواقع پر ''ٹیتھ برش'' کا ہی استعمال ہوتا ہے۔

ایک مرتبہ ایک ٹوتھ برش اکیلا بیٹھا ''کتھارسز'' کر رہا تھا اور بدستور روتے ہوئے اپنے آپ سے کہہ رہا تھا کہ میرا کام دنیا میں سب سے بدترین ہے۔ پاس ہی موجود ٹائلٹ پیپر نے اس ٹوتھ برش کی افسردہ سی سرگوشیاں سنیں اور اسے تسلی دینے لگا کہ ''انسان'' کو ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کیا جانا چاہئے۔ ذرا پھر سے اپنے اور دوسروں کے کاموں کو سوچو اور پھر ''میرٹ'' پر کتھارسز کرو کہ کیا واقعی تمہارا کام ہی دنیا میں سب سے بدترین ہے؟

جیسے کئی مرتبہ خواتین بچ جانے والے سالن کو ''مشکل وقت میں کام آنے کے لئے'' فریزر میں رکھ دیتی ہیں، بالکل اسی طرح اکثر گھروں کے برش سٹینڈز میں ایک ایسا ''یتیم و مسکین'' برش بھی موجود ہوتا ہے جو کہ صرف مشکل وقت کے لئے ہی موجود ہوتا ہے۔آج تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ یتیم و مسکین برش ''مشترکہ مفادات'' یعنی سب کے لئے ہوتا ہے یا پھر اسے کسی ایک شخص نے اپنے لئے ہی ''سٹپنی'' کے طور پر رکھا ہوتا ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ کسی اور کا ٹوتھ برش استعمال کرنا بدترین حرکت ہے۔ دنیا بھر کے ہر پانچ میں سے چار ڈینٹسٹ یہی تجویز

کرتے ہیں کہ اپنا ٹوتھ برش کسی اور کو یوز نہ کرنے دیں۔ پانچویں ڈینٹسٹ کا اپنا ٹوتھ برش کوئی اور یوز کر لیتا ہے۔۔۔ ''شریف النفس'' لوگ اپنا برش کسی اور کو استعمال کرتا دیکھ لیں تو مرنے مارنے پر بھی تل جاتے ہیں۔ میں نے بذاتِ خود ایک ڈبی میں بند ٹوتھ برش کے اوپر واضح طور پر لکھا دیکھا ہے۔۔۔ یہ برش استعمال کر کے شکریے کا، سوری، ٹانگیں توڑنے کا موقع عنایت فرمائیں۔

بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔۔۔ تذکرہ ہو رہا تھا برش کے پاکستان میں ایجاد ہونے کا۔ کہتے ہیں کہ کسی چیز کو ایجاد کرنے والا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس چیز کو کس کس مقصد کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے؟۔ چونکہ ٹوتھ برش پاکستان میں ایجاد ہوا تو پاکستانی ہی بہتر سمجھتے ہیں کہ اسے کن کن مقاصد کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

دانتوں کی صفائی کر کر کے انسان ٹوتھ برش کی ہڈی پسلی ایک کر کے رکھ دیتا ہے۔ نوبت یہاں تک آ پہنچتی ہے کہ جب تک آپ اپنے پرانے برش کو نئے برش سے تبدیل نہ کر لیں، تب تک آپ کو اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ پرانا برش کس قدر ہیبت ناک شکل اختیار کر چکا ہے۔ لیکن فکر نہ کریں۔ اس ہیبت ناک برش سے بھی ابھی آپ نے درجنوں کام لینے ہیں۔

آیئے!۔۔ پاکستانیوں کی نظر سے دیکھتے ہیں کہ استعمال شدہ برش سے مزید کیا کیا کام لئے جا سکتے ہیں؟۔۔

۱۔ دیواروں پر کی گئی ''بچگانہ ڈیزائننگ'' کو ریمود کرنے کے لئے وہاں زور زور سے ٹوتھ برش کو رگڑ کے ''ڈیزائننگ کی شدت'' کو کم کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ کئی خواتین کے ناخن بلی کے ناخنوں سے بھی

ہوشیار باش!

(ایک لمرک)

میسر ہے جو تجھ کو گھاس تو بے خوف ہو کر چر
مگر ایسا نہ کر کہ پہنچ جائے نیب کے در پر
یہ ماٹو ہے کرپشن کا
بہت لالچ نہیں اچھا
یونہی سونے کے انڈے کے لئے مرغی ذبح نہ کر

نوید ظفر کیانی

ڈیڑھ گنا بڑے ہوتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے گھر میں نیل کٹر ہی دستیاب نہیں۔ ایسی خواتین اگر ناخن چھوٹے نہیں کرسکتیں تو اس کی بیرونی سطح کو ٹوتھ برش سے رگڑ کے چمکدار ضرور بنا سکتی ہیں اور ناخنوں کے کالے کالے کناروں کو بھی پرانے ٹوتھ برش کی مدد سے صاف کرسکتی ہیں۔

۳۔ سر کے بالوں پر کلر لگانے کے لئے یا مہندی کالیپ کرنے کے لئے بھی ٹوتھ برش کا استعمال فائدہ مند رہتا ہے

۴۔ جوتے کا نچلا حصہ جب زیادہ گندا ہو جائے اور وہاں مٹی پھنس جائے تو استعمال شدہ ٹوتھ برش کے ذریعے اسے بھی با آسانی صاف کیا جاسکتا ہے۔

۵۔ آپ کے کمپیوٹر یا لیپ ٹاپ کا کی بورڈ انتہائی حساس چیز ہوتا ہے۔ جیسے جیسے یہ گندا ہوتا جائے تو نہ صرف دیکھنے میں برا لگتا ہے بلکہ اس کے بٹن بھی سخت ہوتے چلے جاتے ہیں۔ کی بورڈ کی ظاہری صفائی بھی آپ ٹوتھ برش کے ذریعے کافی اچھی طرح کر سکتے ہیں۔

۶۔ بالوں کی کنگھی یا ہیئر برش کو بھی ٹوتھ برش کی مدد سے بھی بہترین صاف کیا جاسکتا ہے۔

۷۔ کئی لوگ بازار سے سبزی خرید کر دھوئے بغیر ہی ڈائریکٹ فریج میں رکھ دیتے ہیں تاکہ دھونے سے سبزی جلدی خراب نہ ہو۔ ایسے لوگ ٹوتھ برش کو سبزی پر رگڑ کے اس کی مٹی جھاڑنے کے لئے استعمال کرسکتے ہیں۔ اس طرح با آسانی سبزی "ڈرائی کلین" ہو جائے گی۔

۸۔ چھلی کا نام آپ نے شاید سنا ہی ہوگا جسے انگریزی میں "کارن" کہا جاتا ہے۔ جب اس کو چھیلیں تو اس کے دانوں کے درمیان بے ڈھنگے بال پھنسے بھی نظر آتے ہیں۔ ٹوتھ برش کو یہ بال کھینچنے کے لئے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔

۹۔ خواتین کو اپنی جیولری کے میلا کچیلا ہو جانے کی شکایات کرتے کئی بار دیکھا ہے۔ اپنی جیولری پر ٹوتھ برش کو رگڑیں تو اصل چمک لوٹ آئے گی۔

۱۰۔ گھر میں موجود قالین، کارپٹ کی کوئی جگہ خراب ہو جائے تو اسے صاف کرنے کے لئے بھی ٹوتھ برش فائدے مند ثابت ہوسکتا ہے۔

۱۱۔ کچن میں کئی بوتلیں، شیشیاں اور جار ایسے پڑے ہوتے ہیں، جن کے اندر انسان کا ہاتھ نہیں پہنچ پاتا۔ ان چیزوں کو اندر سے صاف کرنے کے لئے بھی ٹوتھ برش بہترین ثابت ہوسکتا ہے۔

۱۲۔ ٹوتھ برش کو آپ شلواروں میں نالے اور الاسٹک ڈالنے کے لئے بھی یوز کر سکتے ہیں۔

۱۳۔ اور سب سے آخر میں ٹوتھ برش کو تھوڑا سا گرم کر کے گھمائیں اور گول شیپ میں لے آئیں۔ نیا تیار شدہ خوبصورت سا بریسلیٹ پہنیں اور خوب شو ماریں۔

۱۴۔ اگر آخری کام کرنے پر دل نہ مانے تو اس برش کو "ریپیئرنگ اینڈ مینٹیننس" کے لئے کسی موچی کے پاس بھجوادیں۔ وہ اس میں نئے پلاسٹک دھاگے لگا کر آپ کے لئے دوبارہ قابل استعمال بنا دے گا۔

حماد احمد کا تعلق زندہ دلوں کے شہر لاہور سے ہے۔ موصوف بچپن ہی سے لکھنے لکھانے کا شوق رکھتے ہیں۔ بچوں کے معروف رسائل میں ان کے مضامین اور کہانیاں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ان کے مضامین زیادہ تر "مزاحیہ" ہوتے ہیں۔ معصومیت سے بھرپور شوخی، شرارت اور چلبلا پن ان کے مضامین کی خصوصیات ہیں۔ کئی ایک ویب سائٹس پر "معصوم بچہ" کے نام سے خاصے متحرک ہیں۔ "ارمغانِ ابتسام" کے مستقل لکھنے والوں میں شامل ہیں۔

محمد عاطف مرزا

زندگی خالق کائنات کی وہ نعمت ہے جسے بالعموم کائنات میں اور بالخصوص زمیں پر ہر جگہ پر اتارا گیا۔ بے آب و گیاہ ریگستانوں سے سرسبز و شاداب میدانوں تک، اونچے آسمان سے باتیں کرتے ہوئے پہاڑوں سے لے کر پاتال سے معانقہ کرتے ہوئے گہرے سمندروں میں زندگی کا وجود روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ جس کا یقین حرکت کی موجودگی سے کیا جاسکتا ہے۔ پڑا پڑا تو پتھر بھی بھاری ہو جاتا ہے۔ حضر پہ نظر اور سفر سے مفر کاہلی کی علامت ہے، ایک گھر میں رہنے والے باہر سے قطع تعلق کرلیں تو ان کی زندگی رک جاتی ہے۔ زندگی کو رواں دواں رکھنے کے لیے آوارہ گردی ضروری ہے۔ آوارہ گردی ذرا اسٹائل سے کی جائے تو یارانِ نیک نام اِسے سیاحت کا نام دے دیتے ہیں۔ سیاحت سفر کی وہ قسم ہے جس میں صعوبتوں سے بھی لطف اٹھایا جاتا ہے، یہ خالصتاً بے سکونی کی زندگی سے نکل کر کسی دور دراز علاقے میں جا کر بے سکون ہونے کا نام ہے۔ سیاحت اور آوارہ گردی میں شاید ہلکا سا فرق ہو مگر جب یہ دونوں ایک ہی شخص کی عادت کا درجہ حاصل کرلیں تو پھر کہاں کے سفر اور کون مقیم......!!؟؟

آوارہ گرد سیاح کبھی کسی ابن بطوطہ کے تعاقب میں نہیں نکلتے، وہ کبھی واسکوڈے گاما بھی بننا پسند نہیں کرتے کہ اُن کی 'غلطی' کی سزا تاریخی یا سیاسی طور پر حال اور مستقبل کی نسلوں پر عذاب کی صورت مسلط رہے۔ ہاں جہاں وہ جاتے ہیں وہاں کا پتا وہ جدی پشتی آوارہ گردوں کو ہی دیتے ہیں۔ اُن کے یقین کے مطابق کم ظرف سیاح اُس جنت نظیر مقام کی بے حُرمتی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ تارڑ صاحب اور بیشتر سیاحوں نے اپنے سفرناموں میں کچھ کم ظرف سیاحوں کی طرف سے کی جانے والی بے حرمتیوں کا ذکر بڑے رقت آمیز انداز میں کیا ہے۔ پاکستان کے کئی پُر فضا مقامات ایسے ہیں جن کے بارے میں بڑے جید سیاحوں نے یہ فیصلہ لکھا ہے کہ اُن مقامات کو انسانوں کی دسترس اور پہنچ سے دور اور محفوظ کر

دیا جائے، تاکہ آئندہ مشینی دور کی نسلوں کو ماضی کی خوب صورت یادوں کے نمونے کے طور پر دکھایا جاسکے۔ پاکستان کے علاوہ سری لنکا، نیپال، بنگلہ دیش، بھارت، تھائی لینڈ، ملائشیا، یونان، اٹلی، امریکہ، برطانیہ اور دوسرے ممالک میں کئی مقامات ایسے ہیں جہاں سیاحوں کے قدم راستوں سے پہلے پہنچے۔ سیاحوں کے تخلیق کردہ اِن راستوں پر اُن کے شاگرد اور مقلد بھی پہنچے۔ مگر کچھ مقامات پر انہی راہوں سے ہوتے ہوئے غلیظ جسموں اور مکروہ سوچوں والے سبز قدم پہنچے تو وہاں کی عفت اور حرمت ایسے پامال ہوئی جیسے کوئی شریف زادی جھوٹی محبت کے جال میں پھنس کر بے حال ہوئی۔

سیاحت کسی بھی ملک میں دولت، علم اور رواج لے کر داخل ہوتی ہے اور وہاں کے علاقوں اور لوگوں کے حسن اور حسنِ سلوک کے قصے لے کر واپسی کا رُخ کرتی ہے۔ سیاح کے لیے پیشے، مقام، قبیلے، ذات، تعلیم، مذہب، عہدے کی کوئی قید نہیں۔ ہاں یہ تمام چیزیں سیاحت کے انداز پر ضرور اثر انداز ہوتی ہیں۔ سیاح دنیا کا وہ شخص ہوتا ہے جو خوار ہونے کی بھی قیمت ادا کرتا ہے، اور اُسے ایڈونچر کا نام دے کر اپنے پیسے پورے کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ تقریباً ہر سیاح اپنے تازہ ترین سفر کو سب سے بُرا اور بے آرام گردانتے ہوئے آئندہ سیاحت سے توبہ کر لیتا ہے۔ مگر کچھ روز بعد اِسے یہ آرام و آسائش کاٹنا شروع کر دیتے ہیں تو وہ اپنا بوریا بستر گول کر کے پھر سے خواریوں کا سفر اختیار کر لیتا ہے۔

کہتے ہیں کہ پہلے سیاح اپنے سفر کی کارگزاری زبانی یاد رکھتے تھے اور زبانی ہی دوسروں کو سُنا کر لطف اندوز ہو لیا کرتے تھے۔ پھر کسی ایک سیاح نے اپنے چیدہ چیدہ واقعات کی تفصیل کو کاغذی یادداشت کے طور پر محفوظ کرنا شروع کر دیا اور پھر یاروں دوستوں کے اُکسانے پر اُس نے وہ رُوداد کتابی صورت میں چھاپ دی، ایسے سفرنامے کا آغاز ہوا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے سفرناموں کا فیشن

امن کے دنوں میں یہ جنگی قیدی دشمن کے جاسوس کہلواتے یا فوج کے بھگوڑے۔ شروع شروع میں سکھایا کم اور گھسیٹا زیادہ جاتا ہے لیکن جب سکول کے سٹاک سے روئی کے پیڈ اور ٹنکچر آیوڈین کم ہونے لگے تو طلبہ کو کامیاب قرار دے کر اس مشق کے اختتام کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔

ایک بار زیرِ تربیت ایک افسر کہ نئے نئے شادی شدہ تھے ایک عجیب مصیبت میں گرفتار ہو گئے۔ بیگم نے اصرار کیا کہ وہ انہیں مشقیں کرتا دیکھیں گی۔ موصوف انہیں کار میں بٹھا سکول لے آئے۔ اتفاق سے اس دن یہی جیپ ڈریگ والا مرحلہ تھا اور ''حسن اتفاق'' یہ کہ سب سے پہلے بیگم موصوف کے سرتاج ہی کی باری تھی۔ اب وہ انہیں منا رہے ہیں کہ وہ پھر کسی دن آ جائیں اُن کا اصرار کہ وہ تو دیکھ کر ہی جائیں گی آج کی مشقیں۔

بیوی کی طرف سے کہا نہ ماننے پر افسر نے غصے میں آ کر خودکشی کی دھمکی دی اور جیپ کے پیچھے آ کر لیٹ گئے۔ جب جیپ نے رفتار پکڑی تو بیگم صاحبہ چلائیں۔ ''لو میں جا رہی ہوں آصف پھر آؤں گی لیکن خدا کے لیے تم باز آ جاؤ۔''

موصوف کی قسمت اچھی تھی کہ وہ اٹھ کھڑے ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ بیوی کی طرف آئے اور مسکراتے ہوئے ان سے پوچھا۔ ''آئندہ انکار کرو گی میرا کہا ماننے سے؟'' پلکوں سے آنسو پونچھتی' وفاؤں کا یقین دلاتی وہ رخصت ہو گئیں اور موصوف پھر ہم سے آن ملے۔

جنٹلمین بسم اللہ از کرنل اشفاق حسین

سامنے آیا۔ فی زمانہ اصلی سفر نامے خال خال ہی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ سفر نامے کو دوام بخشنے میں ادیب قسم کے سیاحوں نے اہم کردار ادا کیا، انہی کی کوششوں سے سفر نامے کو ادب کا حصہ تسلیم کرلیا گیا۔ سفر نامہ لکھنے کے دو طریقے ہیں، پہلا کہ آپ سیر و سیاحت کریں، نگر نگر گھومیں اور پیش آنے والے تمام واقعات کو اپنے احساسات کے ہمراہ کاغذ پر منتقل کردیں۔ دوسرا کچھ مختلف ہے اور اِسے فکشن یا کہانی نگاری کے علاوہ کوئی اور نام دینا سفر نامے کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ وہ طریقہ یہ ہے کہ دنیا کا نقشہ کھولا، ایک دو مقامات چنے، اپنے شہر سے وہاں تک کے فاصلے ناپے، راہ میں پڑنے والے علاقوں اور لوگوں کے بارے میں ذرا سی تفصیل کسی کتاب یا انٹرنیٹ سے حاصل کی۔ کہیں اور سے رسوم و رواج کا حال معلوم کیا، پھر اِسے ایک خود ساختہ افسانے کے مکس کیا، تھوڑا سا مزاح کا تڑکا لگایا، چھ سات دوستوں کے نام ڈالے، کچھ فرضی کردار و واقعات ترتیب دیے اور یوں ایک معرکۃ الآراء سفر نامہ تخلیق کرکے ادب کے حوالے کردیا۔ کچھ روپے پیسے یا پی آر والے تو اِس سفر نامے کی تقریبِ اجراء یا رونمائی کرکے اِسے ادب پر ایک احسانِ عظیم ثابت کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔

سیاحت کچھ ممالک میں باقاعدہ صنعت کا درجہ رکھتی ہے اور من حیث القوم اِسے پروان چڑھایا جاتا ہے۔ فروغِ سیاحت کے لیے کئی باقاعدہ محکمے کام کرتے ہیں۔ سیاحوں کو سہولتیں فراہم کرنے کے لیے بہت سے لوگ بڑی تن دہی سے مصروفِ عمل دکھائی دیتے ہیں۔ کچھ ممالک میں تو یہ تندہی سیاحوں کو لوٹنے کے لیے برتی جاتی ہے۔ سادہ لوح سیاحوں کو سو (۱۰۰) روپے کی چیز پانچ سو (۵۰۰) کی بتا کر تین سو (۳۰۰) میں فروخت کردی جاتی ہے، اس لیے طرح طرح کے حربے اور حیلے بہانے کیے جاتے ہیں۔

سیاحت کو کسی دوسرے ملک پر قبضہ کرنے کے لیے بھی استعمال کیا گیا۔ اِسی وجہ سے کچھ اقوام سیاحت کے نام سے بھی چڑتی ہیں۔ سیاحوں کو مختلف مقامات کی تاریخ وغیرہ سے رُوشناس کرانے کے لیے گائیڈ ہر ملک میں مل جاتے ہیں۔ یہ مسٹر گائیڈ عموماً چرب زبان، شاطر اور کائیاں ہوتے ہیں، بلکہ اس شعبے میں آتے ہی ایسے لوگ ہیں۔ یہ لوگ کسی بھی گھٹیا سے مقام کو گھی میں تلی دال کے مصداق کسی بڑے آدمی سے ملا کر پیش کرنے میں ماہر ہوتے ہیں۔ سیاحوں کے روپ میں کئی طرح کے لوگ کسی بھی ملک میں داخل ہوتے ہیں جن میں جاسوس اور طلباء سرفہرست ہیں۔ مزدور طبقہ کسی بھی ملک میں داخلے کے لیے وزٹ ویزہ استعمال کرتا ہے۔ سیاح دورانِ سفر اپنی یا کسی کی قسمت بھی بدل دیتے ہیں، ایسا عموماً عاشق مزاج قسم کے سیاح کرتے ہیں۔

ہر سیاح مسافر ہوتا ہے جب کہ ہر مسافر سیاح نہیں ہوتا۔ سیاح کے بنیادی مقاصد میں سفر شامل ہوتا ہے جب کہ مسافر کے مقاصد میں سیاحت کہیں بھی نظر نہیں آتی۔ سیاحت پہلے پہل ایک چسکہ ہوتی ہے، بعد میں عادت اور پھر ضرورت یا مجبوری بن جاتی ہے۔ سیاحت میں آرام و آسائش کی تلاش میں نکلنے والوں کو سکون تو کیا سیاحت بھی نصیب نہیں ہوتی۔ جب کہ خالصتاً سیاحت کی کھوج میں نکلنے والے کو خواری بھی آسائش لگتی ہے اور وہ بخوشی اِس خواری سے استفادہ کرکے اگلے سفر کے لیے زادِ راہ کرلیتا ہے۔ سیاحت کے لیے کئی عادات کی ضرورت پڑتی ہے جن میں سے ایک پاگل ہونا بھی ہے۔ سیدھی سی بات ہے آسانیاں چھوڑ کر مشکلات کی تلاش میں نکلنا، خانماں خراب ہونا پاگل پن ہی تو ہے۔

محمد عاطفؔ مرزا کا اصل نام محمد ارشاد ہے۔ تعلق شاہینوں کے شہر لاہور سے ہے۔ موصوف پاک آرمی سے وابستہ رہے ہیں۔ آج کل ''کامسیٹ یونیورسٹی، اسلام آباد'' کی انتظامیہ کا حصہ ہیں۔ عاطف صاحب فنِ لطیف سے خصوصی شغف رکھتے ہیں۔ خطاطی میں خداداد صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ ان کے کام کی کئی ایک نمائشیں بھی منعقد ہو چکی ہیں۔ ادب میں نثر کے میدان کے کھلاڑی ہیں۔ اندازِ تحریر میں خاصی چلبلاہٹ، شگفتگی، روانی اور جامعیت پائی جاتی ہے۔ کبھی کبھی ''ارمغانِ ابتسام'' پر بھی مہربانی فرمالیتے ہیں۔

تاج رحیم

جو یوں ہوتا

پروفیسر صاحب کا گھر آج بھی میدان جنگ بنا ہوا تھا۔ یہ بھی عجیب لوگ ہیں، لڑائی جھگڑے سے تھکتے بھی نہیں جیسے ان کو اور کوئی کام ہی نہ ہو۔ دن رات میدانِ جنگ گرم رہتا ہے۔ میں نے سوچا، آج غور سے ان کی باتیں سنتا ہوں کہ آخر پتہ تو چلے کہ اُنھوں نے ہر وقت لڑائی جھگڑے کو ہی اپنی فل ٹائم مصروفیت کیوں بنا رکھا ہے تو ڈائیلاگ کچھ یوں سنائی دیے۔

پروفیسر: اس پلنگ کا تم نے بیڑہ غرق کر دیا۔ دن رات اس پر پڑی رہتی ہو۔ جیسے تمھیں دنیا کا اور کوئی کام نہیں۔ پھولتی جا رہی ہو۔ روز تمہارے وزن میں دو کیلو کا اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

بیگم: اس میں میرا کیا قصور ہے۔ سب تمہارا کیا دھرا ہے اور سزا میں بھگت رہی ہوں۔ تمہارا کیا ہے۔ کالج جا کر سٹوڈنٹس کو دو چار بے تکی باتیں سنا کر گھر آ جاتے ہو اور کہتے ہو آج بہت کام کیا تھک گیا ہوں۔ یہ بچے پیدا کرنا تمہارے سر ہوتا تو تمھیں پتہ چل

جاتا۔

پروفیسر: کیا بچوں کی رٹ لگا رکھی ہے۔ دنیا کی تمام عورتیں بچے جنتی ہیں ایک تم ہو جو اس کام سے بیزار ہو۔ اور تو کوئی شکایت نہیں کرتی۔

بیگم: تم ایک بچہ جن کر دکھاؤ تو تمھارے ہوش ٹھکانے آجائیں۔

پروفیسر: ایک کیا سو جن کے دکھاتا مگر اللہ نے یہ کام عورت کو دے رکھا ہے کیونکہ عورت کو اور کوئی کام ہی نہیں۔

ان کے لڑنے جھگڑنے کا سبب تو سمجھ گیا۔ مگر یہ بھی کوئی لڑنے کی بات ہے۔ یہ تو خوشی کی بات ہے۔ مگر پھر ایک سوچ نے گھیر لیا کہ اگر یہ کام سچ مچ مرد کے گلے پڑ گیا تو کیا ہوگا؟ میں تو ہرگز شادی نہیں کروں گا۔ اسی سوچ میں تھا کہ پروفیسر کا بڑا بیٹا دوڑتا ہوا آیا۔ مجھے کھینچنے لگا کہ بھائی جان جلدی کریں۔ اپنی گاڑی نکالیں اور ابو کو ہسپتال لے جائیں وہ بہت تکلیف میں ہیں۔ میں نے فٹا فٹ گاڑی نکالی اور ان کے گیٹ پر لے آیا۔ اس کے بیٹے نے سہارا دے کر پروفیسر کو پچھلی سیٹ پر بٹھا کر کہا ہسپتال پہنچو۔ راستے میں ان سے پوچھا "پروفیسر صاحب خیریت تو ہے نا؟"

"اندھے ہو؟ نظر نہیں آتا؟؟" بڑے غصے میں جواب دیا "بے بی آرہا ہے۔ جلدی میٹرنٹی وارڈ پہنچو!"

اس وقت مجھے بات کی پوری سمجھ نہیں آئی۔ میں یہ سمجھا کہ ان کی بیگم صاحبہ میٹرنٹی وارڈ میں داخل ہے۔ مگر جونہی میں نے ایمرجنسی میں کار روکی تو ہسپتال کے کارندے آئے اور پروفیسر صاحب کو سٹریچر رہڑی پر ڈال کر چل دیے۔ میں نے دیکھا کہ پروفیسر صاحب کا پیٹ پھولا ہوا ہے۔ میں پھر بھی نہ سمجھ سکا کہ یہ بے بی کہاں سے اور کس راستے آرہا ہے۔ میرا سر گھوم گیا کہ بیگم کی بجائے پروفیسر کیسے؟ اور وہ بیگم کو کیا ہوا اس نازک موقعہ پر کہاں ہے؟

اسی سوچ میں میٹرنٹی وارڈ میں پہنچ گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ وارڈ کے ہر بیڈ پر مرد حضرات ابھرے ہوئے پیٹ لئے لیٹے ہیں۔ ایک مرتبہ پھر میرا سر گھوم گیا۔ ہمکلامی کے انداز میں کہا "یا اللہ یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں کہیں یہ خواب تو نہیں۔ یہ تو عورتوں کی جگہ ہے یہ سارے مرد یہاں کیا کر رہے ہیں؟"

ڈیسک کے پیچھے کرسی پر سفید وردی میں بیٹھی نرس سے پوچھا کہ یہ وارڈ مردوں سے کیوں بھرا پڑا ہے؟ تو کہنے لگی "تم کیا کہنا چاہتے ہو کہ یہاں عورتوں کو ہونا چاہئے۔ تم ہوش میں تو ہو؟ عورتوں کا یہاں کیا کام؟"

میں نے مزید حیران ہو کر پوچھا "تو کیا یہ بچے مرد۔۔۔؟"

میری طرف حیرت سے دیکھ کر بولی "تم کسی اجنبی دنیا سے تو نہیں آئے ہو جو یہ پوچھ رہے ہو؟"

میں گہری سوچ میں پڑ گیا کہ آنکھ جھپکتے یہ دنیا کیسے بدل گئی۔ لگتا ہے مردوں پر اللہ کا کوئی عذاب نازل ہو گیا ہے کہ اسے اب زچہ بچہ کا فریضہ بھی سرانجام دینا پڑ گیا ہے۔ چند گھڑیاں پہلے تو یہ ڈیوٹی عورتوں کی تھی۔ دل میں خیال آیا کہ یہ عذاب شہر کے مردوں پر نازل ہوا ہے۔ یہ شہر چھوڑ کر یہاں سے کہیں دور بھاگ جاؤں۔

اور میں شہر سے بھاگ کر گاؤں آگیا۔ رات کا اندھیرا تھا جب میں گاؤں پہنچا۔ سو گیا، صبح اٹھا تو دوپہر ہو چکی تھی۔ چائے ناشتے کے بعد آرام سے گاؤں کے حجرے میں آیا۔ بہار کا موسم تھا۔ نہ گرمی نہ سردی۔ دھوپ کا مزہ ہی اور تھا۔ حجرے میں کچھ لوگ موجود تھے مگر سب ہی چارپایوں پر لیٹے ہوئے تھے۔ گل محمد چاچا کی آواز کانوں میں پڑی "پخیر ایاز بیٹا۔ بہت دنوں بعد گاؤں آئے ہو۔ ادھر پاس آؤ بیٹھو شہر کی نئی تازہ سناؤ۔"

اِدھر اُدھر غور سے دیکھا تو ہر شخص اپنی موٹی توند ننگی کر کے اس پر ہاتھ پھیر رہا ہے۔ یہ گاؤں کا حجرہ نہیں بلکہ ہسپتال کا میٹرنٹی وارڈ لگ رہا تھا۔ وہی سماں تھا۔ سوچا یہ وبا تو یہاں بھی پہنچ چکی ہے۔ ان کے درمیان کچھ یوں باتیں چل رہی تھیں۔

"کیوں بھائی علی ماماد۔۔۔ میر وس خان علی محمد سے پوچھ رہا تھا، تمہارے کتنے دن رہ گئے ہیں؟"

"ڈاکٹر کہتا ہے بس یہی کوئی دس بارہ دن کی بات ہے۔" علی محمد نے جواب دیا "ہسپتال میں بیڈ رکھوا لیا ہے۔ کہو تمہارا کیا پروگرام ہے؟"

"مجھے تو ابھی پورا مہینہ پڑا ہے۔ میں ہسپتال نہیں جاتا۔ وہاں جو لیڈی ڈاکٹر ہیں نا، جب وہ پیٹ پر مالش کرتی ہیں تو مجھے بڑی گدگدی ہوتی ہے۔ میرے ساتوں بچے گھر پر ہی پیدا ہوئے ہیں۔"

سارے مرد بڑے مزے سے چارپائیوں پر لیٹے، ابھری ہوئی توندیں ننگی کر کے دھوپ سینک رہے تھے۔ ایک نے کہا "یہ دھوپ سے جو وٹامن ملتی ہے بچوں کی صحت کیلئے بہت مفید ہوتی ہے اور مزے کی بات کہ نہ ہینگ لگے نہ پھٹکری، سب مفت۔"

سڑک پر نظر ڈالی تو کیا دیکھتا ہوں کہ گاؤں کے بڑے خان صاحب ابھری توند کے ساتھ، گلے میں ریوالور لٹکائے یوں چل رہا ہے جیسے کار کا ایک پہیہ پنکچر ہو۔ لڑکیوں کا ایک گروپ ریمارکس پاس کرتے قریب سے گزرا "ذرا خان کی توند ملاحظہ ہو۔ اسے کوئی اور کام نہیں۔ عمر دیکھو اور حالت دیکھو۔ شرم بھی نہیں آتی۔ ایک کرکٹ ٹیم تو پہلے مکمل کر چکا ہے اب دوسری کی تیاری ہے۔ اللہ معاف کرے یہ مردوں کے چوچلے ہیں کہ بچے پہ بچہ پیدا کئے جا رہے ہیں پھر بھی چین نہیں آتا۔"

جمعے کا دن تھا۔ اذان ہو چکی تھی۔ سوچا، اس رُوئے زمین پر کوئی ایسی جگہ ہے جہاں بھاگ کر چلا جاؤں؟ اللہ کے گھر، مسجد ہی جا کر شائد سکون مل جائے۔ یہی سوچ کر مسجد میں داخل ہوا دیکھا تو مولانا صاحب ممبر پر تشریف فرما تھے اور خطبہ فرمانے میں مصروف تھے۔ موضوع بھی بچوں کی پیدائش اور مردوں کے حوصلے اور ہمت پر تھا۔ فرما رہے تھے "یہ اللہ پاک جل شانہٗ کا بہت بڑا احسان ہے مرد کے اوپر کہ بچے پیدا کرنے کا فریضہ اسے بخشا ہے اور ساتھ ہی جو حوصلہ اور صبر دیا ہے وہ صنفِ نازک کے پاس کہاں؟ روزِ اول سے ہی یہ مشکل فریضہ حضرت آدم علیہ السلام کو بخشا کہ مائی حوا کو ان کے وجود سے پیدا کیا۔ ایک نئی روح اور نئے وجود کو دنیا میں لانے کے لاکھوں ثواب مرد کے حصے میں ڈال دیئے اور جو شخص جتنے زیادہ بچے پیدا کرے گا تو وہ بچے روزِ قیامت اس کی مغفرت کا سبب بن جائیں گے۔ عورت کی بدقسمتی ہے کہ اسے اس نعمت سے محروم کر دیا ہے۔"

مولوی حضرات کی توندیں تو ویسے ہی کچھ صحتمند ہوتی ہیں مگر جب مولانا صاحب کو ذرا غور سے دیکھا تو میرے منہ سے بے اختیار نکلا کہ مولانا صاحب بھی ماشااللہ امید سے ہیں۔

یہ نظارہ دیکھ کر ایک دم مسجد سے نکل کر دوڑ لگائی۔ کس سمت دوڑ رہا ہوں، کہاں جا رہا ہوں، کہاں جا کر دم لوں گا، منزل کہاں ہے۔ بس ایک سوچ لے کر دوڑ رہا تھا کہ یا اللہ یہ میں کون سی دنیا میں پھنس گیا ہوں جہاں یوں بھی ہوتا ہے۔ دوڑتے دوڑتے ایسی جگہ پہنچا جہاں زمین ختم ہوگئی۔ رُکا پھر بھی نہیں اور ایک چیخ کے ساتھ خلا میں چھلانگ لگا دی۔ پھر ایک دم ایک چٹان سے جسم ٹکرایا۔ دیکھا تو میں پلنگ سے نیچے فرش پر پڑا تھا۔ اٹھا اللہ کا شکر ادا کیا۔ گھر سے باہر نکلا اور پروفیسر صاحب کے گھر کی طرف چلا۔ گیٹ کی گھنٹی بجائی۔ پروفیسر صاحب گھر سے نکل کر گیٹ پر آئے تو میں نے بڑے غور سے ان کو سر سے پیر تک دیکھا۔ اچھا بھلا سمارٹ شخص تھا اور ان کے وجود میں کہیں بھی کسی بچے کے آثار نہیں تھے۔ پھر بھی ان سے پوچھ لیا کہ پروفیسر صاحب طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟

جواب میں کہنے لگے "میری طبیعت کو کیا ہوا؟ ٹھیک ٹھاک ہوں البتہ تمہاری طبیعت کچھ ناساز لگ رہی ہے۔"

"میں سمجھا تھا آپ کے ہاں۔۔۔"

"کیا مطلب؟"

"کچھ نہیں سر۔ سب خیریت ہوگئی!!"

تاج رحیم صاحب کا تعلق پشاور سے ہے تاہم فی الوقت وہ انگلینڈ میں مقیم ہیں۔ پشتو، ہندکو اور اُردو کے خوبصورت ادیب ہیں۔ پشتو میں ان کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ پشتو ادب کے شہ پاروں کو اردو میں منتقل کرنے کا کام بھی خاصی دلجمعی سے سرانجام دے رہے ہیں، جن میں مزاح پارے بھی شامل ہیں۔ تاج رحیم صاحب کا اندازِ تحریر خاصا شستہ اور برجستہ ہے۔ مشکل سے مشکل بات کو کمال سادگی سے بیان کر لینا اُنہیں کا خاصا ہے۔

واسکٹ

نیاز محمود
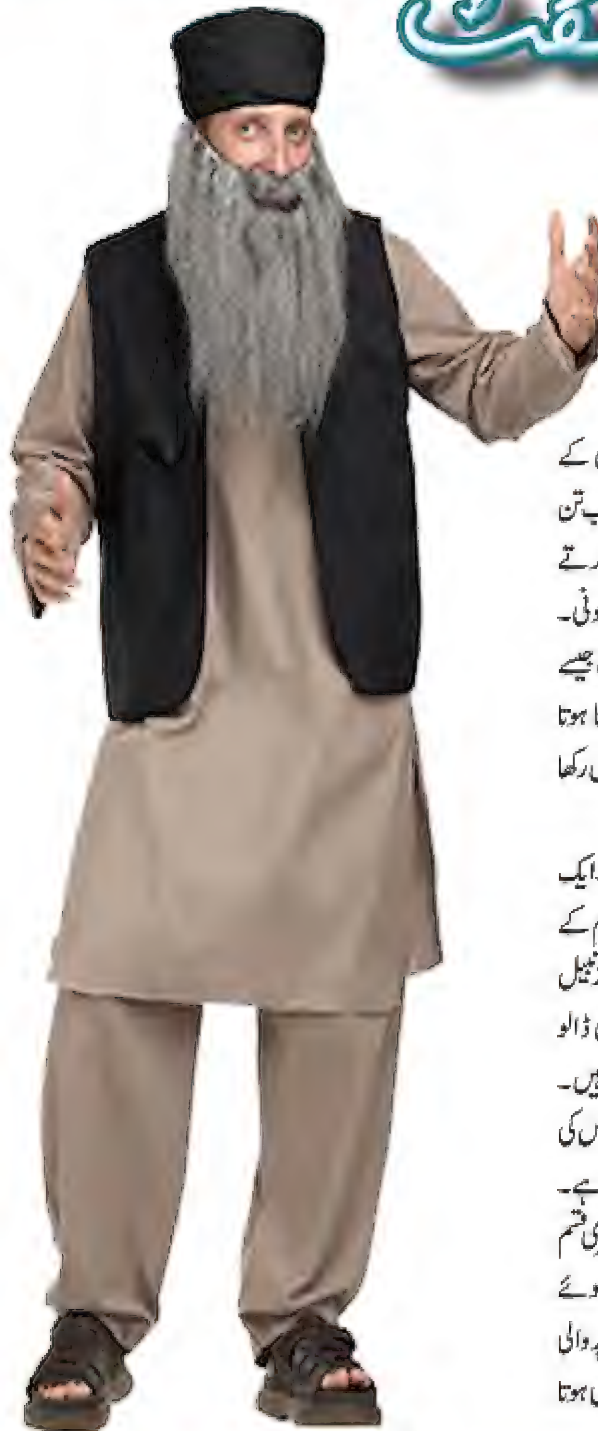
واسکٹ کے نام سے آپ یقیناً واقف ہوں گے۔ یہ پاکستان کے قومی لباس کا حصہ ہے۔ یہ مختلف رنگوں اور سائز میں دستیاب ہوتے ہیں۔ ساخت کے لحاظ سے تین بڑی اقسام ہوتی ہیں۔ کالروالی۔ بغیر کالروالی (گول گلے والی) اوروی شکل والی۔

اس کے آستین نہیں ہوتے لہذا سانپ پالنے والوں کے لیے اس کا استعمال مناسب نہیں۔ یہ زیادہ تر سردی میں زیب تن کیا جاتا ہے لیکن کچھ لوگ گرمیوں میں بھی اس کا استعمال کرتے ہیں۔ اس میں پانچ جیب ہوتے ہیں تین سامنے اور دو اندرونی۔ دو اندرونی اور دو بیرونی جیب سائز اور شکل میں تقریباً ایک جیسے ہوتے ہیں جب کہ سامنے کا تیسرا جیب باقیوں سے چھوٹا ہوتا ہے۔ اس کا مقام دل کے اوپر ہوتا ہے۔ اس میں اکثر رومال رکھا ہوا دکھایا جاتا ہے۔ جو کہ اصل میں رومال ہوتا ہی نہیں۔

انسانوں کی طرح واسکٹ بھی دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک سادہ منکسر المزاج اور خاکسار اور نرم طبیعت والے۔ اس قسم کے واسکٹ ہر قسم کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔ اس کے جیب عمرو عیار کی زنبیل کی طرح مختلف اشیاء سے بھرے رہتے ہیں۔ آپ کچھ بھی ڈالو اس میں یہ انکار نہیں کرتے اور ہر چیز اپنے اندر سمو لیتے ہیں۔ مزدور کی طرح یہ ہر قسم کا بوجھ اٹھانے کے عادی ہوتے ہیں جس کی وجہ سے اس کی شکل اپنے اوپر گزرے حالات کی چغلی کھاتی ہے۔ اس کے ظاہر اور باطن میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ دوسری قسم وہ ہے جس میں اکڑ پن ہوتا ہے۔ اس کے جیب سلے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس میں معمولی کاغذ بھی نہیں رکھا جا سکتا۔ اوپر والی جیب میں یا تو نمائشی رومال ہوتا ہے جو کہ اکثر سرخ رنگ کا ہی ہوتا

ہے۔لیکن ضروری نہیں کہ یہ رومال ہی ہو بس باہر سے رومال نظر آنا چاہیئے۔ یا پھر اس میں قلم رکھا جاتا ہے جو اکثر بیکار ہی ہوتا ہے۔ یعنی رومال کی طرح یہ بھی دیکھنے کی حد تک ہی ہوتا ہے۔اس سے آپ لکھنے کا کام نہیں لے سکتے۔اس قسم کا واسکٹ بہت مقبول ہے کیونکہ یہ وہ ہوتا ہی نہیں جو دکھائی دیتا ہے۔اس میں اکڑ کے ساتھ ساتھ دوغلا پن بھی ہوتا ہے اور یہی انسان کی پسندیدہ خصوصیات ہیں۔اسی اکڑ پن کی وجہ سے اس کی قیمت زیادہ ہوتی ہے۔

اس کے جیب معمولی چیز رکھنے سے بھی ڈھیلے پڑ جاتے ہیں جس کی وجہ سے اس کی قیمت گر جاتی ہے۔ یعنی اس کے جیب رکھنے کے نہیں دکھانے ہوتے ہیں۔ ہے نا عجیب بات کہ مزدور کتنا بھی طاقتور ہو، کتنا ہی بوجھ اٹھاتا ہو اس کی مزدوری انتہائی قلیل ہی ہوتی ہے جیسا کہ ڈھیلے ڈھالے واسکٹ کی قیمت کم ہوتی ہے اور جس افسر میں اکڑ پن زیادہ ہو، نازک مزاج ہو، اتنی ہی اس کی اجرت زیادہ ہوتی ہے۔معمولی وزن سے بھی اس کے پسینے چھوٹ جاتے ہیں۔ بالکل اکڑے ہوئے واسکٹ کی طرح۔ یعنی یہاں دراصل قیمت کسی اور چیز کی لگتی ہے جسے شاید ہم دوغلا پن کہتے ہیں۔اکڑ کہتے ہیں۔نازکی کہتے ہیں۔یا پھر۔۔۔

تو بات واسکٹ کی ہو رہی تھی کہ کارکردگی کے لحاظ سے اس کی دو قسمیں ہیں۔ کچھ لوگ واسکٹ کی جیبوں میں اشیا بھی رکھتے ہیں اور اس کے اکڑ پن کو بھی خراب نہیں ہونے دیتے۔ جیسے کچھ لوگ دن بھر محنت مزدوری کر کے شام کو صاف ستھرے کپڑے پہن لیتے ہیں اور برادری کے سنگ سنگ چلتے ہیں۔

سردیوں میں واسکٹ پہننے کا ایک مقصد تو فیشن کے ساتھ ساتھ سردی کی شدت سے بچنا بھی ہوتا ہے لیکن گرمی میں پہننا کچھ عجیب سا ہے۔میرے خیال سے اس کی بھی دو ہی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ایک یہ کہ پہننے والا سرد مزاج ہے اور گرم ہونا مقصود ہے یا پھر انتہائی گرم مزاج لیکن یہ دکھانا مقصود ہے کہ اسے سردی لگ رہی ہے۔ بہر حال جو بھی ہے لیکن دونوں صورتیں مکمل واضح نہیں۔اور دونوں میں ہر دو قسم کی خصوصیات کا یکجا ہونا بعید از امکان نہیں۔ لیکن چونکہ انسان کا مزاج ہر وقت تبدیلی چاہتا ہے لہذا یہی خو ہی اس حرکت کا قوی موجب مانا جا سکتا ہے۔ویسے آپس کی بات ہے کہ انسان خاک سے بنا ہے اور اس کے ساتھ خاکساری ہی جچتی ہے لیکن کیا کیا جائے کہ اکڑ پن کے پجاری زیادہ ہیں اور مزہ تو پوجے جانے میں ہی آتا ہے حالانکہ پوجنے والی ذات وہی ہے جس نے اس خاک کے پتلے میں جان ڈال کر نرمی پیدا کر دی۔اور وہی جان نکالنے کی بھی قدرت رکھتا ہے۔ جان اور اکڑ پن اکٹھے ہو ہی نہیں سکتے۔

نیاز محمود صاحب کا تعلق ''چھوٹا لاہور'' صوابی سے ہے۔ ہزارہ یونیورسٹی مانسہرہ سے ایم۔فل کیا ہے، مقالے کا عنوان تھا ''قدرت اللہ شہاب کی نثر کے فنی محاسن''۔ ناردرن یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی جاری ہے۔درس و تدریس سے وابستہ ہیں۔ انشائیہ اور افسانہ نگاری میں خصوصی دلچسپی ہے۔طنز و مزاح سے بھی فطری رغبت ہے جو انہیں ''ارمغانِ ابتسام'' کی طرف لے آئی ہے۔معاشرے کے عمومی موضوعات کو طنز و مزاح کی خصوصی عینک سے دیکھنا ان کی تحریر کا امتیازی نشان ہے۔

کائنات بشیر، جرمنی

زمانہ بدل گیا پیارے!

زمانہ بدل گیا پیارے!

نہ نہ ابھی اتنی دیر نہیں ہوئی کہ انسان مٹی کے گھڑوں، مٹکوں کے ادوار بھول گیا ہو۔ ابھی تو ایک جنریشن جتنا وقت نہیں ہوا۔

پہلے ہر ایک کے پاس کھلا وقت ہوا کرتا تھا۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ پہلے وقت گزارے نہیں گزرتا تھا۔ لوگ صبح ہوتے ہی ابھی آنکھیں کھول نہیں پاتے تھے کہ اخبار کا انتظار شروع ہو جاتا تھا۔ اخبار آتا تو ہر ایک کا دل اس پر لپکنے جھپٹنے کو کرتا۔ پر بڑی دید کے زمانے تھے۔ اس لیے اخبار پڑھنا سب سے پہلے ہیڈ آف دی فیملی کا حق سمجھا جاتا تھا۔ بیوی من مار کر جا کر پراٹھے بنانے لگتی اور سربراہ فیملی اخبار پر اپنا اختیار سمجھتے ہوئے جلدی جلدی نیم وا آنکھیں کھول کر اخبار کی سرخیاں اور دو چار صفحے پلٹ کر دیکھنے لگتا۔ اِدھر بیوی اخبار پہلے نہ پانے پر اپنا غصہ پراٹھوں کو بل دے کر نکالتی۔ ساتھ ساتھ الٹا سیدھا ناشتہ جلدی جلدی میز پر پہنچانے کی کوشش کرتی۔ میاں کو جلد ناشتے کی ٹیبل پر پہنچنے کی تاکید کرتی۔ اندر کھاتے اسے باس سے ڈرانے کی کوشش کرتی۔ اَرلی مارننگ کا ٹینشن دور کرنے کے لیے بچوں کو جلد سکول دھکیلنے کے لیے ان کے دھمو کے جڑ دیتی۔

اُدھر میاں ناشتے کے لیے میز پر پہنچ جاتا پر اخبار کے ساتھ۔ پراٹھے کا لقمہ منہ میں ڈالتے اور ساتھ گرما گرم چائے کی چسکی لیتے انگلی رکھ رکھ کر سطر بہ سطر قاعدے کی طرح اخبار پڑھنے لگتا۔ سالن کے پیلے پیلے گھی سے نچڑتے دھبے اخبار پر گلکاری کرتے جاتے۔ بیوی کی جان اور جل جاتی۔ من ہی من سلگ کر رہ جاتی کیونکہ جانتی تھی کہ اگر اس طرف دھیان دلوایا گیا تو یہ شاہکار جملہ سننے کو مل سکتا ہے "یہ اخبار میرے پیسوں کا آیا ہے۔ بل تم تھوڑا دیتی ہو!"

سو من مار کر وہ سالن زدہ اخبار پڑھنے کے لیے اپنے آپ کو تیار کرتی۔ اخبار کی اگلی قسط میاں دفتر سے آ کر تسلی سے اخبار پڑھ کر پوری کرتا۔ چھٹی والے دن تو اخبار کا تیا پانچا ہو جاتا۔ بیوی سنڈے

میگزین نکال کر لے جاتی، بچوں کے صفحات بچے نکال کر لے جاتے، کوئی فلموں کا صفحہ نکال کر لے جاتا۔ اور اخبار کا مین صفحہ خالی صندوق کے ڈھکن کی طرح اخبار کیا لک کے ہاتھ میں رہ جاتا۔ مگر اب۔۔۔

پہلے کھیلنے والے گلی ڈنڈا کھیلتے، کینچے کھیلتے، کرکٹ، ہاکی کھیلتے، لڈو میں آرام سے دوسرے بندے کو سانپ کو کھلوا دیتے اور خود سیڑھی چڑھنے کی دعا مانگتے۔ مطلب دھاندلی اور نفسا نفسی کا دور تب بھی تھا۔ پر اب زندگی کی رفتار بہت تیز ہوگئی ہے۔ یہ شوق خال خال دکھائی پڑتے ہیں۔ کاغذ کی ناؤ، مٹی کے کھلونوں سے کھیلنا تو قصۂ پارینہ بن چکا۔ وہ کاغذ کی کشتی وہ ناؤ کا پانی سننے والے دھوم مچاتے میوزک میں کھو چکے۔ گھگو گھوڑے کا کاروبار بھی یقیناً ٹھپ ہو گیا ہوگا۔ کیونکہ آج کل سے شوق بچوں کو بھاتے نہیں اور ماں باپ کا سٹیٹس نیچے کرتے ہیں۔ ورنہ بالی عمر کو سلام، لڑکیاں اشٹاپو کھیلتیں، پٹھو گرم اور اگلے گھر کی زندگی کی ریہرسل گڈے گڑیوں کا بیاہ رچا کے کرتیں۔ حالانکہ ان کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہوتی کہ زندگی کے سپنے وہ جس طرح بُن رہی ہیں، وہ اس جیون کے کتنے سنجیدہ اور سنگین مراحل ہیں۔

ایک گھر میں چار بہنیں سہیلیوں کے ساتھ اپنے گڈے گڑیا کا بیاہ بڑی دھوم دھام سے رچاتی تھیں۔ بَری جہیز تک جی جان سے تیار کیے جاتے۔ دن تاریخ طے کیے جاتے۔ کئی دن پہلے سے ڈھولک بجنا شروع ہو جاتی۔ گوٹے کناری کے کام شروع ہو جاتے۔ مایوں، مہندی، ولیمہ تک کی رسمیں ادا کی جاتیں۔ اتنی محنت کے بعد بات یہیں تک رہتی تو ٹھیک تھی مگر بعد میں سہیلی سے ناراضگی کی صورت وہ گڈے گڑیا کی طلاق بھی کروا دیتی تھیں۔ جہیز کا سامان بھی دوسری پارٹی کو ہضم نہیں کرنے دیتی تھیں۔ جہیز، بَری کا سامان حسابی کتابی گوشوارے کی طرح اکٹھا کیا جاتا۔

پھر وقت کافی آگے بڑھ گیا۔ گڑیا سجانے والیاں دلہن کا روپ دھار گئیں۔ وہ سب بہنیں بھی باری باری بابل کے گھر سے وداع ہوگئیں یوں کہانی کا انجام خوشگوار ہونا چاہیئے تھا۔ پر ایک بار پھر ان کا ذکر سب کی زبانِ زد ہوا کہ قدرت کے کھیل نرالے۔۔۔

ایک دعوت میں ریحانہ روحی نے مجتبیٰ حسین کو اپنا وزٹنگ کارڈ دیا تو نارنگ ساقی نے کہا" آپ بھی کمال کرتی ہیں، ایک غلط آدمی کو اپنا ایڈریس دے رہی ہیں؟"
روحی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "بے فکر رہیے، میں نے بھی اُنہیں غلط ایڈریس ہی دیا ہے۔"

اتفاقاً ان سب بہنوں کو بھی زندگی کے مختلف مراحل، اونچ نیچ کا سامنا کرتے ہوئے طلاق کا سامنا کرنا پڑا۔ یوں سب کے دل میں یہ بات جا گھسی، چونکہ وہ بچپن میں طلاق طلاق کا کھیل کھیلتی تھیں۔۔۔ در پردہ اس کی ریہرسل کر رہی تھیں۔۔۔ اس لیے ان کے ساتھ ایسا ہوا ہے۔ اب کی بار قسمت ان کے ساتھ دو دو ہاتھ کر گئی۔

اب تو گڈے گڑیوں کے ناز نخرے اٹھانے والا کوئی رہا نہیں۔ کپڑے کی گڑیا آج بھی کسی صندوق، ٹرنک میں منہ چھپائے روتی ہوگی۔ اب اسے پی گھر جانے کا سندیس دینے والا کوئی نہیں۔ اب اسے کوئی بیاہنے نہیں آئے گا۔

پہلے معاشرتی مسائل بڑے روایتی انداز سے حل کر لیے جاتے تھے۔ لڑکیاں پڑھائی میں ہمیشہ زیادہ ہوشیار ہوتی تھیں، بھئی ہونا بھی چاہیئے تھا۔ آخر گھر میں ہی رہتی تھیں اور ان کے پاس کرنے کے لیے ہوتا ہی کیا تھا۔ ٹی وی ریڈیو اور فلموں سے انھیں دور رکھنے کی پوری کوشش کی جاتی تھی۔ ان کے بگڑنے کے اندیشے میں ان کی لگام کس کے رکھی جاتی اور لڑکوں کو اتنا ہی بے لگام کر دیا جاتا تھا جبکہ ان کی تو آدھی زندگی ویسے ہی جوتیاں چٹخاتے گھر سے باہر ہی گزرتی تھی۔ پڑھائی اور زندگی کے کارہا کو وہ اتنا سنجیدہ لیتے کب تھے۔ آخر انھیں کون سا اگلے گھر جانا تھا، وہاں جا کر روٹیاں تھوپنا تھیں۔ اگر بالفرض جانا بھی پڑتا تو گھر داماد کی صورت، اور گھر داماد کے تو اپنے ہی چونچلے، اسے اتنا فرق نہیں پڑتا تھا۔ سونا نہ سہی چاندی سہی۔۔۔ اگر وہ جاتا بھی ہوگا تو آخر کسی لالچ میں کھنچا چلا جاتا ہوگا۔ کون سا ساس، سسر، سالوں کی خدمت کرنے جاتا تھا۔

زمانہ اللہ توکل چلتا رہا۔ جو پڑھ گئے وہ آگے بڑھ گئے۔ جو آوارہ، نکھٹو، کاہل، سڑک چھاپ، دوستی یاری میں پڑ گئے۔ کمائی کے نام پر دھیلہ تک نہیں کماتے تھے، ان کے لیے معاشرے کے کرتا دھرتا بڑے روایتی انداز میں مشورے دیتے تھے کہ اس آوارہ گرد کی شادی کر دو، سدھر جائے گا۔ درحقیقت ایک بگڑے کام نے سدھرنا کہاں تھا؟ بلکہ در پردہ یہ مشورہ عنایت کیا جاتا تھا کہ اس بوجھ کی گٹھڑی کو اپنے سارے سر سے اُتار کر کسی دوسرے کے سر پر رکھ دو۔ ایسا ہی ہوتا رہا۔۔۔ اپنی ایک گٹھڑی اتارنے کے چکر میں آنے والی کے سر پر چار پانچ گنا بھاری گٹھڑی رکھ کر اسے قسمت کے کھاتے میں ڈال دیا جاتا تھا۔

پَر اب۔۔۔ ایک پڑھی لکھی باشعور ماں کو جب اس کے کاہل بیٹے کے لیے یہی روایتی مشورہ دیا گیا تو اس نے جواب دیا کہ میں ایسے حالات میں اپنے بیٹے کے لیے دلہن ہرگز نہیں لے کر آؤں گی، آخر آنے والی بھی کسی کی بیٹی ہوگی۔ جب میرا بیٹا ذمہ داری اٹھانے کے قابل ہوگا۔ تبھی اس کی شادی کروں گی۔ جب میں اپنی بیٹی کے لیے ایک اچھا داماد ڈھونڈنے کی فکر میں ہوں تو میرے بیٹے کو بھی اسی اخلاقی اور سماجی ضابطے میں ہونا چاہیئے۔ واہ یہ ہوئی نا بات۔۔۔ اب یقین آیا نا، زمانہ واقعی بدل گیا پیارے۔۔۔

سو وقت یونہی آگے بڑھتا رہے گا۔ زمانہ تاریخ دہراتا رہے گا۔ اس لیے ہر دور کی خوبصورت روایات، اچھی باتیں، اقوال زریں خوبصورت پھولوں کی طرح چن لینے چاہییں۔ بصورت دیگر زمانے کا ڈنڈا ہاتھ میں ہے سو دھن دھنا دھن پٹنے کے لیے تیار ہو جایئے۔

کائنات بشیر کا تعلق لاہور سے ہے لیکن گزشتہ کئی سالوں سے جرمنی میں مقیم ہیں۔ مضمون نویسی اور شاعری اِن کا میدان ہے۔ شگفتہ نگاری اِن کی تحریر کا خاصا ہے۔ ۲۰۱۳ء میں اِن کی کتاب "چاند اور صحرا" شائع ہوئی، مزید بہت سی کتابیں اشاعت پذیر ہیں۔ اخبارات اور رسائل میں باقاعدگی سے لکھ رہی ہیں۔ "ارمغانِ ابتسام" کی مستقل لکھنے والوں میں شامل ہیں۔

خادم حسین مجاہد

سائنسدانوں کی تازہ ترین افواہ کے مطابق جب انسانی شعور دن بھر کی ڈیوٹی کے بعد کمر سیدھی کرنے کے لئے محوِ آرام ہوتا ہے تو تحت الشعور ۔۔۔لاشعور کی ملی بھگت سے دماغ کی اسکرین پر سنسر سمیت ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد نشریات شروع کر دیتا ہے، جسے خواب کا نام دیا جاتا ہے۔خواب دیکھنا ہر آدمی کے پیدائشی، بنیادی حقوق انسانی میں سے ہے اور یہ خالص انسانی فعل ہے کیونکہ باسی ترین سے لے کر تازہ ترین تحقیق کے مطابق آج تک یہ ثابت نہیں ہوا کہ کسی جانور نے کبھی خواب دیکھا ہو۔اگر کوئی جانور سائنسی حقائق کو چیلنج کرنا چاہے تو ثبوت کے طور پہ اپنا خواب بیان کرے۔اِس لاشعوری سہولت کے باعث انسان ہر قسم کی ممکن و ناممکن، جائز و ناجائز حسرتیں پوری کرتا ہے۔کبھی وہ راتوں رات عزت، دولت ،شہرت حاصل کرتا ہے اور کبھی دنیا بھر کے صفِ اول کی ہیروئنوں ،ٹاپ ماڈلز اور حقیقی زندگی میں ”ناقابل رسائی“ حسیناؤں کے ہمراہ دنیا بھر کے تفریحی مقامات کی مفت سیر کرتا ہے اور ظالم سماج کی دیواروں کو بلڈوز کرتے ہوئے ان کے ساتھ نہایت رنگین و سنگین نیلے پیلے لحات گزار کر جب صبح بیدار ہوتا ہے تو شرمندہ ہو جاتا ہے۔اس وقت اس کے شعور کو مروڑ اٹھتے ہیں کہ آخر اس کی تعبیر کیا ہے؟ جب ہم نے دیکھا کہ کچھ کم علم اور دھوکہ باز عناصر عوام کو ان کی غلط سلط تعبیریں بتا کر دونوں ہاتھوں سے لوٹنے اور گمراہ کرنے میں مصروف ہیں تو اچانک ۔۔۔ محبوبانِ کثیر کی آبادکاری سے بچ رہنے والے ہمارے دل کے چار سو بیسویں واحد خالی خانے میں قوم کا شدید درد اٹھا، جس نے فوراً ہی خطرناک صورت اختیار کر لی۔ آخر ہم نے مجبور ہو کر علم نفسیات اور تعبیر کی ہزاروں صفحات پر مشتمل لاکھوں کتابیں محض چند ماہ میں کھنگال کر علمِ تعبیر حاصل کیا اور عوام کی فلاح و بہبود کے لئے بغیر فیس کے محض توشۂ آخرت کی خاطر خوابوں کی تعبیر بتانا شروع کی۔ اب تک کروڑوں اور اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو اربوں لوگ اپنے خوابوں کی سچی اور اصلی تعبیریں سن کر زندگی میں کامرانیاں حاصل کر چکے ہیں عوام کے کچھ منتخب نمائندے خواب مع تعبیر افادۂ عام کے لئے دیئے جا رہے ہیں ورنہ اس سے ہمارا مقصود شہرت ہرگز نہیں۔

بلی ۔۔۔ بلو اور بلا

غافل بانو، کراچی۔

خواب میں، میں اپنے بیڈروم میں جاتی ہوں تو ایک خوبصورت سفید بلی گھسی ہوتی ہے اس نے کمبل، قالین، صوفے اور بستر کو گندا

کر دیا ہوتا ہے مجھے بہت غصہ آتا ہے اور شدید کوفت ہوتی ہے میں اسے ڈرا کر بھگانے کی کوشش کرتی ہوں تو وہ مجھ پر حملہ کر کے زخمی کر دیتی ہے مگر باہر نہیں نکلتی۔ اتنے میں میرے شوہر آ جاتے ہیں اور میرے زخم صاف کر کے مرہم لگا دیتے ہیں تو مجھے کچھ آرام محسوس ہوتا ہے۔ میں اُن سے بلی باہر نکالنے کا کہتی ہوں مگر کہتے ہیں "رہنے دو کیا فرق پڑتا ہے؟" اس پر مجھے شدید دکھ ہوتا ہے اور پھر آنکھ کھل جاتی ہے یہ خواب میں متعدد بار دیکھ چکی ہوں؟

☆ خواب میں نظر آنیوالی بلی دراصل کوئی "بلو" ہے جو آپ کے بلے، میرا مطلب ہے، شوہر پہ قبضہ کر کے آپ کے حق پہ ڈاکہ ڈال چکی ہے اور اب آپ کو بے دخل کرانا چاہتی ہے۔ آپ کا شوہر بھی اس سے شادی کرنا چاہتا اور اس کے لئے اجازت کے سلسلے میں وہ جلد خوشامد وغیرہ سے آپ کو رام کرنے کی کوشش کرے گا۔ یہ آپ کی "چھٹی حس" کا کمال ہے، جس نے آپ کو لاشعوری طور پر خبردار کیا ہے۔ یہ بلو آپ کے نزدیک ہی کہیں موجود ہے۔ آپ کی خوبصورت ملازمہ، پڑوسن یا میاں کی لیڈی سیکرٹری، اس کا کھوج لگا کر اس کی چھٹی کرائیں اور صبح شام کپڑے دھونے والے ڈنڈے سے اپنے بلے یعنی میاں جی پندرہ منٹ دھلائی کریں۔ انشاء اللہ آپ ہی نہیں آپ کے میاں بھی آئندہ اس قسم کا کوئی خواب نہیں دیکھیں گے۔

زنجیر

خوش دل خان، پشاور۔

میں نے خواب دیکھا ہے کہ امی مجھے زنجیروں کی ایک دکان پہ لے جاتی ہیں، جہاں ہر طرف چھوٹی بڑی سستی اور مہنگی سیاہ اور سنہری زنجیریں لٹکی ہوئی تھیں۔ امی مجھے کہتی ہیں کہ ان میں سے کوئی اپنے لئے پسند کر لو۔ پھر میں امی کے مشورے سے ایک خوبصورت سنہری زنجیر پسند کرتا ہوں۔ امی وہ زنجیر خرید کر میرے بازو پر باندھ دیتی ہیں۔ مجھے بہت اچھا لگتا ہے مگر گھر پہنچ کر وہ زنجیر مجھے کاٹنا شروع کر دیتی ہے تو میں امی سے کہتا ہوں کہ مجھے زنجیر بدل کرا دیں۔ امی کہتی ہیں کہ اب وہ دکان والا واپس نہیں کرے گا کیونکہ تم اسے استعمال کر چکے ہو۔ پھر میں زنجیر توڑنے کی کوشش کرتا ہوں مگر کامیاب نہیں ہوتا اس کے بعد میری آنکھ کھل جاتی ہے۔

☆ اس کی تعبیر یہ ہے کہ جلد شادی کی زنجیر آپ کے پاؤں میں پڑنے والی ہے۔ زنجیر یعنی لڑکی آپ اور آپ کی والدہ پسند کریں گے۔ شادی کے بعد بیوی بد زبان نکلے گی۔ آپ اسے چھوڑنا چاہیں گے مگر خاندانی مجبوریوں کے باعث ایسا نہ کر سکیں گے۔ اس انجام سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ آپ حقیقی زندگی میں کوئی "زنجیر" پسند ہی نہ کریں۔

باغ اور تتلی

عاشق صحرائی، بہاول نگر۔

میں خواب میں خود کو ایک خوبصورت باغ میں دیکھتا ہوں، جہاں ہر طرف خوبصورت پھول کھلے ہوئے ہیں اور ان پر رنگ برنگ تتلیاں منڈلا رہی ہیں۔ ان میں سے ایک خوبصورت تتلی پکڑنے کی کوشش کرتا ہوں مگر وہ باغ سے باہر نکل جاتی ہے۔ میں بھی اس کے تعاقب میں جاتا ہوں مگر راستے میں ایک کتا مجھے کاٹ لیتا ہے اور اتنی دیر میں تتلی میری آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ کچھ دیر بعد وہ تتلی مجھے پھر نظر آتی ہے۔ میں اس کی طرف لپکتا ہوں تو وہ ایک زہریلی بھڑ کی شکل اختیار کر کے مجھے کاٹ لیتی ہے اور پھر میرے گرد گھومنا شروع کر دیتی ہے۔ اسی دوران میرا خواب ختم ہو جاتا ہے۔

☆ گرلز کالج کی سیر کو روزانہ نہ جایا کریں ورنہ کسی خوبصورت تتلی کو پکڑنے کی کوشش آپ کی جسمانی ٹوٹ پھوٹ پر منتج ہو سکتی ہے۔ بہر حال خواب میں اشارہ ہے کہ آپ کا بیڑہ وہیں غرق ہو گا جہاں آپ کی خواہش ہو گی لیکن آپ کی بیوی چند ہی روز میں اپنا نرم و نازک اور پیار بھرا بھیس اتار کر کسی بھڑ کا روپ دھار لے گی اور آپ کو طرح طرح کے ڈنگ مارنا شروع کر دے گی جن میں سے شاپنگ کا ڈھنگ زیادہ خطرناک ہو گا۔

حقیقی خواب

شعور منطق، کمالیہ۔

خواب میں مجھے ایک پہاڑی پر ایک بہت بڑا اور خوبصورت تخت

نظر آتا ہے، جس میں ہیرے جڑے ہوتے ہیں۔ جن کی روشنی سے پوری پہاڑی جگمگا رہی تھی۔ اس تخت کے گرد خوبصورت پریاں رقص کر رہی ہوتی ہیں اور ایک خلقت ان پریوں اور تخت کی چاہ میں دیوانہ وار اس کی طرف دوڑ رہی ہے، جونہی کوئی اس تخت پہ بیٹھنے میں کامیاب ہوتا ہے تو یا تخت کے نیچے سے کوئی اس کی ٹانگ کھینچ لیتا ہے یا وہ خود ہی کچھ دیر بعد تخت سے اتر جاتا ہے۔ میں بھی بڑی مشکل سے چڑھائی عبور کر کے اوپر پہنچتا ہوں اور آس پاس والوں کو دھکا دے کر تخت پہ بیٹھنے میں کامیاب ہو جاتا ہوں مگر اگلے ہی لمحے مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں پھولوں کی سیج پر نہیں بلکہ آگ پر بیٹھا ہوں۔ پھر جونہی نظر نیچے جاتی ہے تو مجھے اپنے پاؤں تلے انسانی کھوپڑیاں دکھائی دیتی ہیں تکلیف اور خوف سے میری آنکھ کھل جاتی ہے۔

☆ آپ نے خواب نہیں بلکہ حقیقت دیکھی ہے۔ ملکی سیاست کی طرف نظر دوڑائیں اور ملک میں کرسی کی دوڑ پر غور کریں تو آپ کو مسئلہ سمجھ میں آجائے گا۔ خواب میں آپ کو اس حقیقت سے بھی روشناس کرایا گیا ہے کہ پھولوں کی سیج نظر آنیوالی "کرسی اقتدار" دراصل کیا ہے اور بظاہر سرور اور عیش و نشاط میں مصروف اہل اقتدار دراصل کس کرب سے گزرتے ہیں۔

خطوں کی بارش

حسن بانو، سرائے عالمگیر۔

میں خواب میں دیکھتی ہوں کہ میں اپنے کمرے مین بیٹھی میک اپ کر رہی ہوتی ہوں کہ اچانک دروازہ کھلتا ہے اور خطوں کی ایک فوج تین قطاروں میں اندر داخل ہوتی ہے۔ اس فوج میں ہر رنگ اور سائز کے خط ہوتے ہیں۔ کمرے میں آ کے وہ عجیب وغریب ڈانس شروع کر دیتے ہیں، حتیٰ کہ ان کے منہ کھل جاتے ہیں اور ان میں سے چٹھیاں باہر گر پڑتی ہیں۔ میں ہمت کر کے اپنے پیروں میں گرنے والے ایک خوبصورت خط کو اس چٹھی سمیت اٹھا کر دیکھتی ہوں۔ چٹھی پہ ایک سرخ گلاب کی تصویر بنی ہوتی ہے۔ میں اس کو اپنی کتاب میں رکھ لیتی ہوں تو اچانک خط دوبارہ اٹھ کر ڈانس کرنا شروع کر دیتے ہیں لیکن اب کی بار یہ ڈانس ذرا مختلف ہوتا ہے، پھر میں بھی ان کے ساتھ ڈانس شروع کر دیتی ہوں۔

☆ آپ کے لئے ڈاکیے کا رشتہ آئے گا آپ کے گھر والے اسے کسی منی آرڈر کی طرح قبول کریں گے اور اس کے جوابی پتے پر آپ کو رجسٹرڈ کر کے پارسل کر دیں گے تو وہ پکی مہر لگا دے گا۔

مستقبل کی خبر

خوش فہم خان، پشاور۔

خواب میں، میں بہت اچھے سوٹ میں ملبوس ہو کر ایک فائل بغل میں دبائے کسی خوبصورت آفس میں داخل ہوتا ہوں۔ سیکرٹری مسکرا کر مجھے باس کے کمرے میں جانے کا اشارہ کرتی ہے مگر میں جونہی فائل کھول کر اس کے آگے رکھتا ہوں، ان کے چہرے کا رنگ بدل جاتا ہے اور وہ غصے سے گٹ آؤٹ کہہ کر آفس سے نکال دیتا ہے۔ اس کے بعد میں ایک زمیندار کی حویلی پہ جاتا ہوں۔ وہ مجھے لسی وغیرہ پلاتا ہے مگر جب میں فائل کھول کے اس کے سامنے رکھتا ہوں تو وہ اپنے آدمیوں کو بلا کر میری چھینٹی لگواتا ہے، جس کے درد سے میری آنکھ کھل جاتی ہے۔

☆ آپ بہت جلد کوئی فلاحی تنظیم بنا کر اس کے لئے چندہ وغیرہ اکٹھا کرنے کی کوشش کریں گے یا آپ کو بیمہ کمپنی میں ملازمت مل جائے گی اور آپ کو اس طرح کے عملی تجربات سے متعارف ہونا پڑے گا۔

آپ یقیناً ایسی صورت حال سے کئی بار دوچار ہوئے ہوں گے کہ جب آپ کسی ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہیں تو سب پہلے جس چیز پر نظر پڑتی ہے، وہ ایک جاذب نظر جوڑے کی دل کش تصویر ہوگی۔ یہ صاحب خانہ کی شادی کی تصویر ہے جو ایک نمایاں مقام پہ بڑے اہتمام سے اس لیے آویزاں کی گئی ہے کہ ہر آنے والا موصوف کے ماضی پر رشک اور حال پر افسوس کر سکے۔ ممکن ہے اس کے ذریعے میزبان یہ پیغام بھی دینا چاہتا ہو کہ:

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

جوئے لطافت از ابوالفرح ہمایوں

مرغی اور دانے

دلبر پر یمی، بہاولپور۔

خواب میں نے دیکھا کہ میں گلی میں کھڑا ہوں اور گلی میں ہمسائیوں کی مرغیاں پھر رہی ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں ایک مرغی اٹھالوں، یہی سوچ کر اندر جاتا ہوں اور گندم کے دانے لا کر ان کے سامنے ڈال دیتا ہوں۔ صرف ایک مرغ ان دانوں کو کھاتی ہے بہرحال جب مرغی دانوں کو چگنے میں محو ہوتی ہے تو میں آگے بڑھتا ہوں کہ چپکے سے اسے اٹھالوں کہ اسی دوران ہمسائیوں کے دولڑکے آجاتے ہیں اور مجھے مارنا شروع کر دیتے ہیں۔ میری چیخ و پکارسن کر امی باہر آ کر مجھے چھڑاتی ہیں اور اندر لے جا کر میرے زخم صاف کرتی ہیں۔ اس کے بعد وہ ٹکور کرتی جاتی ہیں اور کہتی ہیں کہ اگر ضرورت تھی تو مجھے بتاتے، ہم مرغی خرید لیتے تم نے مرغی چرانے کی کوشش کیوں کی؟

☆ ہمسائیوں کی لڑکی کو پھانسنے کے لئے جو لو لیٹر لکھے ہیں، جلد ہی وہ اس کے بھائیوں کے ہاتھ لگنے والے ہیں اس کے بعد آپ کا انجام خواب والا ہی ہوگا۔ بہتر یہی ہے کہ اگر آپ ضرورت محسوس کرتے ہیں تو والدہ کے فرمان کے مطابق مرغی خرید لیں ''چرانے کی'' کوشش نہ کریں۔

آسمان سے باتیں

سفید پوش، لاہور۔

خواب میں، میں ایک قدرے پرانی گاڑی چلاتا ہوا کچھ نئی اور پرانی تیز رفتار گاڑیوں کا تعاقب کر رہا ہوں۔ جب بھی میں سرتوڑ کوشش کر کے اپنی گاڑی ان گاڑیوں کے قریب پہنچاتا ہوں، گاڑی میں کوئی نہ کوئی خرابی پیدا ہوجاتی ہے۔ کبھی انجن گرم ہوجاتا ہے اور کبھی پٹرول ختم ہوجاتا ہے۔ اور یہ نہ ہو تو سگنل پہ پھنس جاتا ہوں یا ٹریفک جام ہوجاتی ہے۔ بہرحال میں کسی نہ کسی طرح گاڑی چلا کر پھر ان کے تعاقب میں روانہ ہوجاتا ہوں اور پھر سر دھڑ کی بازی لگا دیتا ہوں اور جونہی ان گاڑیوں تک پہنچ کر انہیں کراس کرنے کی کوشش کرتا ہوں، وہ سڑک سے اٹھ کر آسمان کی طرف پرواز کرنا شروع کر دیتی ہے۔ عین اسی وقت میری گاڑی کا پہیہ پنکچر ہو جاتا اور وہ گاڑیاں دور ہوتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہوجاتی ہیں اور میں ہاتھ ملتا رہ جاتا ہوں۔

☆ آپ ضروریاتِ زندگی کی قیمتوں کے تعاقب میں اپنی محدود آمدنی کے پٹرول سے زندگی کی گاڑی دوڑانے کی کوشش کر رہے ہیں اور قیمتوں کے آسمان سے باتیں کرنے کے باعث آپ کو ناکامی ہورہی ہے ان قیمتوں کو اوورٹیک کرنے کے لئے آپ کو کچھ اضافی پٹرول ڈلوانا پڑے گا یا نئی گاڑی لینی پڑے گی۔

حیرت انگیز انقلاب

عدم خیالی، بھائی پھیرو۔

میں نے خواب میں دیکھا کہ قائداعظمؒ اور علامہ اقبالؒ شاہی قلعے میں سب سیاستدانوں کو اکٹھا کر کے مرغا بنادیتے ہیں۔ پھر قائداعظمؒ کے اشارے پر علامہ اقبالؒ ان کو جوتے لگانا شروع کر دیتے ہیں کسی کو ایک، کسی کو دو، کسی کو تین اور کسی کو اس سے بھی زیادہ۔ جب سب کو مقررہ تعداد میں جوتے لگ جاتے ہیں تو قائد ان کو کھڑا ہونے کا کہتے ہیں، علامہ اقبالؒ ان سے پوچھتے ہیں کہ میری تعبیر کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے والو! آئندہ تم کیا کرو گے؟ تو ایک سیاستدان توبہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ آج کے بعد ہم بلیک گارڈن ڈیم کے سلسلے میں حکومت سے مکمل تعاون کریں گیاور سب پاکستانیوں کو برابر سمجھیں گے۔ ایک اور سیاستدان وعدہ کرتا ہے کہ وہ دہشت گردوں کی سرپرستی اور علیحدگی پسند سرگرمیاں چھوڑ دے گا کیونکہ اس نے اپنا گھر بسا لیا ہے اور اپنی صلاحیتیں تخلیقی کاموں مین صرف کرے گا۔ کچھ اور سیاستدانوں نے وعدہ کیا کہ وہ نفاذِ شریعت کا آغاز اپنے گھر سے اور اپنی ذات سے کریں گے۔ اپنا محل چھوڑ کر ضرورت سے زائد رقم بیت المال میں جمع کرا دیں گے۔ ایک اور سیاستدان نے وعدہ کیا کہ وہ غیر ملکی جائیداد قوم کو دے دیں گے۔ ایک مولانا صاحب نے ہر قسم کے دھرنوں سے تائب ہو کر تن من دھن سے قوم کی تربیت کرنے کا وعدہ کیا۔ ایک اور صاحب شیروانی نے بھان متی کے کنبے جوڑنے سے توبہ کی۔ ایک سیاستدان نے اعلان کیا کہ وہ آج کے بعد سیاست کو تین طلاقیں دے کر خاموشی سے تصنیف و تالیف اور تعلیم و تربیت

میں وقت صرف کریں گے۔ ایک آدھے مولانا نے افواہ ساز فیکٹری بند کر کے باقی عمر خدمت خلق میں گزارنے کا وعدہ کیا۔ یہ سب سن کر قائداعظمؒ اور علامہ اقبالؒ کے چہرے پہ چمک آگئی اور انہوں نے ان سب کو شاباش دی۔

☆ یہ آپ کا ہی نہیں، ہم سب کا خواب ہے۔ کاش یہ خواب بھی تعبیر سے بھی گپ شپ کرے۔

خوشحال زندگی

مس نازک خیالی، جہلم۔

خواب میں میں نے خود کو ایک ایسے گھر میں پایا، جہاں آرام، آسائش اور آرائش کی ہر چیز موجود تھی اور میں اس گھر کی مالکن تھی۔ اِتنے میں ایک شخص آتا ہے اور ایک بہت بڑی اور مہنگی گاڑی میں بٹھا کر مجھے باہر لے جاتا ہے اور وہ جہاں سے گزرتا ہے لوگ اسے سلام کرتے ہیں۔ پھر ہم کسی بہت ہی مہنگے ہوٹل میں پہنچتے ہیں جہاں پہلے ہی سے ہماری میز ریزرو ہوتی ہے اور اس پر ہمارے لئے تحائف کے ڈھیر لگے ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ ہمیں سالگرہ کی مبارکباد دیتے ہیں مگر یہ معلوم نہیں ہوتا کس کی سالگرہ ہے اور کیسی سالگرہ؟

☆ آپ کا جیون ساتھی کوئی کسٹم آفیسر، پولیس مین یا ڈاکو ہوگا اور آپ ایک خوشحال زندگی گزاریں گی۔

دیوانے کا خواب

شیخ چلی، عدم آباد۔

میں نے خواب دیکھا کہ اچانک میرے گھر کی ہر ایک چیز سونے کی ہوگئی ہے۔ نظری دھوکے کے خدشے کے تحت نل سے منہ دھونا چاہا تو اس میں سے خالص پٹرول نکلنا شروع ہوگیا۔ پھر میری نظر صحن میں لگے درخت پر پڑی تو مجھے شادی مرگ ہوتے ہوتے رہ گیا کیونکہ اس پہ کرنسی نوٹ لگے ہوئے تھے۔ میں نے وہاں سے کچھ نوٹ اُتارے تو وہاں نئے نوٹ اگ آئے، پھر میں نے صحن کی کھدائی کی تو زمین نیچے تک سونے کی ہوچکی تھی۔ میں نے اس سونے اور کرنسی نوٹوں کی مدد سے آئی ایم ایف، ورلڈ بینک اور امریکہ کا قرضہ اتارا جس پر خوش ہو کر قوم نے مجھے وزیراعظم بنا

دیا۔ میں نے نل کی جگہ موٹر لگوا کر کثیر تعداد میں تیل نکالنا شروع کر دیا، جس سے ہمیں تل میں خود کفالت حاصل ہوگئی۔ پھر ہم نے ضرورت سے زائد تیل سے زرمبادلہ کمانا شروع کر دیا۔

☆ اتنے خوفناک خواب نہیں دیکھا کرتے، جاگنے پر تکلیف ہوتی ہے کیونکہ ان کی تعبیر ہمیشہ الٹی ہوتی ہے۔

جال اور کبوتر

دلربا صحرائی، نور پور تھل۔

خواب میں میں جال لے کر چھت پر جاتی ہوں۔ اچانک ایک طرف سے ایک کبوتر اُڑتا ہوا آتا ہے۔ میں جال آگے کرتی ہوں اور وہ اس میں پھنس جاتا ہے۔ میں اسے پکڑ کر پنجرے میں ڈال دیتی ہوں۔ وہ پنجرے کی دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر خود کو زخمی کر لیتا ہے۔ میں اس کے پر کاٹ دیتی ہوں تو وہ افسردہ ہو کر ایک طرف بیٹھ جاتا ہے۔

☆ کوئی معصوم اور نادان لڑکا آپ کے جال میں پھنس کر دین و دنیا سے آزاد ہوسکتا ہے۔ تھوڑی مزاحمت کے بعد وہ آپ سے شادی کے بعد گھر دامادی کا طوق اپنے گلے میں ڈالنے پر مجبور ہو جائے گا۔ اگر آپ کسی کی زندگی بچانا چاہتی ہیں تو چھت پر شکار کھیلنا

قصہ ناموں کا

عربوں میں بھی یہ مسئلہ پایا جاتا ہے جو کہ بعض اوقات بڑا سنگین ہو جاتا ہے اکثر بیٹا بھی محمد، باپ بھی محمد، اور دادا بھی محمد ملتے ہیں۔ صالح، عبداللہ، فہد، سلطان وغیرہ تو اس کثرت سے ملتے ہیں کہ باپ اور خاندان کا بھی نام لینا لازمی ہو جاتا ہے خاص طور پر عورتیں بڑی پریشان رہتی ہیں۔ چونکہ ان کے ہاں شوہر کو بھی، نام لے کر پکارا جاتا ہے اس لئے جب کسی خاندانی تقریب میں یہ شوہر نامدار کو پیار سے یا صالح یا یا عبداللہ کہہ کر پکارتی ہیں تو چار پانچ مرد دوڑ پڑتے ہیں۔

میری باتوں پہ ہنستی ہے دنیا از حلیم فلکی

موقوف کردیں۔

ایک دہشت ناک خواب

آتش غزلوی، میرپور۔

میں ایک شاعر ہوں اور خواب میں، میں نے دیکھا کہ میرے دسویں مجموعہ کلام کی تقریب رونمائی ہو رہی ہے۔ شہر کے تمام اہم لوگ شریکِ محفل ہیں۔ مقررین میری ذات اور شاعری کے متعلق زمین آسمان کے قلابے ملا رہے ہیں کہ اچانک حاضرین میں سے ایک شخص اٹھ کر مقرر سے کہتا ہے کہ تم جھوٹ بکتے ہو، اس شخص کی شاعری ردی میں بیچنے کے بھی قابل نہیں اور اس کی ذات کسی بھی طرف سے لائق تحسین نہیں۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کر دھمکی دیتا ہے کہ اگر آج کے بعد میں نے کوئی شعر کہا یا کوئی کتاب مزید چھپوانے کی کوشش کی تو وہ میری کتابوں کو جلا کر مجھے قتل کر دے گا۔ جاگنے پر میں نے دیکھا کہ مجھے خوف سے پسینے آ رہے ہیں۔

☆ لگتا ہے آپ نے باقی نو مجموعہ ہائے کلام کی اشاعت اور تقریبات رونمائی بھی خواب ہی میں کرائی ہیں۔ بہر حال خواب میں آپ کے لئے اشارہ ہے کہ فوراً شاعری سے توبہ کریں، کوئی صدقہ وغیرہ دیں اور باقی عمر اللہ اللہ کرنے میں گزاریں۔ آپ کی زندگی کو شدید خطرہ ہے۔

خوراک اور خواب

منتشر خیالی، کراچی۔

میں نے خواب میں دیکھا کہ کچھ لوگ میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں اور میں ان سے بچنے کے لئے اندھا دھند بھاگنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن بمشکل ایک قدم اٹھانے میں کامیاب ہوتا ہوں تو ان میں سے ایک مجھے چھڑی سے مارتا ہے تو میں گدھا بن جاتا ہوں۔ وہ مجھ پر سوار ہونے کی کوشش کرتا ہے تو میں اسے دولتی جڑ دیتا ہوں۔ نتیجتاً، وہ گدھا بن جاتا ہے اور میں واپس انسانی شکل میں آ جاتا ہوں۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ مجھ سے بدلہ لے، میں وہاں سے چمپت ہو جاتا ہوں۔ آگے ایک کشتی پڑی ہوتی ہے۔ میں ایک رکشہ کا انجن اتار کر اسے لگاتا ہوں اور جب اسٹارٹ کرتا ہوں تو وہ ہوا میں پرواز کرنا شروع دیتی ہے۔ اتنے میں معلوم ہوتا ہے کہ جنگ چھڑ گئی ہے۔ میں فوراً محاذِ جنگ کی طرف روانہ ہو جاتا ہوں اور دشمن کے سپاہی مجھے پکڑ لے جاتے ہیں اور بھاری نقصان پہنچانے کی وجہ سے میرے لئے سزا تجویز کرتے ہیں کہ میں ان جہازوں کو دھکا لگا کر سٹارٹ کروں۔ جب میں اس میں کامیاب نہیں ہوتا تو وہ مجھے مجبور کرتے ہیں کہ میں ان کے لئے اپنے طیارے جیسا طیارہ ڈیزائن کروں مگر میں انکار کر دیتا ہوں، جس پر وہ مجھے بم باندھ کر ہلاک کر دیتے ہیں۔

☆ خس کم جہاں پاک۔ میرا خیال ہے کہ کسی دعوت میں کھانے پینے کے عالمی ریکارڈ قائم کرنے کے بعد ورزش کی زحمت کئے بغیر آپ نے بستر کو رونق بخشی جس کے باعث آپ نے اوٹ پٹانگ بدہضمی کا خواب دیکھا ہے۔ اس کی تعبیر سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ آئندہ اناج دشمنی سے پرہیز کریں ورنہ شاید اگلی دفعہ آپ خواب بیان کرنے کے لئے زندہ نہ رہیں۔

ناقابلِ اشاعت خواب

شیطان دریائی، بھکر۔ آوارہ پریمی، ملتان۔ حسینہ چارسوبیس، فیصل آباد۔ شباب عالم، راولپنڈی۔ اداس تنہا، خوشاب۔ مجرد کنوارہ، کراچی۔ بے تاب جذباتی، سرگودھا۔ دل پھینک فریبی، اسلام آباد۔ بے باک ٹھیار، حیدرآباد۔

☆ آپ سب کے خواب ناقابلِ اشاعت ہیں اور تعبیریں ناقابلِ بیان۔ اس قسم کے نیلے پیلے خوابوں سے جان چھڑانے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ آپ شادی کی رسی گلے میں ڈال کر شرافت کی زندگی گزاریں۔

خادم حسین مجاہد کا تعلق سرگودھا سے ہے۔ موصوف بچپن سے ہی لکھتے آ رہے ہیں۔ بچوں کے لئے بہت کچھ لکھا۔ شستہ اندازِ تحریر کے مالک ہیں۔ ظرافت نگاری کے ساتھ ساتھ ان کے طنز کی کاٹ سے بھی انکار ممکن نہیں۔ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ''ارمغانِ ابتسام'' کی مجلسِ مشاورت میں شامل ہیں اور اوّلین شمارے سے اس کے ساتھ ہیں۔

بابا اور قلفیاں

حافظ مظفر محسن

کچھ محاورے، کچھ تشبیہات، کچھ استعارے ایسے ہیں جن کی مجھے آج تک سمجھ نہیں آئی مثلاً ''پیکیج ڈیل''، تنظیمی دورے، باہمی مفادات، تربیتی ورکشاپ، ''جوانی کی غلطیاں''، ''بڑھاپے کے خوف'' وغیرہ وغیرہ۔

سرکاری افسروں کی تربیت ہوتی ہے چھ ماہ کا کورس اور اس دوران ڈیڑھ دو سو لوگ اکٹھے بیٹھ کر ''تربیت'' کا مزہ لیتے ہیں نہایت عمدہ کھانا کھاتے ہیں۔۔۔ آنے جانے کا خرچہ وغیرہ لیتے ہیں اور اُن میں سے پندرہ بیس ٹھیک ایک ڈیڑھ سال بعد ریٹائرڈ ہو جاتے ہیں (غور طلب بات ہے)۔۔۔ شاید یہ بھی ضروری ہے کہ ریٹائرڈ منٹ سے پہلے بتا دیا جائے کہ اختیارات کے بغیر زندگی گزارنے والا وقت قریب تر ہے؟

ہمارے دور جوانی میں چھوٹے چھوٹے بکسٹالوں پر موٹی موٹی کتابیں ملتی تھیں (بلیک میں) انگریزی، اردو، پنجابی ترجمہ کے ساتھ، جن میں ''ہولناک راتیں'' ہولناک راتیں پارٹ II وغیرہ وغیرہ وغیرہ۔۔۔ جو دوست ''افورڈ'' نہیں کر سکتے تھے وہ کئی کئی ہفتے انتظار کر کے ترلے ڈال کے، منتیں کر کے لے لیتے اور پھر کبھی بھی واپس نہ کرتے۔۔۔ لیکن اب تو پوچھیں مت، لاکھ لاکھ صفحات کھل جاتے ہیں، مع ترجمہ، تشریح اور ہزاروں متعلقہ غیر متعلقہ تصاویر سمیت۔ نہ دوستوں کے ترلے ڈالو نہ منت کرو نہ ہی کتاب واپس کرنے یا نہ کرنے پر جھگڑا فساد کہ سوچا اس میں ''سیٹ کیفے'' جائیں۔۔۔ بدبودار کرسی پر دم گھٹے ماحول میں خوشبو دار بدبودار بلکہ نہایت بدبودار تحریریں پڑھیں۔۔۔ شعلے اگلتی تصاویر دیکھیں اور اوئی اوئی کر کے گھر آ جائیں اور ہر ایک کے ساتھ بدتمیزی شروع کریں کہ ؏
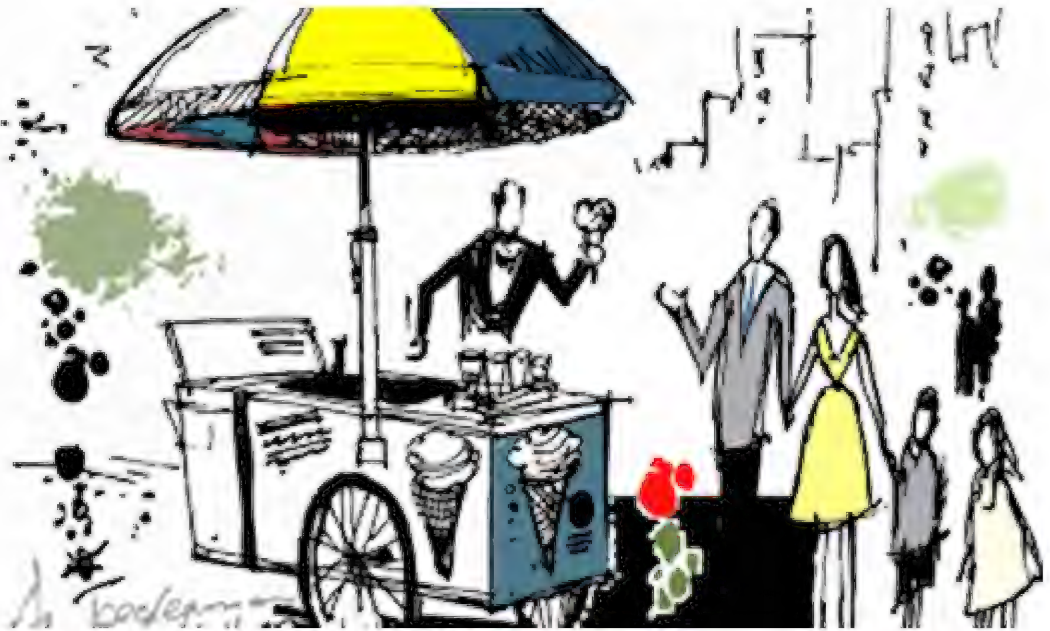
بُرے کام کا یہی نتیجہ ہوتا ہے

سرکاری محکموں میں دوسری کرپشن کے علاوہ ٹی۔اے/ڈی۔اے کی کرپشن بھی پکڑ لی جاتی ہے۔ ہمارے ایک سینئر سرکاری ملازم دوست نوکری سے نکل گئے، محض اس لیے کہ پچیس اگست کو گجرات سے کوئٹہ سرکاری دورے پر گئے مگر اُنہوں نے سرکاری کھاتوں میں بائیس تاریخ روانگی شو کی۔ ''یار'' لوگوں نے اُن کی ریلوے کی پچیس تاریخ کی بکنگ اور ریلوے کا سفری ریکارڈ پیش کیا اور موصوف نوکری سے فارغ۔۔۔اب بے چارے کسی سرکاری دفتر کے باہر بیٹھ کر ''پڑھے لکھے'' شکایتوں کو ''جھوٹی عرضیاں'' لکھ لکھ کر دیتے ہیں اور من کی مراد پاتے ہیں۔

پچھلی جمعرات کو میں داتا دربار گیا، پیر کی دربار کے پاس ہجوم لگا ہوا تھا، میں بھی حسب عادت جا گھسا۔ ہجوم میں ایک پندرہ سولہ سال کا ''جیب کترا'' شدید گرمی میں ''اپنے ہی ساتھیوں'' کے ہاتھوں خوار ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں دو پولیس والے بھی آ دھمکے۔

''چھڈو چھڈو۔۔۔مر جائے گا جے!''

ہجوم مطمئن ہو کے اِدھر اُدھر بکھر گیا۔ اُنہوں نے جیب کترے کو گریبان (کالر) سے پکڑا اور ایک سائیڈ پر لے گئے جس نے جیب کترے کو رنگے ہاتھوں پکڑا تھا وہ ہجوم سے باہر نکل آیا۔۔۔غصے میں چلاتے ہوئے۔

''یہاں آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔۔۔اب یہ باہمی مفادات کی جنگ شروع ہو گئی ہے، یہاں اب ہمارا کیا کام؟''

میں دیر تک سوچتا رہا کہ یہ ''باہمی مفادات کی جنگ'' کیا ہوتی ہے؟

کل شام میں اچھرے کے پاس سے گزر رہا تھا، شدید گرمی لگی تو میں نے سوچا ''بابے دی قلفی'' کھائی جائے۔ میں نے جیب سے پچیس روپے نکال کر بن دیکھے کہا ''باباجی ایک قلفی دینا۔''

وہ ہنس پڑا۔ بیس اکیس کا نوجوان تھا ''سوری لڑکے میں نے آپ کو باباجی کہہ دیا۔'' میں نے ادب سے عرض کیا۔

''سارا دن آپ جیسے بہت سے آتے ہیں اور ایسی دل دکھانے والی باتیں کرتے رہتے ہیں۔''

''ویسے بھائی یہ باباجی کہاں ہوتے ہیں؟؟''

''قبر میں۔۔۔'' وہ یکدم غصے سے بولا۔

''تو قلفیوں کی مینوفیکچرنگ میانی صاحب (قبرستان) میں ہوتی ہے؟؟؟'' میرے فقرے پر اُس کا کچھ غصہ کم ہوا۔

''ان کو فوت ہوئے تین سو سال ہو گئے۔'' میرے ساتھ کھڑا ایک گاہک بولا۔

''گویا رنجیت سنگھ کے دور میں ان باباجی نے یہ قلفی ایجاد کی تھی۔۔۔؟؟؟''

''باؤ جا۔۔۔قلفی کھا۔۔۔تے رش گھٹ کر۔۔۔سانوں کم شم کرن دے، بن!''

مجھے تذبذب کا شکار دیکھا تو اک صاحب پاس آ گئے، اُنہوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولے ''بھائی۔۔۔یہ قلفیاں اب بڑی بڑی فیکٹریوں میں بنتی ہیں۔۔۔اِسی طرح کی فیکٹریوں میں، جن پر میڈم عائشہ ممتاز چھاپے مارا کرتی تھیں اور جہاں ضرورت سے زیادہ گندگی دیکھتی فیکٹری سیل کر دیتی تھیں۔۔۔مجھے لگتا ہے تم بیکار ہو آج کل کسی جاب کی تلاش میں ہو؟ تم

خیر۔۔۔۔۔۔۔یہ تو بھارت کی بات تھی جہاں رائی کو پہاڑ بنانے کی روایت بہت پرانی ہے'وہاں تو یہ بھی ہوا کہ ۱۹۶۴ء میں جب آنجہانی لال بہادر شاستری وزیر مواصلات تھے تو ریل کا ایک حادثہ ہو گیا۔ حادثے تو ہوتے ہی رہتے ہیں اور یہ ایک معمول کا عمل ہے' بہ قول شاعر:

وقت کرتا ہے پرورش برسوں　　　　حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

لیکن شاستری جی اس حادثے کو اپنے دل پہ لے بیٹھے اور اس کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے وزارت سے مستعفی ہو گئے۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ ہم یہاں یہ بتاتے چلیں کہ بھارت میں ۱۸۵۳ء میں ریلوے کے نظام کا آغاز محض ۲۱ میل طویل لائن سے ہوا تھا جو اب بڑھ کر چالیس ہزار میل پہ پھیل چکی ہے اور اس پر سات ہزار ریلوے اسٹیشن ہیں۔ ہمارے یہاں کل ٹریک لگ بھگ 7188 میل پہ محیط ہے اور اس پر صرف سات سو ریلوے اسٹیشن ہیں' پھر بھی ریل کے ہر حادثے کے بعد اخباری نمائندے ریلوے کے وزیر سے ان کے استعفے کے بارے میں سوال کر کے بلاوجہ شرمندہ ہوتے ہیں۔　　　بقلم خود از ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی

اگر بابا قلفی کی دوکان کھولنی چاہو تو تمہیں وہ بڑے بڑے بینر بھی دیں گے تمہارے اس تین سو سالہ پرانے بابے کی بڑی بڑی دو تصاویر بھی دیں گے اور فریزر پر کھڑا کرنے کے لیے اس جیسا نہایت بدتمیز لڑکا بھی!'' اُس نے سامنے کھڑے دوکاندار لڑکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اُسے نہایت مکروہ انداز میں طنز کرتے ہوئے کہا۔

''دفع ہو جا بن!!'' لڑکے نے غصے میں کہا اور وہ چلا گیا۔

اس دوران میں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا ایک اور قلفی لینے کے لیے۔

''ہائے میرا پرس۔۔۔ہائے میرا پرس۔۔۔پکڑو۔۔۔پکڑو۔۔۔وہ جیب کترا۔۔۔!!!''

''ہور سنو اس سے قلفی بنانے کے سو آسان طریقے!'' لڑکے نے نوٹ گنتے ہوئے طنزیہ انداز میں کہا۔ (گویا وہ اُس مناسب عمر کے تجربہ کار ''جیب تراش'' کو جانتا تھا؟)

اور میں سمجھ گیا کہ جس طرح ہر زرداری کے ساتھ ایک ڈاکٹر عاصم حسین، انور مجید یا عزیر بلوچ ہوتا ہے، ہر یوسف رضا گیلانی کے ساتھ حامد رضاء گیلانی ہوتا، ہر الطاف حسین کے ساتھ ایک ''سیکٹر انچارج'' ہوتا، ایسے ہی آپ بابا قلفی کی کسی چوک چوراہے میں دوکان کھولیں تو آپ کو دو چار بینرز، دو چار کسی سفید کپڑوں میں ملبوس کسی بابے کی بڑی تصاویر، ایک دو بڑے فریزر، ایک سیل بوائے (نہایت بدتمیز) اور چھ سات (نہایت ٹرینڈ جیب کترے) بھی ملتے ہیں۔ اسے کاروباری زبان میں ''پیکیج ڈیل'' کہتے ہیں۔

مجھے تو چوک میں جیب کٹوا کے ہی پتہ چلا ہے۔۔۔آپ کے تجربہ یا مشاہدے میں کوئی نئی بات آئی ہو تو ضرور بتایئے گا۔۔۔میں منتظر رہوں گا۔

میرا ساتھ نبھاویں گا
لگدا نہیں فیر آویں گا

حافظ مظفر محسن صاحب کا تعلق لاہور سے ہے۔ میں بچپن سے اِن کی کہانیاں اور نظمیں بچوں کے مختلف رسائل میں پڑھتا چلا آ رہا ہوں۔ بچوں کے ادب میں اِن کا حصہ قابلِ ستائش ہے۔ بہت اچھے شاعر اور کالم نگار ہیں۔ ان کے کالم ایک مؤقر اخبار میں ''طنز و مزاح'' کے عنوان سے مسلسل شائع ہو رہے ہیں۔ مزاح نگاری اِن کا خصوصی میدان ہے۔ طنز و مزاح پر مبنی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کے اندازِ تحریر میں شگفتہ بیانی، بیساختگی اور ڈرامائی عناصر وافر پائے جاتے ہیں۔ ''ارمغانِ ابتسام'' کے لئے بہت عرصہ سے لکھ رہے ہیں۔

حنیف عابد

بوٹی دوٹی

پیارے میاں پورے محلے میں اپنی چرب زبانی کی وجہ سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔اس کے علاوہ موصوف کی وجہ شہرت ان کی غربت اور کنجوسی بتائی جاتی ہے۔زبانی لاف وگزاف کے تو دھنی ہیں لیکن اس سے آگے کبھی نہیں بڑھے۔کہتے ہیں کہ جب ان کے والد حیات تھے تو وہ کچھ کام دھندا کیا کرتے تھے لیکن ان کی وفات کا دُکھ ایسا لگا کہ دنیا سے جی اُچاٹ ہو گیا اور پھر اس دن سے اُنھوں نے کام کرنے سے جیسے بالکل ہی توبہ کرلی۔ترکے میں چھوڑی ہوئی باپ کی دو دکانوں کا کرایہ آتا ہے جس سے وہ اپنی گزر بسر کرتے ہیں۔کرایہ اتنا قلیل ہے کہ اس میں ایک خاندان نہیں پل سکتا اس لیے اُنھوں نے شادی نہیں کی اور عمر بھر کنوارے رہنے کا فیصلہ کیا۔خیر سے پچاس کے پیٹے میں ہیں لیکن بدن ٹھسا ہوا ہے جیسے بھینسا ہو۔پیارے میاں خوش گفتار ہی نہیں خوش خوراک بھی ہیں۔جو شخص ایک بار اُنھیں دعوت پر بلا لیتا وہ پھر مہینوں ان کو مدعو کرنے سے کتراتا تھا۔محلے ہی نہیں پورے قصبے میں شاید ہی کوئی گھر بچا ہو جہاں پیارے میاں دعوتِ شیراز سے لطف اندوز نہ ہو چکے ہوں لیکن اُنھوں نے آج تک کسی کو اپنے غریب خانے پر چائے تک کے لیے مدعو نہیں کیا۔وہ ہمیشہ یہ عذر تراشتے ہیں کہ ''میاں چھڑا چھانڈ رہتا ہوں، نہ جورو نہ جاتا اللہ میاں سے ناطہ ہے، دل تو بہت چاہتا ہے کہ سب کی دعوت کروں اپنے غریب خانے پر لیکن انتظام کیسے ہو پکائے کون؟''

اُن کے بعض بے تکلف دوست تو کہہ دیتے ''اچھے میاں! جانے دو تم کھلانا ہی نہیں چاہتے، ورنہ یہ عذر کوئی ایسا نہیں ہے کہ جسے دور نہ کیا جا سکے، تم سامان خورد و نوش لا دو ہم اپنے گھر سے پکوا کر دیدیں گے!''

اچھے میاں ایسے موقعوں پر کنی کترا جاتے اور کہتے ''میاں جو مزہ اپنے گھر میں پکا کے دعوت کرنے میں ہے وہ کسی اور کے گھر سے پکوا کر کھلانے میں کہاں؟''

عید قرباں کی آمد تھی اکا دکا گھروں میں جانور آنا شروع ہو گئے تھے۔جس گھر کے باہر جانور بندھا دیکھتے اچھے میاں اس گھر کا تفصیلی چکر ضرور لگاتے۔پہلے تو وہ جانور کی تعریفوں کے پل باندھتے خواہ وہ جانور کتنا ہی مریل کیوں نا ہو اچھے میں اس کی خوبیاں ایسے گنواتے کہ جانور لانے والا خود حیرانی سے ان کا منہ تکنے لگتا۔وہ سوچتا کہ یہ تمام خوبیاں اس کی آنکھوں سے کیوں اوجھل رہیں؟اسی طرح جہاں اچھے میاں موٹا تازہ جانور دیکھتے تو اس کے اوصاف ایسے بیان کرتے جیسے کہ اس سے اعلیٰ جانور

روئے زمین پر ابھی تک پیدا نہیں ہوا ہے۔

اچھے میاں صرف اپنے محلے میں ہی نہیں آس پاس کے محلوں میں بھی جن جن گھروں میں قربانی ہو رہی ہوتی تھی وہاں پابندی سے حاضری بھرتے اور سلام علیک اس انداز میں کرتے کہ سامنے والا دیر تک ان کی موجودگی کو محسوس کرتا۔ باتوں باتوں میں وہ یہ ضرور پوچھ لیتے کہ جانور کس دن اور کس وقت کٹے گا؟ اس کے علاوہ وہ باتوں ہی باتوں میں یہ جانکاری بھی حاصل کر لیتے تھے کہ جانور کا گوشت کتنی دیر میں تیار ہوگا اور اس کی بنائی کا طریقہ کار کیا ہوگا۔

جانور کے مخصوص اعضا کے گوشت کے خواص بھی اچھے میاں سے زیادہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ وہ سری پائے سے لے کے دم کے گوشت تک ہر حصے کے گوشت کو پکانے کے طریقے اور کھانے کے آداب اس انداز میں بیان کرتے کہ سننے والے کے منہ میں پانی آ جاتا۔

خاندان اور رشتے داروں کے نام پر اچھے میاں کے گھر کئی سالوں سے کسی کو آتے جاتے نہیں دیکھا گیا تھا۔ ان کا گھر دو کمروں اور ایک دالان پر مشتمل تھا ایک کمرے میں وہ خود رہتے تھے دالان میں کاٹھ کباڑ پڑا رہتا لیکن دوسرے کمرے میں تالا لگا رہتا تھا۔ محلے سے اچھے میاں کے گھر میں کوئی بھی جاتا تو وہ اس کمرے کو مقفل ہی پاتا۔ ویسے بھی اچھے میاں گھر میں کم ہی پائے جاتے تھے وہ صرف کھانے کے وقت ہی اپنے گھر پر ہوتے لیکن اس وقت وہ اندر سے کنڈی لگا کر کھانا کھاتے۔

محلے میں ان کے ایک بہت ہی قریبی دوست رہتے تھے جن کا نام مرزا مہذب بیگ تھا۔ مرزا بھی اس کمرے کی زیارت سے ابھی تک محروم تھے۔ وہ اچھے میاں کو بہت کچھ کہہ سن لیتے تھے لیکن اچھے میاں نے کبھی ان کی بات کا برا نہیں منایا۔

عیدالاضحی کے دن اچھے میاں نہادھو صاف اُجلے کپڑے پہن کر نماز پڑھنے کو عیدگاہ گئے، وہاں سے واپس آ کر انہوں نے کمرہ اندر سے مقفل کیا اور ناشتے سے فارغ ہو کر پرانے میلے کپڑے پہنے اور بغل میں کپڑے کا ایک تھیلا دبایا اور گھر سے نکل گئے۔ محلے میں جہاں جہاں قربانی شروع ہو چکی تھی وہاں عید ملتے اور دعا سلام کرتے ہوئے اچھے میاں کہیں دور چلے گئے۔ تقریباً محلے کی ہر گلی میں دو تین جانور ذبح ہو چکے تھے۔ کہیں کھال اتاری جا رہی تھی تو کہیں کلیجی نکال کر گھر میں بھیجی جا رہی تھی تاکہ جلد از جلد وہ پک جائے اور جس کی قربانی ہے وہ کلیجی کھا کر اپنا روزہ کھولے۔ بچے سب جانور کٹنے کا تماشا دیکھ رہے تھے جبکہ لڑکے بالے آگے بڑھ بڑھ کر قصاب کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔

ابھی دس ہی بجے ہوں گے کہ اچھے میاں اپنے کاندھے پر ایک بھاری سا تھیلا اٹھائے ہوئے نمودار ہوئے۔ وہ نہایت تیزی کے ساتھ اپنے گھر میں داخل ہوئے اور اندر سے کنڈی لگا لی۔ کافی دیر بعد وہ گھر سے برآمد ہوئے تو جلدی جلدی ان گھروں کے چکر لگانے لگے جہاں قربانی ہو چکی تھی۔ ہر گھر سے وہ اچھا خاصا گوشت وصول کرتے اور جب چلنے لگتے تو ایک آدھا گوشت کا پارچہ خود ہی اٹھا کر اپنے تھیلے میں ڈال لیتے اور اس کی کوئی نہ کوئی ایسی توجیہہ بیان کرتے کہ صاحب خانہ خاموش منہ دیکھتا رہ جاتا اور اچھے میاں یہ جا وہ جا اپنا رستہ لیتے۔

تینوں دن اچھے میاں کا یہی سلسلہ چلتا رہا۔ تینوں دن ان کا سامنا مرزا مہذب بیگ سے ہوا لیکن انہوں نے دور سے ہی دعا سلام کر کے اپنا رستہ پکڑا۔ تیسرے دن مرزا کی گلی جب ایک گھر سے گوشت لینے کے لئے اچھے میاں آئے تو مرزا نے انہیں پکڑ لیا

ہندوستان میں کوئی مشاعرہ تھا۔ امجد اور عطا ریلوے اسٹیشن سے سیدھے مشاعرہ گاہ پہنچے۔ سامانِ سفر دونوں نے آدھا آدھا اُٹھا رکھا تھا۔ جب مشاعرہ ختم ہوا تو سارا سامان عطا نے اُٹھایا، امجد خالی ہاتھ تھے۔ کسی نے پوچھا ”بیچارے عطا نے کتنا بوجھ اُٹھا رکھا ہے، امجد خالی ہاتھ ہیں۔“ یہ سُن کر امجد نے کہا ”میرے ہاتھ خالی ہیں تو کیا، ذہن پر جو بوجھ ہے، وہ اس بوجھ سے زیادہ ہے جو عطا نے اُٹھا رکھا ہے۔ سوال کیا گیا ”آپ کے ذہن پر کس چیز کا بوجھ ہے؟“ جواب ملا ”اُن غزلوں کا جو عطا نے مشاعرے میں پڑھی ہیں۔“

سُن تو سہی از مشفق خواجہ

اور پوچھا ''اچھے میاں کہاں ہیں! پکڑائی میں ہی نہیں آ رہے ہیں؟ ایسی بھی کیا مصروفیت ہے؟''

اچھے میاں ''نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن'' کے مصداق کھسیانے سے ہو کر بولے ''مرزا جی کہاں مصروف ہوں گے ہم؟ بس بقر عید کی وجہ سے کچھ بوٹی ووٹی کی فکر میں تھے تاکہ چار دن ہم بھی گوشت کھا سکیں۔''

بقر عید کے ایک ہفتے بعد اچانک اچھے میاں بیمار پڑ گئے۔ جب طبیعت سنبھلنے میں نہیں آئی تو انہوں نے مرزا مہذب بیگ کو اطلاع کروائی۔ وہ پہنچے تو دیکھا کہ مرزا کی حالت غیر ہو رہی ہے۔ وہ انہیں لے کر فوری سرکاری اسپتال پہنچے تو ایمر جنسی میں انہیں پوری طور پر داخل کر لیا گیا۔ پتہ چلا کہ بسیار خوری کے باعث فوڈ پوائزن ہو گیا ہے۔

مرزا نے جب پوچھا کہ اچھے میاں کیا کھا لیا ہے آپ نے جو حالت غیر ہو گئی تو اچھے میاں بولے ''بس مرزا جی ایک آدھ بوٹی ووٹی زیادہ کھا لی تھی!''

خیر علاج ہوتا رہا اور اچھے میاں چار دن اسپتال میں رہے گھر آئے تو مرزا مہذب بیگ نے انہیں سمجھایا کہ آپ گوشت بالکل نہیں کھائیں گے، اچھے میاں نے پوچھا کہ یہ تم اپنی طرف سے کہہ رہے ہو کہ ڈاکٹر نے کہا ہے؟ مرزا نے کہا کہ ڈاکٹر نے سادہ غذا لینے کا کہا ہے۔

ایک ہفتے کے بعد اچھے میاں کو دل کا دورہ پڑا آناً فاناً انہیں اسپتال لے جایا گیا جہاں ان کی انجیو گرافی کی گئی تو معلوم ہوا کہ ان کی تین شریانیں تقریباً بند ہو چکی ہیں ایمر جنسی میں ایک شریان کھول دی گئی۔

پانچ دن اسپتال میں رہ کر اچھے میاں گھر پہنچے تو دوائی کے پرچوں کے ساتھ غذا کا پرچہ بھی ان کے ہاتھ میں تھا جس میں لکھا ہوا تھا کہ وہ سرخ گوشت یعنی گائے بیل بھینس اور بکرے کا گوشت بالکل استعمال نہیں کریں گے۔ صرف چکن یا مچھلی کا گوشت کھا سکتے ہیں، وہ بھی ہفتے میں صرف ایک دن۔

اگلے دن اچھے میاں نے مرزا مہذب بیگ کو بلوایا، جب مرزا ان کے گھر پہنچے تو انہوں نے مرزا سے استفسار کیا کہ کب تک انہیں سرخ گوشت کھانے کی اجازت مل سکے گی؟ مرزا نے جب بتایا کہ اب وہ عمر بھر سرخ گوشت نہیں کھا سکیں گے تو وہ زار و قطار ہچکیاں لے لے کر رونے لگے۔ تسلی دینے پر جب اُن کی ہچکی رکی تو مرزا مہذب بیگ نے پوچھا ''آخر مسئلہ کیا ہے؟'' تو اچھے میاں بولے ''مرزا جی میں نے بھاگ دوڑ کر کے جو بوٹی ووٹی جمع کی تھی اب اس کا کیا ہوگا؟''

مرزا کچھ نہ سمجھتے ہوئے استفہامیہ لہجے میں بول پڑے ''کون سی بوٹی ووٹی؟''

اچھے میاں نے انہیں اپنے تکیے کے نیچے سے ایک چابی نکال کر دیتے ہوئے اشارہ کیا کہ وہ بند کمرہ کھول کر خود ہی دیکھ لیں۔ مرزا مہذب بیگ نے دھڑکتے دل کے ساتھ وہ دروازہ کھولا تو وہ بیہوش ہوتے ہوتے بچے۔ کمرے میں فل سائز کے تین ڈیپ فریزر رکھے ہوئے تھے۔ مرزا نے انہیں کھول کے دیکھا تو وہ اوپر تک گوشت سے بھرے ہوئے تھے۔

انہیں دیکھتے ہی مرزا کے ہوش اڑ گئے اور ان کے منہ سے بے ساختہ نکلا ''یہ ہے بوٹی ووٹی!!!''

حنیف عابد شاعر، ادیب، نقاد، کالم نگار، مضمون نگار، فکشن نگار، ناول نگار، بچوں کے ادیب اور سینئر صحافی ہیں۔ آپ کا تعلق کراچی سے ہے۔ ۳۰ سال سے زائد عرصے سے صحافت سے وابستہ ہیں۔ موصوف اپنی غیر جانبدار اور دوٹوک رائے رکھنے کے حوالے سے بدنام ہیں۔ بہترین تجزیہ کار ہیں، ان کی رائے کو رد کرنا عمومی طور پر ممکن نہیں ہوتا۔ ملکی اور عالمی سیاست پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ پرنٹ کے ساتھ الیکٹرانک میڈیا میں بھی کام کرنے کا تجربہ رکھتے ہیں۔ موصوف کی پانچ کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں ایک شاعری کا مجموعہ بھی شامل ہے۔ مزید کئی کتابیں زیر ترتیب ہیں جو جلد ہی منظر عام پر آنے والی ہیں۔ ایک سال سے زائد عرصے سے ارمغانِ ابتسام میں لکھ رہے ہیں اور تسلسل سے لکھ رہے ہیں۔

گوہر رحمٰن گہر مردانوی

Like ٹھینگا اور ٹھونگا Poke

جس کو جگالی کی لت پڑ جاتی ہے تو وہ ٹونگے نہیں مارتے بلکہ کھیت میں ٹنگے کاٹھ کے اُلو کو ٹھینگا دکھا کر ہریالی سے پیٹ پوجا اس طرح کر لیتے ہیں جیسے کسان اس کے ماے کا پتر ہے۔ لیکن جب کسان کی سوئی سے تشریف لال ہوتی ہے تو اس کے چودہ دونی اٹھائیس طبق روشن ہوجاتے ہیں۔ عقل مندوں کے لیے اس میں بے شمار اشارے ہیں۔ آج کل ویسے بھی ٹھینگوں کا زمانہ ہے۔ پرانے وقتوں میں جب چھوٹے کسی کو کسی کھانے کی چیز کے لیے ترساتے تو سامنے آ کر دوسرے بچوں کو للچاتے اور متاثرے بچے تاک میں بیٹھے بلوں کی طرح تاکتے اور تکتے رہتے۔ کبھی چاپلوسی سے کبھی پالش لگا کر حصہ بٹورنے پر آمادہ کرتے تھے لیکن وہ ڈھیٹ ٹھینگا دکھا جاتا اور یہ دل مسوس کر رہ جاتے تھے۔

ٹھینگا کسی کو چڑانے کے لیے ایسا خطرناک حربہ گردانا جاتا ہے جس پر affectee یعنی ''متاثرہ'' تاؤ کھا کر رہ جاتا ہے لیکن آج کل جس کو ٹھینگا نہ دکھایا جائے وہ الٹا خفا ہوجاتا ہے کہ ہم تو ہر Post نوشتۂ دیوار پر دل ہاتھ میں لے کر حاضر ہوجاتے ہیں لیکن اس خود پسند سے ایک ٹھینگے کی زحمت بھی نہیں ہوتی، کمنٹ یا تبصرہ تو دور کی بات ہے۔ اس لیے مخالف بھی friend list یا حلقۂ احباب سے نکلنے کی کرتا ہے یا اگر کہیں کسی پوسٹ پر تو تو میں میں ہوجاتی ہے تو سیدھے اینٹ کا جواب ''بلاک'' سے دے جاتا ہے۔ کچھ تو ہتھے سے اکھڑ جاتے ہیں اور Report رپٹ ہی لکھوا دیتے ہیں جبکہ اپنے followers حواریوں کو بھی ملا کر محاذ کھول دیتے ہیں جس سے لاسکی پہچان ID مٹانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگتا ہے۔ وہ بے چارا مفت میں نوشتۂ دیوار پڑھ لیتا ہے۔ اب وہ بھی تو ہاتھ پاؤں بندھے نہیں رہ سکتا اس لیے اپنے matuals ہمنواؤں سے ٹھونگے کا مطالبہ کرنا شروع کر دیتا ہے،

> ابن ملجم سے لے کر ابن زیاد تک تاریخ کے ہر دور میں طوطے زیرِ عتاب رہے ہیں۔طوطے کی ٹیں ٹیں کو صیاد کی شقاوت آمیز ناانصافیوں نے ٹائیں ٹائیں فش میں بدلنے کی جو مذموم کوششیں ہر عہد میں کی ہیں وہ تاریخ طیور کا ایک پرفشاں باب ہے۔اس تمام طوطا گردی کے پس پردہ ہوس چونچ و بال و پر کا عنصر دردانگیز نالوں کی صورت میں سنائی دیتا ہے۔
>
> طوطے از غلام شبیر رانا

اس طرح گلو خلاصی ہوتی ہے۔کتاب چہرہ facebook والا اس کو حصارِ امن Marked safe پر لا کر رحم فرماتا ہے۔

جس طرح Electable برساتی مینڈک بھی کہہ سکتے ہیں، پرانے پاپیوں کو ٹھینگا دکھا کر نئے پاپیوں کا friend request عرضیٔ یارانہ بھیج دیتے ہیں اور وہاں سے accepted شرف قبولیت کی مہر لگا کر سارے پاپ دھو کر دودھوں دھلا Approve واگزار کیا جاتا ہے۔ اِسی طرح بیان حلفی میں انگشتِ شہادت اٹھا کر حلف اٹھانے والے جھوٹوں کی ایک کھیپ تیار ہو جاتی ہے جو ملکی خزانے پر اس طرح ہاتھ صاف کر دیتے ہیں جیسے کوئی ماہر جاسوس جائے سرقہ سے اپنے finger prints سراغ صاف کرتا ہے. اس طرح پانچ سال عوامی mandate اظہار پسندیدگی کے نعرہ قلندری سے بیرونی خزانے بھر کر عوام کو ٹھینگا دکھا جاتے ہیں۔Intellectual صاحب بصیرت لاکھ ٹھونگے مارے لیکن بھینس کے آگے بین بجانے سے بھلا کیا ہوتا ہے۔

دفاتر میں شاہ کے ملازم بھی کاغذوں پر چند ٹونگے مار کر فرائض منصبی بہ طریقِ احسن نبھا جاتے ہیں کیونکہ اوپر ٹھونگا دینے والا اس سے دو ہاتھ آگے ہوتا ہے۔ بینک میں ایک لمبی قطار میں اپنی باری کے منتظر کچھوے کی چال چلتا ہوا جب کھڑکی پر پہنچتا ہے تو عقب میں ایک حور شمائل ٹھینگا دکھا کر باری لے جاتی ہے کیونکہ Ladies first مستور مقدم کے اصول جو یہاں آئینِ پاکستان کی طرح اپنی بھرپور قوت کے ساتھ نافذ ہیں۔

ٹھینگا پرانے وقتوں میں چڑانے کے لیے مستعمل تھا جس کا سیدھا مطلب یہ ہوتا کہ کروں گا جو دل چاہے اُکھاڑ سکتے ہو تو اُکھاڑ کے دکھا دو۔فی زمانہ گنگا واقعی الٹی بہہ رہی ہے۔اگر کسی کی واہیات بے تکیوں پر ٹھینگا نہ دکھایا جائے تو Inbox کے تخلیہ میں دھپ سے ٹھن ٹھنا ٹھن شروع کر کے باقاعدہ زعمِ دوستی جھاڑنے لگتے ہیں۔اب ایسے سینہ زوروں کو ہم بھلا کیا کہہ سکتے ہیں کہ خم ٹھونک کر غلط کو صحیح ثابت کرنے کے لیے تخت ست کا طعنہ بھی دے مارتے ہیں۔ارے یار اگر کوئی کلام یا نثر پارہ دل کے تار چھیڑے گا تو یاری دوستی کو ایک طرف رکھ کر خالص ادبی حس جگا کر وہ comment توصیف بے ریا کریں گے کہ نوآموزوں کو بھی مزید لکھنے کی تحریک مل جائے گی۔ہاں البتہ فدوی کو بلاوجہ کی منافقت سے ازحد چڑ ہے جو بعضوں کا خاصہ ہے۔غزل نظم نعت کا پہلا مصرع ابھی پڑھا نہیں کہ جے جے کار شروع ہو جاتی ہے۔وجہ سوائے اس کے کوئی نہیں کہ اس کی بے تکیوں کا بھرم رہے۔ظاہر ہے اگلا بھی اس مقولے پر ایمان رکھتا ہوگا کہ

من ترا حاجی بگویم تو مرا قاضی بگو

بعض ایسے بھی بزرجمہر ہوتے ہیں جو ہر جگہ ایک جیسا ٹانکا لگاتے پھرتے ہیں۔اب دیکھو ناں، کسی نے اطلاعاً عرض کرنے کی غرض سے اپنے والد بزرگوار کے وفات کی Post نوشتہ دیوار لگوائی ہی تھی کہ تک سے comment پر یک لفظی تبصرہ جھاڑ دیا ۔۔۔ماشاءاللہ۔

خدا کا خوف کرو یار، وہ دل کے پھپھولے پھوڑنے نہیں والد گرامی کا سوگ منانے، درد وغم بانٹنے اور دعا کی درخواست لے کر آیا ہے۔

گوہر رحمن گہر مردانوی کا تعلق ضلع مردان کی تحصیل تخت بھائی (لونڈ خوڑ) سے ہے۔سرکاری ملازم ہیں۔فنونِ لطیفہ سے خصوصی شغف رکھتے ہیں۔علاوہ ازیں شاعری اور مضمون نگاری بھی ان کے ابلاغ کے ذرائع ہیں۔مضامین میں لطافت اور طنز کا چھڑکاؤ ففٹی ففٹی ہوتا ہے۔''ارمغانِ ابتسام'' کے مستقل کرم فرما ہیں اور اس کے پڑھنے والوں کے لئے ہر ماہ باقاعدگی سے مرچ مصالحے کا اہتمام کرتے ہیں۔
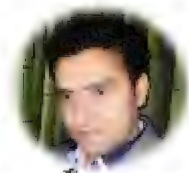
نادر خان سرِ گروہ

اشتہار برائے ضرورتِ رشتہ

میں آج آپ سے رشتے کی بات کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ میرا ہاتھ تھامے آخر تک ساتھ دیں گے۔ گھبرائیے مت! میں آپ سے دغا نہیں کروں گا، یہاں تک کہ مضمون اختتام کو پہنچے گا۔

اکثر یہ دیکھا ہے کہ ضرورتِ رشتہ کے اشتہارات میں لڑکی کے لیے جوڑ کی مانگ ہوتی ہے وہ زیادہ تر ڈاکٹر یا انجینیر کی ہی ہوتی ہے۔ کوئی یہ نہیں کہتا۔۔۔

''خوب صورت مع بناوٹی سیرت، پڑھی لکھی، امورِ خانہ اور کھانا داری میں ماہر، صوم و صلاۃ کی جبراً پابند۔۔۔ مختصراً یہ کہ۔۔۔ شادی کے دن تک Valid، دنیا بھر کی خوبیوں کی حامل

لڑکی کے لیے:

''خوش شکل'' اور ایماندار پولیس 'اہل' کار۔

''تعلیم یافتہ'' ٹیچر۔

''حاضر دماغ'' پروفیسر۔

گالیاں کھا کے بے مزا ہونے والا سیاستداں

''باعمل'' شاعر۔

یا

معاشرے کو آئینہ دکھانے کے ساتھ ساتھ، خود بھی آئینہ دیکھنے کا رَوادار ادیب کا رشتہ مطلوب ہے۔''

اِس کے علاوہ بھی بے شمار پیشے ایسے ہیں، جن سے رشتہ

آخر میں ہمیں چند احباب کا ذکر کر لینے دیں جو اس کتاب کے محاذ پر ہمارے دوش بدوش شریک جنگ رہے اور ذکر کرنا ہے ہمیں.....

☆ محمد اکرم کا جنھوں نے مسودہ ٹائپ کر کے ثابت کر دیا کہ بدخطی لاعلاج مرض نہیں۔

☆ ماجد صدیقی اور مونس زبیری کا جنھوں نے ٹائپ شدہ مسودے کی نہ صرف تصحیح کی بلکہ تزئین بھی کر دی۔

☆ کرنل شفیق الرحمٰن اور میجر سید ضمیر جعفری کا جو فوجی ادیبوں کے سالاروں میں سے ہیں اور جنھوں نے بکمال سپاہی پروری اس ریکروٹ کی بھی رہنمائی کی اور نہ صرف فون پر کتاب کی مزاج پرسی کرتے رہے بلکہ ایک دو مرتبہ بہ نفس نفیس اس کی نبض پر ہاتھ بھی رکھا اور از راہ اشک شوئی فرمایا کہ صحت بری نہیں۔

☆ اور عزیز قاری! آپ کا' جو پڑھتے پڑھتے یہاں تک پہنچ گئے ہیں' یہ اس بات کی علامت ہے کہ آپ کے پہلو میں ایک زندہ اور جوان دل ہے۔ میں نجومی تو نہیں' لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے لیے یہ سال اچھا ہے۔ **جنگ آمد از کرنل محمد خان**

جوڑنے میں لوگ عام طور پر (اشتہارات میں) دلچسپی نہیں دکھاتے۔ مگر مزے کی بات یہ ہے کہ اُن کی بھی شادی ہو ہی جاتی ہے۔ اور اکثر وقت سے پہلے ہو جاتی ہے۔۔۔ کیسے ہوتی ہے؟ کہاں ہوتی ہے؟ اور کون کر لیتا ہے اِن سے؟

سَر پکڑ کر سوچیے!

اور ہاں! اپنے اندر چھپے حاسد کو جگا کر یہ بھی سوچیے کہ۔۔۔ کیوں ہوتی ہے؟

جب مَیں نے ہائی اسکول پاس کیا (جی ہاں! مَیں نے ہی پاس کیا) تب کچھ ناکام بڑوں نے یہ مشورہ دیا کہ آگے کیا کرنا ہے، یہ طے کرنے سے قبل، زمانے کا چلن دیکھ لو۔ وہ اِس طرح کہ نوکری کے اشتہارات میں جس پیشے کی مانگ زیادہ ہو۔ پس اُسے بلا چون و چرا اختیار کر لو۔ یہ بات میرے دل کو ایسی لگی کہ مَیں اخبار بینی کے کام پر لگ گیا۔

لیکن اُن اشتہارات نے عجیب کشمکش میں مبتلا کر دیا۔ کسی روز مجھے ''ایسا'' بننے پر قائل کر رہے ہیں، تو کسی روز ''ویسا'' بننے پر مائل کر رہے ہیں۔ میرے بلند حوصلے کا قد۔۔۔ پست ہونے لگا۔ آنکھوں کے سامنے، گرجنے والے بادل چھانے لگے۔ ایسے میں ''مایوسی کفر ہے'' باور کرانے والے اشتہارات معاون ثابت ہوئے۔ جن کے توسط سے ''ضرورتِ رشتہ'' کے اشتہارات میں دلچسپی پیدا ہوئی اور تیزی سے پروان چڑھنے لگی۔ یعنی۔۔۔ نوکری کی بجائے ''شوہری'' کے مواقع کی تلاش۔ یہ ہماری قوم کے مزاج کے برعکس، قبل اَز وقت منصوبہ بندی تھی۔ ہم تو۔۔۔ بعد اَز وقت، ماضی میں لوٹ کر برآمد ہونے والے نتائج کی روشنی میں، کمالِ ہوشمندی و دانشمندی، حکمت و تدبر سے معکوس منصوبہ بندی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔

بات چلی تھی رشتے کی۔۔۔ ہوا یوں کہ ضرورتِ رشتہ کے سبز باغ میں چند روز سیر سپاٹے کے بعد شجرِ امید کے ''چاروں'' پتّے جھڑنے لگے۔ لڑکی کی مانگ بھرنے کی خاطر ایسی ایسی مانگیں۔۔۔ کہ مانگے تانگے اخبار پڑھنے والا پناہ مانگے۔ آخر تنگ آ کر یہ کوشش ترک کر دی اور مشہورِ زمانہ لومڑی کی طرح کھٹے دل سے یہ کہا ''یہ اشتہارات تو برائے ''ضرورتِ فرشتہ'' ہیں۔''

نادر خان سرگروہ کا تعلق نیو ممبئی، بھارت سے ہے تاہم برسہا برس سے بسلسلۂ روزگار سعودی عرب میں مقیم ہیں۔ لکھنے لکھانے کا سلسلہ کافی عرصہ سے شروع کر رکھا ہے۔ طنز و مزاح پر مبنی مضامین لکھنے میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں۔ اندازِ تحریر میں مزاح کی شگفتگی اور طنز کا ڈنک بھرپور طریقے سے موجود ہے۔ طنز و مزاح پر مبنی مضامین کی ایک کتاب ''با داب با محاورہ'' شائع ہو کر پڑھنے والوں سے دادو تحسین وصول کر چکی ہے۔ ''ارمغانِ ابتسام'' کے اوّلین لکھنے والوں میں شامل ہیں۔

اپنا گراں ہووے

ڈاکٹر عزیز فیصل

انیس برس قبل جب ہمارا تبادلہ کندیاں سے راولپنڈی ہوا تو اکثر احباب ہماری جدائی کے خیال سے رنجیدہ خاطر ہوگئے۔ ایک بے تکلف ترین دوست ہمیں روہانسی ہوکر کہنے لگے "جب سے سنا ہے کہ تو ہمارا شہر چھوڑ کے پنڈی جارہا ہے، دلی طور پر دکھ پہنچا ہے. تیرے اس طرح چلے جانے پر مجھ سے زیادہ کوئی بھی پریشان نہیں گا۔"

ہم نے ان کے تیرتے ہوئے اشکوں سے گھبرا کر کہا "یار تم اس جدائی پر سب سے زیادہ اس لئے دُکھی ہورہے ہو کہ تمھیں اس بات کا بخوبی اندازہ ہے کہ تمھاری عزت کرنے والا آخری آدمی بھی یہ شہر چھوڑ کر جارہا ہے۔"

دوستو اپنا آبائی گھر چھوڑ کر دوسرے شہر میں مستقل سکونت اختیار کرنا کوئی سہل کام نہیں۔ بڑے دل گردے کا کام ہے۔ اپنی دھرتی سے محبت ہر انسان کی روحانی مجبوری ہوتی ہے۔ ظاہر ہے بچپن کی معصومیت سے لے کر شباب کے فسانوں تک، سبھی کچھ آبائی فضا کی سکرین کے پردے پر موجود ہوتے ہیں اور انسان کو اپنے سحر میں تادم مرگ مبتلا رکھتے ہیں۔

گیتوں کی افادیت کے تو ہم اُسی دن قائل ہو گئے تھے جب قتل کے ایک زمیندار نے کہا تھا کہ عطا اللہ عیسیٰ خیلوی کے گیت سُن کر اُس کی بھینسیں زیادہ دودھ دینے لگی ہیں۔ بٹ پارے از محمد یونس بٹ

تجربہ کیے بغیر اپنے گاؤں سے ہجرت کا دکھ حقیقی طور پر سمجھ آ ہی نہیں سکتا۔ پنڈی آنے کے لیئے جب ہم اپنا بیگ اٹھائے والدۂ مرحومہ کو اللہ حافظ کہنے ان کے قدموں پر گرے تو سب دھاڑیں مار مار کر رونے لگ گئے۔ ہمارے بہن بھائی اور دیگر رشتہ دار بھی یہ غیر متوقع جذباتی منظر دیکھ کر آبدیدہ ہو گئے۔ آبائی گھر سے بسلسلہ روزگار کسی بڑے شہر کو ہجرت کرنا جراتمندانہ فیصلہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک المناک تجربہ بھی ہے۔ یہیں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دیارِ غیر میں ہونے والی ایسی ہجرت کتنی اشک آور ہمتوں کا خراج مانگتی ہوگی۔

کچھ لوگوں کو اپنے ''گراں'' سے ابنارمل حد تک محبت ہوتی ہے۔ ان کے ہاں اپنے ''گراں'' سے دوری کا تصور ہی دلدوز ہوتا ہے۔ یہ جذباتی لوگ ہوتے ہیں جو خود کو گاؤں کی بقا کا واحد ذمہ دار سمجھتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ اگر اتفاقاً بسلسلہ ملازمت و روزگار اپنے پنڈ سے دو چار میل دور چلے جائیں تو ان کے گھر والے انہیں سات سمندر پار جتنا پروٹوکول دینے لگتے ہیں۔ خدانخواستہ اگر ان کا مقام ملازمت اتنا دور ہو کہ انہیں وہیں شب بسری بھی کرنا پڑ جائے تو اس آزار کو سہہ کر یہ لوگ شاعر بن جانے سے بھی نہیں چوکتے۔ چنانچہ بھانت بھانت کے بے وزن اشعار اپنے تکیوں، ڈائریوں یا دیواروں پر لکھتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ آداب عرض نما رسالوں کی مستقل ریڈرشپ کا بیڑا اٹھا لیتے ہیں۔ ایسے دلچسپ شعرا خود کو باضابطہ طور پر پردیسی کہلوانے پر بھی بضد ہوتے ہیں اور بسا اوقات پردیسی، دکھی، زخمی، فراقی، اداس وغیرہ بطور تخلص اپنا لیتے ہیں۔ ان کے کلام میں وطن سے دوری اور کم از کم ایک سنگدل محبوب کے بارے میں متعدد اشعار مل جاتے ہیں جو بسوں اور ویگنوں کے پینٹروں میں بے حد مقبول ہوتے ہیں اور وہ ایسے دل جلوں کی ناجائز ادب پرستی کو گاؤں گاؤں پھیلا کر ادب اور پینٹنگ کا اجتماعی جنازہ نکالتے ہیں۔ گاؤں سے قدرے دور کسی دوسرے گاؤں میں رات گزارنے والے یہ دکھی افراد شام پڑتے ہی اپنے گراں کی یاد میں کئی دکھی گانے بھی گنگناتے بلکہ ہنہناتے ہیں۔ یہ گائیکی بھی انھی مسائل کے گرد گھومتی ہے جسے ان کی بے وزن شاعری بیان کر چکی ہوتی ہے۔

پنڈ کے پرانے بزرگ گاؤں سے شہر منتقل ہونے والوں کو بری نظر سے دیکھتے ہیں اور اسے حسن پرستی اور موج مستی کی سنجیدہ کاوش قرار دیتے ہیں۔ شہر کو بے حیا مہ جبینوں کا مرکز سمجھتے ہوئے بڑے بوڑھے شہر جانے والوں کو یقینی بدکردار سمجھتے ہیں اور انہیں فوری طور پر قابل سنگسار قرار دیتے ہیں۔ وہ دراصل اپنے علاقے سے ہجرت کو ایک سماجی برائی خیال کرتے ہیں۔ گاؤں کے ان پڑھ بزرگوں کی دانست میں اپنے گاؤں کے کنویں کی مینڈک ہونا بھی کم از کم ابن بطوطہ ہونے کے مترادف ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اپنے گراں کے جام جم سے بھی دنیا کا مشاہدہ ممکن ہے۔

ہمارے گراں کندیاں سے ایک سادہ لوح دوست، جو ریلوے میں ملازمت کرتے تھے، کا تبادلہ تیس چالیس دور کے گاؤں ماڑی انڈس میں ہو گیا۔ موصوف بہت پریشان ہوئے۔ ہر روز شام کو ماڑی انڈس ریلوے سٹیشن پر آ کر لاہور جانے والی گاڑی کو بہت حسرت بھری نظروں سے دیکھتے تھے اور یہ سوچا کرتے تھے کہ اس سے زیادہ خوش نصیب تو لاہور والی گاڑی کے سب پہیے ہیں جو روزانہ کندیاں سے ہو کر آتے ہیں۔

ڈاکٹر عزیز فیصل صاحب کا تعلق معلم کے پیشہ سے ہے اور ایک خاصے تگڑے منصب پر فائز ہیں۔ تعلیم کے مضمون میں ''پی ایچ ڈی'' کر رکھی ہے۔ طنز و مزاح کے دلدادہ ہیں اور نعت و حمد کے بعد صرف اور صرف طنز و مزاح پر مبنی شاعری سے شغل فرماتے ہیں اور ہر خاص و عام سے سوشل میڈیا پر ہر روز ڈھیروں داد پاتے ہیں۔ مزاحیہ شاعری کی ایک کتاب ''ہاسا خاصا'' شائع ہو چکی ہے۔ شاعری کے ساتھ ساتھ مزاحیہ مضمون نگاری میں بھی ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ ''ارمغانِ ابتسام'' کے دیرینہ کرمفرما ہیں۔

محمد اشفاق ایاز

نائب قاصد صاحب

میں نے مظہر شاہ کو دور سے ہی مسکراتے چہرے کے ساتھ دفتر داخل ہوتے دیکھ لیا تھا ''اللہ خیر کرے۔اس کا آج پھر بیوی سے جھگڑا ہوا ہوگا۔''

میں نے دل ہی دل میں سوچا۔مظہر شاہ دنیا کا واحد شخص تھا۔ جب بھی اس کا بیوی سے جھگڑا ہوتا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل جاتی۔ شائد کوئی حاسد اسے شیطانی مسکراہٹ کا نام دے، لیکن میں تو اسے ہمیشہ مستانی مسکراہٹ کہتا تھا۔وہ اپنی بیوی سے جھگڑا کر کے محظوظ ہوتا تھا۔

مظہر شاہ مین گیٹ سے اندر داخل ہوا، سائیکل کو ایک کونے میں کھڑا کیا۔اور ہنستا ہوا میرے کمرے میں آیا۔

''ماشاءاللہ۔آج پھر بیگم سے جھگڑا ہوا ہے؟''میں نے پوچھا۔میں نہ بھی پوچھتا تو وہ خود ہی بتا دیتا۔بات اس کے منہ سے اُبل کر باہر آیا ہی چاہتی تھی۔

''وہ جی کیا ہونا تھا۔میں ذرا دیر سے اٹھا۔دفتر کا وقت ہو رہا تھا۔میں نے کپڑے تبدیل کیے، بیگم سے کہا ناشتہ بنا دو۔ کہنے لگی اب خود بنا لو۔اتنی گرمی میں مجھ سے بار بار چولہا نہیں جلتا۔میں ذرا غصے میں بولا تو کہنے لگی خود دیر سے اٹھے ہو اب بھونکتے کیوں ہو۔ میں نے کہا گھر میں کتا جو نہیں ہے اس کی کمی پوری کر رہا ہوں۔ جوابی حملے سے بچنے کے لئے جلدی سے سائیکل اٹھایا اور دفتر بھاگ آیا''۔ وہ خود تو ہنس ہی رہا تھا۔آخری فقرہ سن کر میری بھی ہنسی چھوٹ گئی۔

یہ تھا ہمارا نائب قاصد مظہر حسین شاہ، جو قریبی گاؤں سے آیا کرتا تھا۔ اب وہ گاؤں کیا تھا۔شہر پھیلنے کی وجہ سے شہر کا ہی حصہ معلوم ہوتا تھا۔ نائب قاصد کو پہلے چپراسی کہا جاتا تھا۔ اور یہی عہدہ انگریز بہادر کے دور سے بطور یادگار چلا آرہا تھا۔حکومت نے جہاں دیگر انگریزی یادگاروں کے نام بدلے وہاں اس نے کچھ عہدوں میں بھی تبدیلی پیدا کی۔ان میں ایک چپراسی بھی تھا جسے اب نائب قاصد کا نام دیا گیا تھا۔تاہم عوام کو یہ جاننے میں

زیادہ دیر نہیں لگی کہ صرف عہدے کا نام تبدیل ہوا ہے۔ چپراسی والی حرکتیں اور برکتیں ویسی کی ویسی ہیں۔

دفتر میں دو مزید نائب قاصد بھی تھے۔ ایک کا نام رحمت اور دوسرے کا امین تھا۔ انہیں نوکری کرتے ایک عرصہ ہو چلا تھا۔ یہ صرف نام کے رحمت اور امین تھے جبکہ چھوٹے چھوٹے معاملات میں بھی یہ کمینگی کی ساری حدیں پار کر جاتے تھے۔

مظہر شاہ کو دفتر میں بھرتی ہوئے ایک سال سے بھی کم عرصہ ہوا تھا۔ لیکن اپنی خوش لباسی، خوش مزاجی اور خوش گفتاری کی وجہ سے جلد ہی سب میں گھل مل گیا۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ روزانہ صاف ستھرے اور کلف لگے کپڑے پہن کر آتا۔ چہرے پر نواب آف کالا باغ طرز کی مونچھیں بھی تھیں۔ اس کی ظاہری حالت سے یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ یہاں نائب قاصد ہے۔ ہر آنے والا یہی سمجھتا وہ دفتر میں کسی اچھی سیٹ پر تعینات بابو ہے۔ اس کی ایک نظر دفتر کے اندر کام کرنے والے بابوؤں پر اور دوسری مین گیٹ پر ہوتی۔ جونہی کوئی ڈھیلی ڈھالی ''اسامی'' دفتر میں داخل ہوتی۔ یہ فوراً اس کے پاس پہنچتا، اس کا حال احوال پوچھتا، بڑے احترام سے اسے ایک طرف بنچ پر بٹھاتا، پانی پیش کرتا اور مدعا پوچھتا۔

''جناب میں یہ کام ابھی کروا دیتا ہوں، میرے ہوتے فکر کس بات کی''۔ آنے والا ہر فکر سے آزاد ہو جاتا۔ پھر اپنی خوشی سے مظہر شاہ کو ''خوش'' کرتا۔ دوسرے دونوں نائب قاصد بڑی حسرت سے شکار کو قربان گاہ پہنچنے سے پہلے ہی قربان ہوتا دیکھتے تو ان میں جذبہ حسد پیدا ہونا فطری بات تھی۔

سائلوں کو پانی وغیرہ پیش کرنے کی عادت رمضان کے مہینے میں بھی جاری رہتی۔ خاص طور پر گرمیوں میں وہ روزہ داروں کو بھی پانی پلا دیتا۔ جونہی طویل مسافت اور گرمی سے بے حال سائل دفتر میں داخل ہوتا۔ وہ اسے اپنے مخصوص بنچ پر بٹھاتا اور ٹھنڈے پانی کا گلاس پیش کرتا۔ ٹھنڈے پانی کو سامنے دیکھ کر اکثر سائل بھول جاتے کہ ان کا روزہ ہے۔ کسی کو ایک گھونٹ بعد، کسی کو نصف گلاس اور کسی کو پورا گلاس خالی کرنے کے بعد یاد آتا کہ ان کا تو روزہ ہے۔ اس وقت مظہر شاہ اپنی ہنسی کو کنٹرول کر لیتا۔ پھر میرے کمرے میں آ کر خوب ہنستا۔ اور کہتا'' آج اتنے لوگوں کا روزہ تڑوایا ہے۔''

وہ گھر سے روزہ رکھ کر آیا کرتا تھا۔ تاہم عین دوپہر کے وقت تھوڑی دور ہسپتال کی کینٹین سے کھانا کھاتا، چائے پیتا، ایک دو سگریٹ سلگا کر اپنی نکوٹین پوری کرتا، اور منہ ایسے بنا کر گھر کی طرف جاتا جیسے روزے سے اس کی جان نکل جا رہی ہو۔

مظہر شاہ کی حاضر جوابی دفتر اور دفتر سے باہر بڑی مشہور تھی۔ بلدیاتی الیکشن کا زمانہ تھا۔ ایک شام اس کے دروازے پر دستک ہوئی۔ باہر نکل کر دیکھا کہ اس کی وارڈ کے امیدوار کونسلر اپنے دو تین خاص حواریوں کے ہمراہ دروازے پر کھڑے ہیں۔ مظہر شاہ فوراً بولا ''حضور آنے سے پہلے کسی کے ہاتھ دو چار ہار اور مٹھائی کا ٹوکرا ہی بھیج دیتے تاکہ میں آپ کا استقبال بھرپور طریقے سے کرتا''۔

امیدوار صاحب اس لفظی حملے کے لئے بالکل تیار نہ تھے۔ کوئی اور موقع ہوتا تو اس کے حواری اسے پھینٹی لگا دیتے۔ مگر موقع کی مناسبت سے اس حملے کو برداشت کرنا ضروری تھا۔ وہ لوگ کھسیانی ہنستے ہوئے آگے چل دیے۔

مظہر شاہ کا ایک سالا جرمنی چلا گیا۔ پانچ چھ سال بعد واپس لوٹا تو اس کے ساتھ ایک جرمن خاتون بھی تھی۔ دونوں سالا بہنوئی میں تقریباً ہم عمر ہونے کی وجہ سے بے تکلفی بھی تھی۔ ایک رات

ابا جی بتاتے ہیں کہ جب تم چھوٹے بچے تھے۔ ابھی نیا نیا ہی بولنا شروع کیا تھا۔ تمہاری عادت تھی تم کسی کو ''جی'' نہیں کہتے تھے۔ یعنی ابو جی ای جی نہیں کہا کرتے تھے کیونکہ تم برِصغیر کے کبیر ضدی بچے تھے۔ لیکن تم بھول گئے تھے کہ تمہاری اماں بھی برِصغیر کی ہی ہیں۔ اور انہوں نے برِصغیر کا آزمودہ ٹوٹکا استعمال کیا اور ہلکی پھلکی چھترول کے بعد تم ایسا جی جی کرنے لگے کہ جانوروں کو بھی مرغی جی اور بکری جی کہنے لگے۔

ارسلان بلوچ ارسل

مظہر شاہ نے اپنی بیگم کے حکم پر سالا صاحب کو مع جرمن خاتون اپنے گھر کھانے پر بلایا۔ اگر اسے سالا صاحب سے قیمتی تحفہ ملنے کی امید نہ ہوتی تو وہ کبھی اسے دعوت پر نہ بلاتا۔

کھانے کے دوران مظہر شاہ کو شرارت سوجھی بولا "یار تم جوان بھی ہو اور خوبصورت بھی۔ تم واپس جا کر دوسری میم کر لینا یہ یہیں میرے لئے چھوڑ جاؤ۔"

"یہ تمہارا رشتہ دار پاگل تو نہیں"۔ جرمن خاتون نے جب ٹھیٹھ اردو میں جواب دیا تو مظہر شاہ کی حاضر جوابی دم توڑ گئی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ خاتون اردو جانتی تھی۔

"بھابھی جی گزشتہ سال یہ دو ماہ پاگل خانے کا مہمان بھی رہ چکا ہے۔ میں اسے روزانہ پاگلوں والی دوائی نہ کھلاؤں تو یہ چند دن میں پورا پاگل ہو جائے۔" مظہر شاہ کی بیگم اپنے بھائی کی موجودگی میں کود کر بولی۔

جرمن خاتون خوف یا کسی اور وجہ سے دستر خوان سے ذرا پرے کھسک گئی۔ یہ زندگی میں پہلا موقع تھا کہ مظہر شاہ گنگ ہو کر رہ گیا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کا مذاق ایٹم بم بن کر اس کی شخصیت کے ناگاساکی کے چیتھڑے اڑا دے گا۔ وہ تو شکر ہوا کہ سالا صاحب اور جرمن خاتون جلد واپس چلے گئے ورنہ وہ خود اپنے ہاتھوں اسے پاگل خانے داخل کروا کر جاتے۔ ان کے جانے کے کئی ماہ بعد مظہر شاہ کے حواس بحال ہوئے تو اس نے بیگم سے پوچھا "تم نے کس سال مجھے پاگل خانے داخل کروایا تھا؟"۔

"میں نے تو مذاق کیا تھا۔" بیگم چہک کر بولی "تم مذاق کر سکتے ہو تو میں نہیں کر سکتی؟"

مظہر شاہ کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔

مظہر شاہ کی بیگم کو مسور کی کالی دال بڑی پسند تھی۔ ہر دوسرے تیسرے روز یہ دال اپنے سامنے دیکھ کر اس کا خون کھول اٹھتا۔ مگر بیگم کے ڈر سے بولتا بھی نہیں تھا۔ ایک دن اس کے من کی مراد پوری ہو گئی۔ ایک دن ایک حکیم صاحب دفتر تشریف لائے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ ان کی تیار کردہ گولیاں کھانے سے جسم میں توانائی کا خزانہ بھر جاتا ہے۔ مظہر شاہ بات اُلٹ کر ان سے پوچھنے لگا "حکیم صاحب آپ کی گولیوں سے زیادہ طاقت تو مسور کی کالی دال میں ہوتی ہے۔"

حکیم صاحب نے اس کے فوائد سے زیادہ نقصانات پر ایسا لیکچر دیا کہ مظہر شاہ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ دوسرے دن دفتر آ کر اس نے خوش خبری سنائی کہ مسور کی کالی دال سے چھٹکارا مل گیا ہے۔

"وہ کیسے؟" میں نے پوچھا۔

کہنے لگا "میں گھر گیا تو یہی دال پکی ہوئی تھی۔ جب بیگم نے دال والی رکابی میرے سامنے رکھی تو میں اسے پاس بٹھا کر غور سے دیکھنے لگا۔ وہ حیران ہو کر سبب پوچھنے لگی۔ میں نے کہا کہ گزشتہ ایک ہفتے سے آنکھوں کے سامنے دھندسی آ رہی تھی۔ میں آنکھوں کے ڈاکٹر کے پاس گیا۔ تو اس نے بتایا کہ مسور کی کالی دال

پنجابی کی ایک پرانی مثل تو آپ نے سن رکھی ہوگی۔ "جیہڑے ایتھے بھیڑے (بُرے) اولہور (لاہور) وی بھیڑے۔" یعنی جو یہاں پر بُرے ہیں وہ لاہور جا کر بھی بُرے ہی ہیں۔ مکمل تحقیق کے بعد اسے غلط ثابت کرنے جا رہا ہوں۔

پچھلے سال انہیں دنوں ہمارے پاس میانوالی کے ایک نواحی گاؤں میں روڈ کا پراجیکٹ تھا۔ ہم کام کاج سے فارغ ہو کے رات نو دس بجے گھر آتے اور کھانا وغیرہ کھا کے گیارہ ساڑھے گیارہ بجے تک سو جایا کرتے تھے۔ وہاں گاؤں کے لوگ کہتے تھے کہ یہ لڑکے بہت لچے اور آوارہ ہیں، آدھی آدھی رات گھر آتے ہیں اور دیر تک شور شرابا کرتے رہتے ہیں جبکہ آج کل ہم لاہور میں کام کر رہے ہیں اور وہی روٹین کے مطابق لگ بھگ نو، دس بجے کام سے واپس آتے ہیں اور حسبِ معمول گیارہ بارہ بجے تک سو جاتے ہیں۔ یہاں کے محلے دار کہتے ہیں بڑے ہی شریف بچے ہیں۔ جی ٹائم سے آتے ہیں اور ٹائم سے سو جاتے ہیں۔

ارسلان بلوچ ارسل

کھانے سے انسان کی بینائی آہستہ آہستہ ختم ہوتی جاتی ہے۔آج دال کھانے سے پہلے میں تمہیں جی بھر کر دیکھنا چاہتا ہوں مبادا میں بالکل ہی اندھا ہو جاؤں۔اور تیرا مکھڑا پھر نہ دیکھ سکوں۔''

یہ اس کی زندگی کا پہلا موقع تھا جب بیگم کو اس پر ترس آ گیا۔اور مسور کی کالی دال دوسرے تیسرے روز پکنے کی بجائے مہینے میں ایک بار پکنے لگی۔

مظہر شاہ کو سگریٹ پینے کی بھی عادت تھی۔مگر اس کی بیگم کو اس عادت سے نفرت تھی۔مظہر شاہ دفتر کے اوقات میں اپنی نکوٹین پوری کرتا رہتا۔اتنا سمجھدار اور عقلمند تھا کہ اس نے ٹوتھ پیسٹ دفتر میں ہی رکھی ہوئی تھی۔ جاتے ہوئے دانت ضرور صاف کرتا۔اگر کہیں غلطی سے ایسے ہی چلا جاتا یا سگریٹ کی بو آ رہی ہوتی۔بیگم استفسار کرتی تو کہتا ''بی بی، راستے میں گاڑیوں کا دھواں ہی اتنا تھا۔ایک جگہ پھنس گیا تھا سارا دھواں کپڑوں کو لگ گیا۔''

''مگر بُو تو تمہارے منہ سے آ رہی ہے!'' بیگم پوچھتی۔

''بی بی، رش میں ویسے ہی سانس بند ہو رہی ہوتی ہے۔اگر دھواں سانس کے رستے اندر چلا جائے اور منہ میں اٹک جائے تو اس میں میرا کیا قصور؟''

بیگم کی تسلی ہوتی یا نہیں۔لیکن وہ خاموش ہو جاتی۔ایک دن وہ گھر جانے لگا تو رحمت نائب قاصد نے سگریٹوں کے ٹوٹے اکٹھے کئے، انہیں ایک ڈبیہ میں رکھا اور چپکے سے مظہر شاہ کی بغلی جیب میں ڈال دیا۔مظہر شاہ کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس کے ساتھ ایسا ظلم بھی ہو سکتا ہے۔جب وہ گھر گیا اور قمیض اتارنے لگا تو اسے بغلی جیب بھاری محسوس ہوئی۔بیگم پاس ہی کھڑی تھی۔ مظہر شاہ نے جیب میں ہاتھ مارا تو وہاں سگریٹ کی ڈبیا تھی۔بیگم نے ہاتھ مار کر وہ اپنے قبضے میں لے لی۔کھول کر دیکھا تو سگریٹوں کے ٹوٹے۔

''اچھا تو اب سڑکوں سے سگریٹ کے ٹوٹے اکٹھے کرتے رہتے ہو۔یہ ہے اس گھر میں میری عزت۔کسی واقف نے دیکھ لیا تو؟ میں نہیں رہتی اس نیچ گھر میں!!''

بیگم کی آواز میں غصہ بھی تھا اور دکھ بھی۔وہ دوسرے کمرے میں گئی اور برقعہ اٹھا لائی ''میں چلی اپنی اماں کو دکھانے کہ اس کا لاڈلا بھانجا اب سڑکوں سے سگریٹ اکٹھا کر کے پیتا ہے۔''

مظہر شاہ جو جیب سے ڈبیا نکلنے پر پہلے ہی حواس کھو بیٹھا تھا، فوراً زمین پر لیٹ گیا اور بیگم کے پاؤں پکڑ کر پیروں فقیروں پنجتن پاک کے واسطے دے کر یقین دلانے لگا کہ یہ ڈبیا کسی نے شرارت سے اس کی جیب میں رکھی ہے۔یہ مصیبت بڑی مشکل سے ٹلی۔

مظہر شاہ کو پکا یقین تھا کہ یہ شرارت رحمت یا امین کی ہے۔ لیکن امین اس دن چھٹی پر تھا۔تو گویا یہ رحمت کی مہربانی تھی۔

دوسرے دن مظہر شاہ دفتر آیا تو اس نے یہ محسوس ہی نہ ہونے دیا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ اس نے چپکے سے بڑے صاحب کے پانی والے گلاس کے پیندے میں ہلکا سا صابن لگا دیا۔ رحمت ہی صاحب کے گلاس میں پانی بھر کر رکھا کرتا تھا۔ اس دن بھی اس نے پانی کا گلاس رکھا تو تھوڑی دیر بعد پانی کی سطح پر تین چار جھاگ کے بلبلے نمودار ہو گئے۔ صاحب بہادر جب پانی پینے لگے تو بلبلے دیکھ کر طیش میں آ گئے۔ رحمت، امین اور مظہر شاہ کو بلایا گیا۔ پتہ چلا رحمت نے پانی رکھا تھا۔ مظہر شاہ اسی انتظار میں تھا فوراً بولا ''سر، میں پہلے بھی کہنے والا تھا۔ رحمت جب بھی کسی کو پانی دیتا ہے اس میں تھوک کر دیتا ہے۔''

رحمت صفائیاں ہی پیش کرتا رہ گیا۔ اس کی نوکری تو نہ گئی۔ سزا کے طور پر اس کی دو ماہ کی تنخواہ دفتر کے خاکروب کو دینے کا حکم سنا دیا گیا۔ رحمت کو بھی پتہ چل گیا کہ مظہر شاہ نے سگریٹ کی ڈبیا کا بدلہ لیا ہے۔ لیکن اپنے اپنے محاذ پر دونوں خاموش رہے۔ ان میں اتنی ہمت نہ ہوئی کہ اس کا ذکر کسی دوسرے سے کریں۔

ہمارے دفتر کے بیرونی دیوار کے ایک کونے میں چھوٹی سی کینٹین تھی، جہاں سے دفتر کو اور اردگرد کے ٹھرکیوں کو چائے اور ٹھنڈے مشروبات پلائے جاتے تھے۔ اُنہی دنوں حکومت نے اعلان کی کہ سرکاری دفتروں میں ظہر کی نماز پڑھائی جایا کرے گی۔ مظہر شاہ پہلے ہی دن بڑا خوش تھا، وہ اس دن پچھلی صف میں کھڑا ہوا تھا۔ اگلی صف میں کینٹین کا مالک بھی شامل ہو گیا۔ نماز ختم ہوئی تو میں واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔ جب دراز کھولی تو اس میں فروٹ کیک اور چند بسکٹ پڑے تھے۔ سوچا اللہ کریم نے اس نماز کا انعام اس دنیا میں ہی دے دیا ہے۔ ابھی میں اپنے ساتھی بابو سے اس بارے میں کہنے ہی والا تھا کہ مظہر شاہ تیزی سے اندر داخل ہوا اور ہاتھ کے اشارے سے چپ رہنے کا کہا۔ میں بڑا حیران ہوا۔ کچھ دیر بعد جب تمام عملہ اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھ گیا۔ تو مظہر شاہ آیا، کیک اور بسکٹ اپنے تھیلے میں ڈالے اور اسے ریکارڈ رجسٹروں والی الماری میں رکھ دیا۔ یہ سلسلہ چند دن چلتا رہا۔ ہر نماز کے بعد میری دراز سے کھانے پینے کی چیزیں برآمد ہوتیں۔ جنہیں مظہر شاہ اپنے تھیلے میں منتقل کر کے اپنے گھر لے جاتا۔ یہ سوچ سوچ کر میرا دماغ آدھا گھس گیا کہ یہ چیزیں میری دراز میں آتی کہاں سے ہیں۔ ابھی اس معمے کو رواں ہوئے ہفتہ دس دن ہی ہوئے تھے کہ ایک روز نماز ظہر کے دوران ہی کینٹین سے شور کی آواز سنائی دی۔ ہم جلدی سے جائے وقوعہ پر پہنچے۔ میری دراز سے برآمد ہونے والے بسکٹوں، ٹافیوں، لکس صابن کی ٹکیوں وغیرہ کا معمہ حل ہو چکا تھا۔ مظہر شاہ موقع پر پکڑا گیا تھا۔ ہوتا یوں تھا کہ جونہی کینٹین کا مالک اگلی صف میں نماز پڑھ رہا ہوتا۔ مظہر شاہ پیچھے سے کھسک کر کینٹین پہنچ جاتا، جو ہاتھ لگتا اسے بڑی تیزی سے لا کر میری دراز میں رکھ دیتا۔ جہاں کسی کو شک ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ برا ہو محلے کی تندور والی مائی کا۔ اس نے مظہر شاہ کو کاروائی کرتے دیکھ لیا تھا۔ وہ اس وقت تو کچھ نہ بولی بلکہ کینٹین کے مالک کو بتا دیا۔ اس دن وہ نماز پڑھنے کی نیت سے اگلی صف میں کھڑا نہیں ہوا تھا۔ اس انتظار میں تھا کہ مظہر شاہ نماز ادھوری چھوڑ کر باہر نکلے تو اسے پکڑے۔ جونہی فرض نماز شروع ہوئی مظہر شاہ تیزی سے نکلا۔ کینٹین کا مالک اسی تاک میں تھا۔ وہ بھی ننگے پاؤں اس کے پیچھے نکلا۔ جونہی مظہر شاہ نے بسکٹوں والے خانے میں ہاتھ ڈالا، کینٹین کے مالک نے وہیں پکڑ لیا۔ پھر اس کے بعد جو ہوا، مظہر شاہ اگر اسے اپنی تھوڑی سی بھی بے عزتی محسوس کرتا تو نوکری چھوڑ کر بھاگ جاتا لیکن وہ بھی پکا نائب قاصد بن چکا تھا۔ دوسرے دن وہ اُسی کینٹین سے چائے لے کر ایسے آ رہا تھا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ بعد میں پتہ چلا اس نے کینٹین والے کو کچھ ادائیگی کر دی ہے۔

محمد اشفاق ایاز کا تعلق جلالپور جٹاں (گجرات) سے ہے۔ اُردو اور پنجابی میں لکھتے ہیں۔ سنجیدہ نثر نگاری کا سفر پاکستان کے مختلف جرائد و اخبارات سے ہوتا ہوا ماہنامہ ''چاند'' اور ''زیر لب'' میں مزاحیہ نثر نگاری تک جا پہنچا۔ انگریزی تحریروں کو اُردو میں بھی منتقل کیا۔ افسانے بھی تخلیق کئے۔ موڈ اچھا ہو تو شاعری میں بھی لفظ جوڑ لیتے ہیں۔ ویب سائٹ vojpj.com کے ایڈیٹر ہیں۔

مراد علی شاہد

روٹی کھل گئی جے۔۔۔

گگو منڈی سے میں دو حوالوں سے متعارف ہوا، ایک فاسٹ باؤلر عرفان اور دوسرا میرے دوست جاوید رضا کی شادی۔ جاوید کی شادی گگو منڈی سے میری پہلی شناسائی تھی۔ اور اس شادی کی ہر بات اور ہر ہر کردار نرالا تھا۔ ماسوا دلہا میاں کے مجھے اہلِ محلّہ ''جوج ماجوج'' اس لئے لگ رہا تھا کہ سب رشتہ دار اور اہلِ محلّہ عین اس وقت مع چھ سات بچوں کے آن دھمکتے جب روٹی کھل چکی ہوتی۔ نہ جانے ان لوگوں نے کون سے زگوتا جن پال رکھے تھے جو انہیں بر وقت مطلع کر دیتے کہ تیار ہو جاؤ روٹی کھلنے والی ہے۔ یہ لوگ خوب سیر ہو کر بلکہ ''سیروں'' کے حساب سے کھاتے، کچھ ساتھ، اپنی بیویوں کے لئے شاپر میں ڈالتے، ہاتھ دھوتے، خلال کرتے کرتے نو دو گیارہ ہو جاتے۔

بارات کے دن جس کار میں میری ایڈجسٹمنٹ کی گئی اس میں دُلہا کا بھائی، میں اور ایک تیسرا شخص تھا جو واحد باراتی تھا جس نے میرے علاوہ ٹائی سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کی ظاہری ہیئت دیکھتے ہی ایک سکون سا محسوس ہوا اور ٹھنڈا سانس لیا کہ چلو سفر اچھا

گزرے گا، کیونکہ بظاہر یہ شخص پڑھا لکھا اور سلجھا سا دکھائی دے رہا تھا۔ حقیقت بھی یہی تھی کہ جناب گگو منڈی میں رہائش پزیر تھے مگر فارغ التحصیل اور ''فارغ البال'' ساہیوال سے تھے۔ جناب کا فرمان تھا کہ ساہیوال نے مجھے ڈگری تو دی مگر سر کے بالوں سے فارغ کر دیا۔ ''فارغ البال'' (بالوں سے محروم) ہونے پر وہ اس لئے خوش تھا کہ شیمپو، کنگھی، اور تیل کا خرچہ تو بچتا ہی ہے، ''جوؤں'' کی پناہ گاہ (بال) بھی ویران وسنسان ہو گئی ہے کہ اب اگر میرے تھوڑے سے بقیہ بالوں میں کبھی اتفاق سے ''جوں'' پڑ بھی گئی تو سخت گرمی میں بالوں سے نکل کر ٹنڈ کی جانب سفر ہو تو گرم ٹنڈ پر اس کا وہی حال ہوتا ہے جو گرم مشین میں پاپ کارن کا ہوتا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے پاپ کارن پھٹک سے پیالے سے باہر گرتی ہے کچھ ایسے ہی جوں ٹنڈ سے پھنک سے زمین پر گرتی ہے۔۔۔ خیر دورانِ سفر اخلاقیات سے سائنس تک خوب خوب بحث و مباحثہ چلتا رہا، موصوف کے علمی حافظہ میں کافی کتابیں ہضم ہو کر علمی بحث کی صورت میں ڈکار لے رہی تھیں۔ تاہم علمی ڈکار کا پول اس وقت کھلا جب سرکار کھانا کھانے کے بعد فاتحانہ انداز میں لمبے لمبے بدہضمی کے ڈکار لے رہے تھے۔ یہ بات آپ کے بھی علم میں ہوگی کہ نکاح کے بعد دُلہا کو صرف دلہن کے دیدار کی طلب ہوتی ہے اور باراتیوں کو لڑکی والوں کی طرف سے اس ایک خاص شخص کی جو اچانک سے پنڈال میں آ کر ایک آواز لگاتا ہے کہ

''روٹی کھل گئی جے''

میں اور مسٹر اخلاقیات (جو بعد ازاں میں میری خام خیالی ثابت ہوئی) تمام باراتیوں سے الگ تھلگ ایک رنگین چارپائی پر بیٹھے معاشرہ کے سماجی رویوں پر، بہت ہی اہم نکتہ پر بحث کر رہے تھے کہ اچانک ایک آواز ہماری سماعتوں سے ٹکرائی۔۔۔

''روٹی کھل گئی جے''

یونہی دائیں پہلو مسٹر اخلاقیات کو بتانے کے لئے مڑا کہ ذرا لوگوں کا رش کم ہوتا ہے تو ہم آرام سے پنڈال میں جائیں گے، روٹی کون سی ختم ہو جانی ہے۔ مگر موصوف اپنی جگہ سے غائب اور

کیوں دیکھتے ہی شکل ہوئی رشکِ بط میاں
خطاط کا ہے، میرا نہیں ہے یہ خط میاں
ریوالور کی نعل
رکھے گی جی بحال
اب دیکھتا ہوں کیسے پڑھو گے غلط میاں

نوید ظفر کیانی

ہال میں جانے والی لائن میں سب سے آگے کھڑے پائے گئے۔ اس کے بعد ان چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ کھانا کھانے کے بعد جب ملاقات ہوئی تو جناب کا حلیہ ملاحظہ کیجئے گا کہ ٹائی گلے کی بجائے سر کے اردگرد لپیٹ رکھی تھی بلکہ ٹائٹ کر کے باندھ رکھی تھی زیادہ مناسب رہے گا، چہرہ پسینہ سے شرابور، کوٹ دو تہوں میں دائیں کندھے پر تقریباً لٹک رہا تھا، کھا کھا کے اتنا برا حال تھا کہ اندازہ کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ جناب آ رہے ہیں یا جا رہے ہیں، دونوں آستیں شوربے کی پلیٹ میں سجدہ ریز ہونے کی وجہ سے گھی کی چکنائی سے افغانستان کا مکمل نقشہ پیش کر رہی تھیں۔ بلکہ دائیں آستیں سے تولیہ کا کام لیتے ہوئے بار بار منہ کا پسینہ پونچھنے سے اچھی بھلی کاٹن کو ''لیدر'' leather کا بنا دیا ہوا تھا۔ ملتے ہی الٹا مجھ پر برس پڑے کہ کہاں رہ گئے تھے میں کب سے تلاش کر رہا تھا۔ حالانکہ ہر تھال میں سے اچھی اچھی بوٹیاں تلاش کرتے میں نے انہیں خود کئی بار دیکھا اور دیکھا انہوں نے بھی تھا بس جان بوجھ کے آنکھیں چرا لیں کہ کہیں چوری نہ پکڑی جائے۔ اس دن مجھے

اندازہ ہوا کہ اگر کسی کی خاندانی امارت واخلاقیات کا اندازہ لگانا مقصود ہو تو کسی تقریب میں اپنے کھاتے سے لے جائیں اور اس آواز کا انتظار کریں کہ "روٹی کھل گئی جے" دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔

مرد حضرات ہی اس جرمِ ضعیفی کا شکار نہیں ہوتے بلکہ خواتین بھی برابر کی شریکِ جرم ہوتی ہیں۔ روٹی کھلنے کی آواز پر خواتین کی طرف کا منظر دیدنی ہوتا ہے۔ بچہ گود میں، ایک ہاتھ سے شلوار کو مضبوطی سے تھاما ہوا جس کا کونا دوسرا بچے نے پکڑا ہوتا ہے، (بچہ اس خبر سے لاعلم ہوتا ہے کہ ماما نے ازار بند نہیں الاسٹک پہن رکھی ہے)، دوسرے ہاتھ سے اگلی عورت کے دوپٹے کے کونے کو مضبوطی سے کھینچتے اور دھکیلتے، سب سے پہلے پنڈال میں جانے کی تگ ودو میں بازی لے جانے کی کوشش میں لگی ہوتی ہیں۔ اصل سین اس وقت شروع ہوتا ہے جب کوئی خاتون پلیٹ ہاتھ میں تھامے بغیر چمچ ہی چاول، کھیر، سالن ایک ہی تھالی میں جمع کر رہی ہوتی ہیں کہ شائد اس کے بعد کھانا ختم ہی نہ ہو جائے۔ قصور محض خواتین کا بھی نہیں ہے ایک تو ان کی باری مردوں کے بعد اس وقت آتی ہے، اُس وقت جب بھوک سے اُن کا برا حال ہو رہا ہوتا ہے، اور اس چکر میں ہر بچے کو دو تین بار دبا کے مار بھی چکی ہوتی ہیں۔ دوسرا بچوں کی ریں ریں، میک اپ کا عذاب، اور گرمی کی شدت اور بھوک سے برا حال، ایسے میں کسے یاد رہتا ہے کہ جس بچے کو وہ انگلی سے لگائے پنڈال کی طرف جا رہی ہے وہ اس کا اپنا ہی ہے یا کسی اور کا پکڑ لائی ہے۔ اوپر سے سورج کی گرمی، سالن کی حدّت سے چہرہ کا میک اپ پگھل پگھل کر ایسی دھاری دار زیبرا کی شکل بناتی ہے کہ پنڈال کے باہر اپنا خاوند اپنی سی زنانی سے پوچھ رہا ہوتا ہے کہ "آنٹی یہاں کہیں میری بیگم کو تو نہیں دیکھا" وہ تو بیگم کی آواز سے تسلی ہوتی ہے جب وہ گرج دار آواز میں دھاڑتی ہے "تم گھر چلو تمہیں میں پوچھتی ہوں"۔

اب ذرا مرد حضرات کا سین ملاحظہ فرمالیں کہ روٹی کھلنے کی آواز سے پیدا ہونے والی بھاگم بھاگ میں کچھ حضرات کی اپنی "دھوتی" اپنے ہی پاؤں تلے آ کر کھل جاتی ہے۔ نفسا نفسی کا عالم نہ ہوتا تو دھوتی کھلنے کا "میلہ" ہر شوقین / شوقن رک رک کر دیکھتا۔ یقین جانئے شادی بیاہ میں روٹی کھلتے ہی کسی کی باچھیں تو کسی کی دھوتی کھل کھل جاتی ہیں۔ وہ تو بھلا ہو ازار بند اور بیلٹ کا کہ شلوار اور پینٹ کو قابو میں رکھا ہوا ہے ورنہ اس حمام میں سبھی ننگے ہوتے۔ اگر آپ بھی چاہتے ہو کہ اس حمام میں ننگے نہ ہوں تو جب کبھی دعوتِ ولیمہ پر جائیں ازار بند اور بیلٹ کو مضبوطی سے باندھ کر جائیں تا کہ روٹی کھلنے کی آواز پر ریس لگانے میں آسانی رہے۔

مراد علی شاہد صاحب کا بنیادی طور پر تعلق کمالیہ (پاکستان) سے ہے جبکہ سترہ برسوں سے بسلسلۂ روزگار قطر میں مقیم ہیں اور ایک پاکستانی کالج میں بطور صدر "شعبۂ پاکستان اسٹڈیز" فرائض منصبی ادا کر رہے ہیں۔ پسندیدہ اصناف افسانہ نگاری اور طنز و مزاح ہے۔ "قندِ شیریں" کے عنوان سے کالم نگاری کرتے ہیں جو ایک موقر اخبار میں تواتر سے شائع ہو رہا ہے۔ فکاہیانہ و انشائیانہ اندازِ تحریر میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں۔ "ارمغانِ ابتسام" میں خاصی مستقل مزاجی سے لکھ رہے ہیں۔

ایک ایسا ہی خدمت کا مارا انسان اسی طرح ہائی وے پر گاڑی چلا رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ ایک ادھیڑ عمر آدمی بھاگا جا رہا ہے اور تین بھونکتے ہوئے کتے اس کا پیچھا کر رہے ہیں۔ قریب تھا کہ وہ اسے پھاڑ کھاتے لیکن کار والے نے گاڑی روک کر پسنجر سیٹ کا دروازہ کھولا اور چلایا "جلدی سے اندر آ جاؤ"۔ "شکریہ" وہ آدمی ہانپتے ہوئے بولا "آج کل کون کسی کو تین کتوں کے ساتھ کار میں لفٹ دیتا ہے۔" کتے آرام سے پچھلی سیٹوں پر براجمان ہو گئے۔

پہاڑ تلے از ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی

شوہر آشوب

شادی سے پہلے تھا وہ اک عالم میں انتخاب
تھے مسئلے نہ گھر کے نہ کچھ روزگار کے
بیگم کی خواہشوں نے کیا نیم جاں اسے
آثار اب ہیں چہرے پہ اجڑے دیار کے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

موٹاپا

مٹاپے کے لئے تھوڑی سی سرجری کم ہے
گھٹانے کے لئے اس حجم کو صدی کم ہے
جو غور کیجیے لگتا ہے اس طرح مظہر
کہ اس میں توند زیادہ ہے، آدمی کم ہے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

وائف آئی ہے

بیگم میکے بھیج کے ہم نے دوستوں کو دی دعوت
کہا کہ فلمیں دیکھو نیٹ ہے وائی فائی ہے
دروازے پہ شور اٹھا تو ہم نے پوچھا کیا ہے
وہ چلا کر بولے تیری وائف آئی ہے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

سیاسی جوتم پیزاری

جوتوں میں یہاں دال کو بٹتے ہوئے دیکھا
ایسی کہیں دیکھی نہ تھی ہم نے تو رذالت
اے پاک وطن سب نے کیا ہے تجھے ناپاک
جوتوں کی سیاست ہو کہ بوٹوں کی سیاست

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

پُرسش

جب بھی ملتے ہیں نام پوچھتے ہیں
لوگ میرا مقام پوچھتے ہیں
شیو کس سے کراتے ہو محسنؔ
مجھ سے اکثر حجام پوچھتے ہیں

حافظ مظفر محسن

کاف گاف

انگریزی پڑھنی تھی مشکل
"کے جی" میں تھے وہ افسردہ
پھولؔ! وہ بولے رُک رُک کر یہ
کاف سے کڈنی، گاف سے گردہ

تنویر پھولؔ

ٹین پرسنٹ مع اڈّی

دس پرسنٹ اب کہلائیں دو سو پرسنٹ
"ای سی ایل" اڈّی پر بھی نافذ ہے میاں!
چور اور ڈاکو پکڑے جائیں گے سارے
کب تک خیر منائے گی بکرے کی ماں

تنویر پھولؔ

بِلّے کا حج

کالا بِلّا مونچھوں والا
نو سو چوہے کھا کر "حاجی"
جاؤ ہوائی اڈّے تک، ہو
افضل حج، کہتا ہے پاجی!

تنویر پھولؔ

چور اور ڈاکو

ناگ بن کر وہ معیشت کو سدا ڈستے رہے
قوم جائے بھاڑ میں، نسلیں کریں ان کی مزا
جو بڑے مجرم ہیں، عبرت کا نمونہ وہ بنیں
چور تو پکڑے گئے، ڈاکو کو کب ہوگی سزا؟

تنویر پھولؔ

چڑیا گھر

ہر درندے کو اب پکڑنا ہے
شیر پنجرے میں قید ہے یارو!
چڑیا گھر کی بڑھاؤ آبادی
ریچھ کو جلد تم یہاں لاؤ

تنویر پھولؔ

دادی واری

چور جو ہے، وہ تو ''چُوری'' کھائے گا
گود میں لے کر تمہیں میں جاؤں گی
کہہ رہی ہیں دادیٔ مریم نواز
جیل میں جاؤں گی ''جیلی'' کھاؤں گی

تنویر پھول

احتساب

فریاد کر رہا ہے وطن اہلِ داد سے
آتی ہے مُلکِ طالبِ انصاف کی صدا
جتنے کرپٹ لوگ ہیں، سب کا ہوا احتساب
شرجیل اور عذیر کے قصے کا کیا ہُوا؟

تنویر پھول

ارے!

بھاؤ بکرے کے سنے تو یک بیک
جھرجھرا کر رہ گئے سب دست و پے
ہوش کر ظالم ترا گاہک ہوں میں
کھال بکروں کی اُتاری جاتی ہے

نوید ظفر کیانی

علموں بس!

المیہ کہ بندہ ایم۔اے کر کے بھی
نوکری کے واسطے بے چین ہے
جس نے علموں بس کیا انٹر کے بعد
آج اِک مشہور بزنس مین ہے

نوید ظفر کیانی

ثبوت

بے سبب لڑتے جھگڑنے کا مزا ختم ہوا
آج سے معرکے ہوں گے بحوالۂ ثبوت
مل گئے خفیہ درازوں سے مری بیگم کو
''چند تصویرِ بتاں، چند حسینوں کے خطوط''

نوید ظفر کیانی

کرنے کا کام

سوچیئے کہ خود انحصاری ہے کیا؟
دیکھئے ملکی معیشت کی حیات
کیجئے غیرت کا چھڑکاؤ ظفر
پایئے امریکی سنڈی سے نجات

نوید ظفر کیانی

ڈاکٹر مجیب ظفر انوار حمیدی

انور مسعود کی طنزیہ و مزاحیہ پنجابی نظم ۔ ایک اجمالی خاکہ

قیام پاکستان کے بعد دیگر صوبوں کی نسبت پنجاب میں اُردو اور انگریزی زبانوں نے ہر میدان میں اپنے قدم مضبوطی سے جمائے۔ پنجابی زبان کو ابتدائی نصاب تعلیم کا حصہ بنانے سے دانستہ گریز کیا گیا، یہی وجہ ہے کہ پنجابی ادب سے پنجاب کے عوام اب تک شناسائی پیدا نہیں کر سکے۔ عوامی سطح پر صرف مشاہیر کے چند شاہ کار مثلاً ہیر وارث شاہ، سیف الملوک وغیرہ ہی کو پنجابی ادب سمجھا جاتا ہے۔ بدقسمتی سے پاکستان کا کلی اختیار کالے انگریزوں کے ہاتھوں میں رہا جن کی نسلیں انگریزی اداروں سے فارغ التحصیل ہوئیں اور اس نا اہل حکمران طبقے کی تقلید میں عوام نے بھی دیسی انگریزی مدارس کا رُخ کیا جہاں سے نکلنے والی طلبہ کی کھیپ آدھا تیتر آدھا بٹیر کی مانند ہے۔ ایسے وقت میں جس شاعر کی پنجابی شاعری کو سارے پاکستان میں بالعموم اور پنجاب میں بالخصوص توجہ سے سنا اور سمجھا گیا وہ انور مسعود ہے۔ ان کی نظمیں اور اشعار زبانِ زد خاص و عام ہیں۔

انور مسعود کا پہلا پنجابی شعری مجموعہ ''میلہ اکھیاں دا'' ۱۹۷۴ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اس مجموعے میں پنجاب کی ثقافت کا رنگ گہرا ہے۔ '' ہُن کیہ کریے؟'' کے عنوان سے انور مسعود کا دوسرا پنجابی شعری مجموعہ ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا۔ اس کی ضخامت پہلے شعری مجموعے سے نسبتاً زیادہ ہے۔ لیکن رنگ ڈھنگ وہی ہیں۔ ان کی مشہور و معروف نظم ''جہلم'' اسی مجموعے میں شامل

ہے۔ ''میلی میلی دھوپ'' جو ماحولیات پر مبنی شعری مجموعہ ہے، اس میں بھی تین پنجابی نظمیں اور ایک قطعہ شامل ہے۔ انور مسعود کی پنجابی شاعری کا مطالعہ اُن کی ''نظم'' کے حوالے سے درج ذیل ہے۔

انور مسعود کی پنجابی نظموں میں مکالماتی انداز چھایا ہوا ہے۔ ان کی مقبولِ عام نظمیں اسی انداز کی حامل ہیں۔ امبڑی، اَج کیہ پکایئے، لسّی تے چاء، انارکلی دیاں شاناں، جہلم دے پُل تے، تندور، حال اوئے پاہریا، پٹ سیاپا، اُوازار، رکشے والا وغیرہ اس کی مثالیں ہیں۔ ان سب نظموں میں دیہی زندگی اپنی تمام رنگینیوں اور صعوبتوں کے ساتھ سامنے کھڑی نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری کی مقبولیت کی ایک وجہ ان کی مخصوص زبان بھی ہے۔ ان کے مکالموں میں برتی جانے والی زبان وہی ہے جو عام آدمی بولتا ہے۔ ان کی پنجابی شاعری میں مشرقی روایات و اقدار ہر طرف اپنے حسن کا جادو جگاتی پھرتی ہیں۔ انور مسعود ان روایات کو دیہی پس منظر میں پیش کر کے ان کے حسن و جمال کو مزید تر و تازگی عطا کرتے ہیں۔ پنجابی زبان میں کی جانے والی شاعری ہی ان کی اصل پہچان بن چکی ہے۔ ڈاکٹر افضل اعزاز درست کہتے ہیں کہ:

> ''مشرقی اقدار کا پرچار اور ایک اخلاقی رویہ انور کے سارے کلام میں جاری و ساری ہے۔ لسی تے چاء، وگوچہ، انارکلی دی مجھ، پٹ سیاپا، اور امبڑی انھی قدروں کی آئینہ دار ہیں۔ لسی، ساگ، مکئی اور مکھن اس کی مرغوب غذائیں ہیں۔ جو لطف اُسے اردو، فارسی اور پنجابی بول کر آتا ہے انگریزی میں نہیں آتا۔ اپنی قدروں کی ترجمانی اس نے جس اچھوتے اسلوب میں کی ہے۔ وہ ہمارا تہذیبی ورثہ ہے۔ وہ اپنی زندگی میں پنجابی کا Legend بن چکا ہے۔''

پنجابی زبان میں پائی جانے والی موسیقیت کی لَے اس زبان کے مخصوص آہنگ سے جنم لیتی ہے اور پہلے سے موجود موسیقیت کو شاعری کی زبان میں ڈھال کر ڈرامائی طرز میں بیان کرنا انور مسعود کی عوامی مقبولیت کی خاص وجہ ہے۔ اپنی شاعری سناتے وقت انور مسعود اس بازی گر کی صورت اختیار کر جاتے ہیں جو اپنے جادوئی تھیلے میں ہاتھ ڈال کر لوگوں کو تجسس اور حیرت میں ڈالے رکھتے ہیں کہ نجانے اب تھیلے سے کیا برآمد ہو، پھر ہر بار جب ان کا ہاتھ باہر آتا ہے تو اپنے ساتھ دلچسپی کا ایک نیا اور انوکھا روپ دکھاتا ہے۔ انور مسعود کے اس طرزِ بیان سے قہقہے اور آنسو ایک ساتھ جنم لیتے ہیں اور سننے والے اسی کشمکش میں مبتلا رہتے ہیں کہ کیا معلوم یہ شخص ہنسادے یا رُلادے:

> ''اس کی پنجابی کی چند نظمیں تو ایسی ہیں جو اکثر لوگوں کو پوری کی پوری یاد ہیں مگر اس کے باوجود انور مسعود کے مخصوص انداز میں اور اس کی زبان سے انھیں سننے کا لطف ایسا ہے کہ بار بار سُن کر بھی جی نہیں بھرتا، اس کے قطعات ہوں یا مزاحیہ غزلیں، وہ اردگرد پھیلی ہوئی حقیقتوں اور ان کی جزئیات کو کچھ ایسی ہنرمندی، تازہ کاری اور قہقہوں میں لپٹی دلسوزی کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ بعض اوقات قاری اور سامع کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اسے اس موقع پر کیا کرنا چاہیے۔''

انور مسعود کی پنجابی شاعری کو چار بڑے موضوعات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ان میں تہذیب و ثقافت، سیاسیات، افراد معاشرہ اور گھریلو اُلجھنیں وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے مشاہدے کی وسعت اِن کی تمام شاعری کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ موضوعات کی فراوانی اِن کی عوامی زندگی کا پتہ دیتی ہے۔ پبلک ٹرانسپورٹ کے مسائل وہی شخص اس خوبی سے کاغذ پر اُتار سکتا ہے جس نے خود اس کی صعوبتیں برداشت کی ہوں۔ انور مسعود کی نظم ''جہلم دے پُل تے'' میں کئی حقیقتیں آشکار ہوتی ہیں۔ مثلاً: غربت بسوں اور لاریوں میں آوازیں لگانے پر مجبور کرتی ہے اور مسافر بھی اُسی طبقے سے ہونے کی وجہ سے ان لوگوں سے سستی اور مضرِ صحت اشیا خریدنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ یہ نظم بتاتی ہے کہ عام سی شے کو بڑھا چڑھا کر کیسے پیش کیا جاتا ہے؟ مسافر کس طرح انتظار کی کوفت برداشت کرتے ہیں؟ اس نظم میں تین ہاکر اپنی اپنی اشیا کا تعارف کروا کر ان کی فروخت کا اہتمام کرتے ہیں۔ سب سے پہلے

سرے والا آتا ہے، انور مسعود کا مشاہدہ سارے منظر کی تصویر کشی یوں کرتا ہے:

میرے وَلّوں سارے بھین بھائیاں نوں سلام ہووے
جاتکاں، بزرگاں تے مائیاں نوں سلام ہووے
لاری والا اجے کجھ دیر کھلووے گا
سپاں والا باوا تُساں سُنیاں تے ہووے گا
بچہ بچہ اَج ایس باوے نوں سیہاندائے
سُرمہ میں ویچناں ہاں جگ سارا جاندائے
کدھرے نہ اَج ایس سُرمے دا جوڑ اے
ست ویہیاں بوٹیاں دا عرق تے نچوڑ اے
دھند ہووے، جالا ہووے، بھانویں ہون ککرے
اکھاں وچوں پانی وگے نالے اکھ رڑکے
پیڑ منک جاندی اے تے سوج لیہہ جاندی اے
اِکّو ای سلائی نال ٹھنڈ پے جاندی اے
ایویں میں قران دیاں قسماں نئیں چکدا
دِلوں جے مکایئے نہ تے وہم نئیں جے مکدا
ہور کیہ اے چپ تہاڈی کھل نئیں جے سجنو
چار آنے شیشی دا وی مُل نئیں جے سجنو

آخر میں سُرمے والا ایسا حربہ استعمال کرتا ہے جس کو بسوں میں اشیا فروخت کرنے والے تقریباً سب ہاکر استعمال کرتے ہیں اور کوئی نہ کوئی مسافر دامِ صیاد میں گرفتار ہو جاتا ہے:

ڈیرے توں منگاؤ گے تے نرخ مال وکھرا
ڈاک دا کرایہ تے محصول نال وکھرا
کیہڑی سیٹ والیاں بزرگاں نے بُلایا جے
ہتھ وچ پیسے رکھو آیا جے میں آیا جے

اسی طرح کیے بعد دیگرے دانتوں کی دوا اور جنتری بیچنے والے ہاکر مسافروں کو اپنی اشیا کی قدر و قیمت بتاتے ہیں۔ اس نظم میں انور مسعود کے اس مشاہدے کی داد دینا پڑتی ہے جس کی بدولت انھوں نے ایک مخصوص عوامی کلچر کو آبِ حیات پلا کر امر کر دیا۔

پنڈی سے ہمیں پیار ہے۔ ایک تو اس کا کے نام میں نسائیت ہے۔ لاہور اور پشاور بہت مذکر کاٹھ کے شہر ہیں لیکن پنڈی کی ادائے دلبری محض تانیث تک ہی محدود نہیں۔ نام کے لحاظ سے کراچی بھی اِتنا ہی مؤنث ہے بلکہ ایک شادی شدہ کیفیت بھی رکھتا ہے یعنی عروس البلاد کہلاتا ہے لیکن جو شیوۂ ترکانہ دوشیزہ پنڈی کا ہے، وہ اس عروس ہزار داماد کا نہیں لیکن آج ولائت روانہ ہوتے ہوئے ہمیں پنڈی سے شکوہ ہونے لگا۔ وہ اس لئے کہ پنڈی کا پنڈا جو عام حالات میں ہاتھ کے نیچے حریر و پرنیاں کی طرح ملائم و معتدل معلوم ہوتا تھا، آج خلافِ معمول ریگ آمو کی مانند درشت و گرم لگ رہا تھا اور یہ پنڈی کے روایتی مزاج پر نا قابلِ تلافی تہمت تھی۔ پنڈی کی دلربائی کا تو یہ تقاضا تھا کہ آج اور خصوصاً آج کہ ہم رخصت ہو رہے تھے، مری سے خاص طور پر بادل آتے، بوندا باندی ہوتی، باغوں میں جھولے پڑتے، فضاؤں میں رومان رچتا اور پنڈی چھوڑنے پر ہمارے ارمانوں میں ہلچل مچتی۔ کوئی دستِ ناتواں بھی دامن گیر ہوتا تو ہمیں دامن جھٹکنے کا یارا نہ ہوتا۔

بسلامت روی از کرنل محمد خان

''اَج کیہ پکایئے'' کا انداز بھی مکالماتی ہے۔ اس میں دیہی علاقوں میں قائم قدیم پنچایتی سسٹم کو سامنے لایا گیا ہے جس میں مغلوب طبقہ غالب کی ہر بات کو ہمیشہ سر آنکھوں پر بٹھاتا ہے۔ جب چودھری کسی سبزی کا نام لیتا ہے تو اس کا ملازم رحماں اس سبزی کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتا ہے۔ لیکن جیسے ہی چودھری اسی سبزی میں کوئی نقص ظاہر کرتا ہے تو رحماں اس کی کئی بُرائیاں سامنے لاتا ہے۔ اس میں خوشامد کو نوکری کا جزوِ خاص بتایا گیا ہے کہ مالک کی ہاں میں ہاں ملانا ہی اصل نوکری ہے۔ اس کے باوجود مالک اپنے ملازم کو جھڑک دیتا ہے۔ انور مسعود نے اس نظم میں اسی ایک چھوٹی سی بات کو واقعہ نگاری کے رنگ میں ڈھال کر پنجابی ادب میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ نظم کا ایک بند درج ذیل ہے جس میں چودھری کریلے پکانے کی بات

کرتا ہے تو رحماں کریلے کی تعریفیں شروع کر دیتا ہے:

چودھری:

فیر کیہ خیال اے تیرا جھڑی نہ منا لیئے
جے توں آکھیں رحمیاں کریلے نہ پکا لیئے

رحماں:

ریس اے کوئی چودھری جی آپ دے خیال دی
جی اے کوئی سبزی کریلیاں دے نال دی
ڈھڈ وچ اِنج جویں لو لگ پئی اے
ٹساں گل کیتی اے تے رال وگ پئی اے
سچ پچھو چودھری جی ایہو میری راء اے
مینوں وی چروکنا کریلیاں دا چاء اے
چوہدری جی ہووے جے کریلا چنگا پلیا
وچ ہووے قیمہ اُتّے دھاگا ہووے ولیا
گنڈھیاں ٹماٹراں دے نال ہووے ٹِکیاں
فیر ہووے گھر دے گھیو وچ بھنیاں
فیر کوئی چودھری جی اوس دا سواد اے
پَر وی پکایا سی ٹساں نوں وی تے یاد اے

جب چودھری نے سبزی کے متعلق ملازم کی تعریفیں سنیں تو اس نے سبزی کے بارے میں یہ رائے دی کہ باقی سب باتیں تو ٹھیک ہیں لیکن ان میں ذرا کڑواہٹ بھی تو ہوتی ہے۔ بس اتنا سننا تھا کہ رحماں نے ایک دم کریلوں کی خامیاں بیان کرنی شروع کر دیں جن کو انور مسعود نے انوکھے روپ میں پیش کیا ہے۔ چودھری

> ہم نے دل کو کبھی دل نہیں سمجھا۔ جہاں کوئی اچھی صورت دیکھی، وہاں اپنا دل قدموں میں ڈال دیا۔ دل کا ایسا بیجا اسراف شائد ہی کسی نے کیا ہو۔ ہمیں یہ غلط فہمی تھی کہ اگر دل نامی چیز کو ہی اپنے پاس نہ رکھو تو شائد اس طرح اس کے کسی عارضے میں مبتلا ہونے سے بچ جائیں گے۔ دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا والا معاملہ ہم پر صادق آتا ہے۔
>
> کالم برداشتہ از مجتبیٰ حسین

اور رحماں کے درمیان مکالمے کی صورت میں دوسرا بند ملاحظہ ہو:

چودھری:

ہور بیبا ایہدی مینوں ہر گل بھاؤندی اے
رحمیاں کریلے وچ کوڑ ذرا ہوندی اے

رحماں:

دفع کرو زہر تے چریتا مینوں لگدائے
نِم تے دھریک دا بھرا مینوں لگدائے
پلے پلے دنداں تھلے جیبھ پئی سُکدی
کھا مر لیئے تے تریہہ نئیں مُکدی
نِمّے دیاں گولیاں کریلیاں توں پھکیاں
ایہناں نالوں چاہڑ لو کونین دیاں ٹکیاں

یہاں صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ چودھری بالا دست طبقے کی علامت ہے جبکہ رحماں اس بے رحم طبقے کے ہاتھوں کھلونا بننے والے مظلوم، لاچار اور نسل در نسل غلامی کی زندگی بسر کرنے والے کرداروں کا ایک روپ ہے۔ بالا دست عناصر، غربت اور مفلسی کے ہاتھوں ستائے ہوئے اس طبقے کو زندگی کی دلچسپیوں میں حصہ لینا تو دور کی بات، ایسی سوچ سوچنے کا متحمل بھی نہیں سمجھتے۔ خدائی صفات کو اپنی ذات میں مجتمع کرنے کے خواہش مند فرعونوں میں ہمارے ملک کے سیاستدان، جاگیردار، سرمایہ دار اور ایسے تمام طبقات چودھری کے بھیس میں عامۃ الناس کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔

یہی چودھری پہلے بینگن کا نام لیتا ہے تو رحماں حسبِ عادت اس سبزی کی تعریفیں کرنے لگتا ہے لیکن چودھری تمام تعریفوں کو رد کرتے ہوئے بینگن کے گرم ہونے کا کہہ کر اسے نظر انداز کر دیتا ہے۔ رحماں بھی چودھری کا ساتھ دیتے ہوئے بینگن کے سالن کی کئی برائیاں بیان کر ڈالتا ہے اور خاص طور پر جب وہ ان کے کالا ہونے پر تنقید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ہماری تو امریکہ سے دوستی ہے اس لیے ہم کالوں کے ساتھ نہیں چل سکتے تو چودھری اس بات پر اسے بے ساختہ جھڑک دیتا ہے۔ چودھری کی اس جھڑک کے پیچھے وہ تمام تر عیاری و مکاری موجود ہے جو محکوم کی سوچ تک کو قید

سرٹیفکیٹ

ایک بوڑھے پنشنر کی پنشن دفعتاً بند ہوگئی۔ جنوری سے جون تک کچھ نہ ملا۔ آخر تنگ آکر اس نے اوپر خط لکھا وہاں سے جواب آیا کہ کاغذات کے مطابق آپ کا کئی ماہ سے انتقال ہو چکا ہے اس لئے پنشن بند کر دی گئی ہے۔ اس نے لکھا کہ جنابِ من، میں تو باقاعدہ زندہ ہوں۔ جواب آیا سرٹیفکیٹ بھیجئے۔ یہ ضلع کمشنر کے پاس گیا۔ کمشنر بہت ہنسا اور سرٹیفکیٹ لکھ دیا کہ میں فلاں صاحب کو اپریل سے دیکھ رہا ہوں اور تصدیق کرتا ہوں کہ یہ زندہ ہیں۔ نیچے جون کی کوئی تاریخ لکھ دی۔ پنشنر نے وہ سرٹیفکیٹ اور ایک خط اوپر بھیج دیا۔ اگلے ہفتے تین ماہ کی پنشن آگئی، ساتھ ہی ایک خط جس میں لکھا تھا ''جنابِ من! آپ کے سرٹیفکیٹ کے مطابق اپریل، مئی اور جون کی پنشن حاضر ہے۔ براہ مہربانی ایک اور سرٹیفکیٹ ارسال کریں کہ آپ اسی سال جنوری، فروری اور مارچ میں بھی زندہ تھے تاکہ آپ کی بقیہ پنشن بھی بھیج دی جائے۔

مزاح پرسی از عطاالحق قاسمی

رکھ کر اسے ہمیشہ کے لیے ذلت کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ نظم کے آخری بند میں ''چودھری'' کے کہے ہوئے پہلے چار مصرعے توجہ طلب ہیں:

وڈھ وڈھ بولنا ایں ایویں بڑ بولیا
سبزیاں تو جا تُوں سیاستاں نوں پھولیا
دوجے دی وی سُن کجھ دوجے نوں وی کہن دے
حکومتاں دی گل تُوں حکومتاں تے رہن دے

انور مسعود کی نظم ''لسّی تے چاء'' میں مشرقی اور مغربی تہذیبوں کا تقابل کیا گیا ہے۔ لسّی مشرقی تہذیب کی علامت ہے اور چائے مغربی تہذیب کی نمائندہ ہے۔ نظم میں دونوں علامات کو آپس میں دست و گریبان دکھایا گیا ہے۔ مشرقی علامت اپنی خوبیوں پر نازاں ہے اور مغربی علامت اپنے آپ کو بڑھ کر ثابت کرنے میں کوشاں ہے۔ لسّی کا سب سے بڑا دعویٰ یہ ہے کہ وہ مقامی ہے۔ اس کا رنگ رُوپ سچا ہے اور اسے اپنے ماں باپ کی وجہ سے اصل پہچان حاصل ہے۔ یہاں مغرب کی اُس مادر پدر آزادی پر طنز کی گئی ہے جس میں بچوں کو اپنے ماں باپ تک کا علم نہیں ہوتا کہ وہ کون ہیں۔ لسّی اور چائے کی بحث وتکرار کے بعد نظم کے آخری بند میں ''چائے'' کے مغرب کی نشانی ہونے کی حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ لسّی اُس سے کہتی ہے:

سانجھی رہو نی چینک بیگم تُھپی رکھ وڈیائیاں
میں کیہہ دساں گھر گھر جیہڑیاں تُد چواتیاں لائیاں
گلاں کر دی تھکدی نہیں توں جیبھ نوں لائی تالا
کھنڈ دی کوڑی کیتی آ تے دُدھ وی کیتوئی کالا
ہُتی ہُڑ بُڑ نہ کر بی بی نہ کر ایڈا دَھکا
تیرے جیہی کوجی کوہجی میرے نال مُحکا
میری چودھر چار چوفیرے تیری منتا تھوڑی
میں دیہاں دی صوبے رانی توں پردیسن چھوری
دیس پرائے رانی خاں دی توں سالی بن بیٹھی
منگن آئی اَگ تے آپوں گھر والی بن بیٹھی
رب کرے نی اِکو واری گھٹ بھرے کوئی تیرا
تیرا وی انگریزاں وانگوں پٹیا جائے ڈیرا

انور مسعود کی نظم ''امبڑی'' ماں کی اُس بے لوث محبت کو آشکارا کرتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے صرف ماں کو ودیعت کر کے اولاد پر احسانِ عظیم فرمایا ہے۔ ہر ظلم وستم سہہ کر اپنے بچوں کو پروان چڑھانے کا جذبہ، اُن کی حفاظت اور نگہداشت ماں کے خمیر میں شامل ہے۔ یہ جذبہ انسانوں، جانوروں اور چرند پرند سب میں مشترک ہے۔ ننھی سی چڑیا کے بچے گھونسلے سے گر جائیں تو اُس کی پریشانی اور بے چینی ماں کے روپ میں اُمڈ کر سامنے آجاتی ہے۔ انور مسعود نے 'امبڑی' میں ایک چھوٹے سے واقعہ کو بنیاد بنا کر لفظوں سے آنسوؤں کے دریا بہا دیے ہیں۔ واقعے کے مطابق مدرس طالب علم کے دیر سے آنے پر اُس کو سرزنش کرتا ہے:

ماسٹر:

اَج بڑی دیر نال آیا ایں بشیریا!
ایہہ تیرا پنڈ اے تے نال ای سکول اے
جائیں گا توں میرے کولوں ہڈیاں بھنا کے
آیا ایں توں اَج دونویں ٹلیاں گھسا کے

''بشیرا'' نام کا طالب علم اپنے دیر سے آنے کی یہ وجہ بتاتا ہے کہ اُس کے پڑوسی طالب علم 'اکرمے' کی ماں اُن کے گھر آ گئی تھی جس کو اکرمے نے بڑی بے دردی کے ساتھ مار مار کر اُس کے منہ پر زخموں کے نیل ڈال دیے تھے اور اُس کا ہاتھ بھی سُو جا ہوا تھا۔ مار دھاڑ کے شور سے جب محلے والے اکٹھے ہوئے تو اکرما اپنی جان بچا کر گھر سے کھانا کھائے بغیر سکول کی جانب بھاگ آیا۔ اکرمے کی ماں کو احساس تھا کہ اُس کا نافرمان بیٹا گھر سے کھانا کھائے بغیر سکول گیا ہے لہٰذا وہ اس کے لیے کھانا لے کر آ گئی اور یہی باعثِ تاخیر تھا۔ انور مسعود کا رنگِ بیان دیکھیے:

بشیرا:

منشی جی میری اِک گل پہلاں سُن لو
اکرمے نے نھیر جیہا نھیر اَج پایا جے
مائی نوں ایہہ ماردائے تے بڑا ڈاہڈا ماردائے
اَج ایس بھیڑ کے نے حد پئی مکائی اے
اوہنوں مار مار کے مدھانی بھن سٹی سُو
بندے کٹھے ہوئے نیں تے اوتھوں بھج وگیائے
چک کے کتاباں تے سکول ول نسیائے
مائی ایہدی منشی جی گھر ساڈے آئی سی
مُونہہ اُتے نیل سن سُجا ہویا ہتھ سی
اکھاں وچ اَتھرو تے بلاں وچ رت سی
کہن لگی سوہنیا، وے پتر بشیریا
میرا اک کم وی توں کریں اَج ہیریا
روٹی میرے اکرمے دی لئی جا مدرسے
اَج فیر ٹر گیا اِی میرے نال رُس کے
گھیو وچ گُنھ کے پراؤنٹھے اوس پکے نیں
ریجھ نال رِنھیاں سُو آنڈیاں دا حلوہ
پونے وچ بنھ کے تے میرے ہتھ دِتی سُو
ایہو گل آکھدی سی مُڑ مُڑ منشی جی
چھیتی نال جائیں بیبا، دیریاں نہ لائیں بیبا
اوہدیاں تے نُوسدیاں ہون گیاں آندراں
بھکھا بھانا اَج اوہ سکولے ٹُر گیا اے
روٹی اوہنے دِتی اے میں بھجا لگا آیا جے
اکرمے نے نھیر جیہا نھیر اَج پایا جے

نظم ''اِک خواب'' اپنے اندر اُس عام پاکستانی کے ساتھ بیتنے والی وارداتوں کا تمام احوال سمیٹے ہوئے ہے جو پاکستان میں ہونے والے انتخابات میں امیدوار اور سیاسی پارٹیاں اُن کے ساتھ کرتی ہیں۔ مملکتِ پاکستان میں ہر جگہ اپنا مطلب نکالنے کے لیے خوشامد، چاپلوسی اور جی حضوری کا رواج پڑ چکا ہے۔ غریب و مفلس آدمی کے ذہن میں پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے روٹیاں ہی بسی رہتی ہیں اور سیاسی مداری ان کی اس کمزوری کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے انھیں اچھا کھانا کھلا کر آسانی سے اپنا مطلب حاصل کر لیتے ہیں۔ غریب آدمی کی بھوک اُس کو جائز ناجائز کی بحث سے آزاد کر دیتی ہے اور صیاد کے دام میں پھنس جانے کے بعد وہ اُس کے اشاروں پر چلنے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے۔ عام آدمی کے پیٹ کی بھوک ختم ہونے کے باوجود اُس کی آنکھوں کی بھوک نہیں مٹتی اور اُس کا دل چاہتا ہے کہ سامنے موجود سب کچھ ہڑپ کر لیا جائے۔ شادی بیاہوں اور اس نوعیت کی اکثر تقریبات میں ایسے مناظر دکھائی دے جاتے ہیں۔ پاکستانی سیاست میں غریبوں کے خلاف بھوک کا یہی ہتھیار استعمال کر کے اُنھی پر حکمرانی کا حق با آسانی حاصل کر لیا جاتا ہے۔ اسی تناظر میں مثنوی کی ہیئت میں کہی گئی اس نظم ''اک خواب'' کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

ڈٹھی میں اک خورمرے دَل پَیلاں پاندی آوے
اِک نظر مستانی جس دی لکھ بھلیکھے پاوے
حُسن، جمال تے رُوپ اوہدے دا کوئی نہ حد بنّاں

اُس دیاں نازک ہتھاں دے وچ سونے دا اک چھناں

اوہ چھناں اُس آن کے میرے ہوٹھاں نال لگایا

ہاہڑ ہاہڑ پین لگا میں وربھیاں دا ترہایا

ٹھنڈا ٹھار ہملوا سنگھوں لنگھدا جائے اگے

دُدھ وراچھاں میریاں وچوں سجے کھبے وگے

اوہناں نے کجھ ہور سوغاتاں میرے لئی منگوائیاں

قسماں قسم مربے، میوے، حلوے تے مٹھیائیاں

مُڑ میں اپناں وگ تک کھادا گُڈ تا ڈھڈ نہ کجے

پاٹن ہاکا پیٹ، ندیدی اکھ مری نہ رجے

میری ایہو نیت سی پئی کدی نہ ایتھوں ہلیے

حوراں آکھن آؤ جی ہُن سیر کرن نوں چلیے

اِک تھاں میتوں شہد دی اوہناں وگدی نہر وکھائی

جیویں جیویں ویکھاں وددھی جائے اکھیاں دی رُشنائی

کاراں اُتے جہازاں والے ٹھل گئے سب جھوٹے

قوس قزح وچ بہا کے میتوں حوراں دتے ہوٹے

ہر کوئی میتوں جی جی بولے آکھے راج دُلارا

میرے نال پروہنیاں ورگا اوہناں دا وَرتارا

سرہیوں جیھیاں سوہنیاں ناراں دِسن ہر ہر پاسے

پتلے لک، بسنتی چنیاں ہوٹھاں اُپر ہاسے

میں پچھیا نی حورو اڑیو کاہنوں کھڑ کھڑ ہسو

میری ایڈی خدمت خاطر، وچلی گل تے دَسو

آکھن لکیاں بیبا ایڈا پردہ کاہنوں پاناں

جنت وچ الیکشن ہونائے ووٹ اسانوں پاناں

''انارکلی دیاں شاناں'' میں ہمہ وقت لطیف طنز کی ایک ہلکی سی لہر سارے منظر پر حاوی رہتی ہے۔ اس میں نئی تہذیب اور دم توڑتی مشرقی روایات کو موضوعِ سخن بنا کر فکر کو فن پر مقدم کرنے کی سعی مسلسل ملتی ہے۔ منظر نگاری کے تقاضے پورے کرتے ہوئے ایک بازار (انارکلی) میں بھینس کے گھس آنے پر اُس کو مخاطب کرتے ہوئے بازاروں کی ساری چکا چوند کو اِس نظم میں سمیٹ لیا ہے۔ انور مسعود انارکلی کو سامنے رکھ کر تمام بازاروں میں لوگوں کے ہجوم میں شریک خواتین و حضرات کے شرم و حیا سے عاری ہونے پر طنز کے تیروں کی برسات کر دیتے ہیں:

اُلھڑ شیشہ مُٹیاراں والی چڑھتل کیہڑا جھلے

مونڈھے نال پیا مونڈھا کھیہندائے وجن پئے دھر گھلے

اکھیاں وچ نئیں شرم دا کجلا مونہواں تے نئیں پلے

اُچا اُچا سارے ویکھن کوئی نہ ویکھے تھلے

نیویں نظر کویں کوئی رکھے اُچیاں ہین دُکاناں

توں کیہہ جانے بھولیئے مجھے نارکلی دیاں شاناں

عریانی کی حدوں تک پہنچا ہوا بے حیائی سے بھرپور فیشن تہذیب جدید کی سب سے بڑی لعنت ہے جس پر بڑے فخر سے چل کر اسے بڑائی کی علامت سمجھا جا رہا ہے۔ نظم کے ایک بند میں ان نام نہاد ''مہذب'' لوگوں کو ''نویں بہار دے کپڑے'' کہہ کر ان کا مضحکہ خیز حلیہ یوں بیان کرتے ہیں:

چار چوفیرے ٹیڈی پھردے نویں بہار دے کپڑے

چاہڑے ہوئے اُچھاڑاں وانگوں پاٹن ہا کے لیڑے

وَکھیاں اُتوں کھل کھل جاون ٹچ ٹچ کر دے بیڑے

جیہڑا ویکھے جیھ اپنی نوں دنداں ہیٹھ دبیڑے

ڈاہڈیاں تنگ پوشاکاں دے وچ پھاتھیاں ہوئیاں جاناں

توں کیہہ جانے بھولیئے مجھے نارکلی دیاں شاناں

نظم کے آخری بند میں آج کی سب سے بڑی حقیقت مال و دولت کو قرار دیا گیا ہے، پُرانی قدریں ختم ہو چکی ہیں اور عزت و احترام کے لیے انسانی اوصاف کی جگہ روپے پیسے نے لے کر معاشرے کو مادیت پسند بنا کر اس کی جڑیں کھوکھلی کر دی ہیں:

آ وڑیاں ایں ڈنگر مالا توں اَج کیہڑے پاسے

پیسے دے نی پُتر سارے ایس گلی دے واسے

مہاتڑ ایتھے خالی آوندے خالی کھڑدے کاسے

پلّے جیکر پیسے ہوون ڈلھ ڈلھ پیندے ہاسے

بہتیاں میتوں آوندیاں کوئی نئیں اِکو گل مُکاناں

توں کیہہ جانے بھولیئے مجھے نارکلی دیاں شاناں

تندور دیہی خواتین کا چوپال ہوتا ہے، جہاں محلے کی عورتوں کو

موسیقی سے شغف تھا اور گلے میں نور بھی تھا لیکن محلے والے اچھے نہ تھے۔ استاد کی خواہش تھی کہ شہر سے باہر تنہا کوئی مکان ہو تو دلجمعی سے تکمیلِ شوق کریں۔ ویسے کبھی کبھی محفل میں ہار مونیم لے کر بیٹھ جاتے تھے کہ یہی ان کا محبوب ساز تھا اور سہگل کی گائی ہوئی مشہور غزل ''نکتہ چیں ہے، غمِ دل اُس کو سنائے نہ بنے'' سنانی شروع کر دیتے۔ ایسے موقع پر نکتہ شناس لوگ آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے کر کے ایک ایک کر کے اُٹھ جاتے کیونکہ اس فن کے ریاض کے لئے تنہائی ضروری ہے۔

خمارِ گندم از ابنِ انشاء

مل بیٹھنے اور دکھ سکھ کہنے سننے کا موقع ملتا ہے۔ یہاں خواتین ایک دوسرے سے گلے شکوے کرتی ہیں اور اکثر نوبت لڑائی جھگڑے تک جا پہنچتی ہے۔ نظم ''تندور'' میں دیہی زندگی کی چھوٹی چھوٹی تلخیوں کا تذکرہ ہے۔ اس نظم میں کردار نگاری کے اعلیٰ نمونے بکھرے پڑے ہیں۔ گاؤں کی عورتوں کے رُوپ میں شریفاں، شاداں، جیواں، خیراں، کریماں اور بی بی اپنا اپنا کردار بڑی خوبی کے ساتھ انجام دیتی ہیں۔ تندور میں روٹیاں لگانے والی خاتون غریب ہوتی ہے اور ماسی کے نام سے جانی جاتی ہے۔ ہمارے معاشرے میں عام طور پر جن خواتین سے کوئی رشتہ داری نہ ہو اُن کو خالہ یعنی ماسی کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ شہروں میں یہ روایت دم توڑ چکی ہے اور گھروں میں کام کرنے والی عورتوں کو ماسی کہا جا رہا ہے۔ اس بحث سے قطع نظر نظم ''تندور'' کی ماسی جیواں سب عورتوں کے طعنے اور گلے شکوے سُن کر کہتی ہے:

حال دُہائی پا دیندی اے جیہڑی آن کھلوندی اے
گلّی کسراں پُوری آواں ہر کوئی کاہلی آوندی اے
بِکیاں بِکیاں گڑیاں مینوں کھوہ کھوہ کھاون لگیاں نیں
کل دیاں جمیاں میرے اُتے رعب جماون لگیاں نیں
میرا ڈھن کلیجہ اے اڑیو ہوندی نال جو میرے نی
اَگے میرے اگ دے لنبو رولا چار چوفیرے نی

عورتوں کی مردوں سے سنی جانے والی نامکمل معلومات سچے جھوٹے افسانوں میں ڈھل جاتی ہیں۔ بچوں کے درمیان ہونے والی لڑائی کی داستان کے بعد تندور پر ''خیراں'' اپنی معلومات پُراسرار لہجے میں دوسری عورتوں تک پہنچاتی ہے اور ساتھ اُنھیں نصیحت کرتی ہے کہ یہ سرکاری راز فاش نہ ہونے پائے۔ زبان و بیان کی خوبیوں سے معمور اس نظم کا آخری مکالمہ مغرب میں انسان سے زیادہ جانوروں کی قدر و قیمت پر طنز کرتا ہے:

چھڈو نی گل مُنڈیاں والی مُنڈیاں لڑدیاں رہناں اے
تُسی نہ اینجے کرو لڑائی دونہہ گھڑیاں دا بہناں اے
میں سنیائے نی چین دے اُتے روس دے راکٹ جاناں اے
بندے نالوں پہلاں اوتھے کتا اوس پہنچانا اے
اِنج لگدائے دنیا دے دن ہوگئے نیں ہُن پُورے نی
بندے رہن زمیں دے اُتے چن تے جان کتورے نی
گل نہ کریو کدھرے اڑیو گل وی ایہہ سرکاری اے
لے نی ماسی جیواں پیڑا ہُن تے میری واری اے

حال، مصائب کی تپتی دوپہر بن جائے تو ماضی سکون و اطمینان کی ٹھنڈی چھاؤں بن کر سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔ عہدِ حاضر کو سائنسی ترقی کے عروج کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ انور مسعود اس دور کے مسائل کا موازنہ ماضی کے مصائب سے کرتے ہوئے دونوں کا تقابل کرتے ہیں۔ اُن کو ماضی میں جو مسائل نظر آتے تھے اب یہ مصائب پہلے سے کہیں زیادہ بڑھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ''ورہیاں دے پینڈے'' میں گزرے وقتوں میں دورانِ سفر پیش آنے والی مشکلات دیکھیے:

سوچناں واں پچھلے زمانے دیاں گلاں نوں
گھروں پیر کڈھناں کوئی سوکھی جیہی گل سی؟
راہواں وی گھنیریاں ہنیریاں تے سُنجیاں
شیر خورے کنیاں دا ڈھڈ پاڑ جاندے سن
سپ خورے کنیاں نوں ڈنگ مار جاندے سن
تھائیں تھائیں ٹھگ سن، تھائیں تھائیں چور سن
ٹھنڈ وچ لاہ لئے ڈاکوواں نے کپڑے
خورے کنے ٹرے سن خورے کنے اَپڑے

قدیم دور کے اسفار میں حائل مشکلات کے بعد ترقی کے اس دور میں جہاں انسان نے چاند تک کا سفر ممکن بنالیا ہے، اب کئی سہولتوں کے باوجود مسائل نے نئی شکل وصورت اختیار کر لی ہے۔ کبھی ڈاکو بسیں لوٹ لیتے ہیں۔ گاڑیاں آپس میں ٹکرا کر مسافروں کو ڈس لیتی ہیں۔ آئے روز سینکڑوں جوانیاں سڑکوں کے بیچ خون میں لت پت پڑی ہوتی ہیں اور دم توڑتے بے قصور بچوں کی کھلی آنکھیں اپنی موت پر حیران ہوتی ہیں:

اَج وی مسافراں دی اوہو ای برات اے
ڈاکوواں نوں کالی رات چودھویں دی رات اے
روز پئے سُنئے آں ایہو جیہیاں خبراں
فیر کوئی بس کسے بس نال بھڑ پئی
فیر کوئی گڈی کسے کار نال کھیہہ پئی
فیر کوئی لاری کسے کھڈ وچ ڈھے پئی

نظم ''دینا'' میں انسانوں کی مشکل وقت میں ایک دوسرے سے نظریں پھیرنے کی خصلت کا ذکر ملتا ہے۔ مشکلات میں پھنسے بیمار، لاچار اور غریب سے دور رہنے والوں کو اس بات کا ذرا احساس نہیں ہوتا کہ ایک دن اُن پر بھی مصیبتیں نازل ہو سکتی ہیں۔ ''دینا'' نظم کا واحد کردار ہے۔ وہ اپنی بیماری کی وجہ سے ہر وقت کھانستا رہتا ہے۔ دینے کا پیشہ دکانداری ہے لیکن اُس کی بیماری کو دیکھتے ہوئے کوئی شخص اُس سے کچھ خریدنا پسند نہیں کرتا۔ لوگوں کے ذہنوں میں وہم داخل ہو گیا ہے کہ ہم نے اس سے کوئی شے خریدی تو یہ بیماری ہمیں لاحق ہو جائے گی۔ دردمند دل رکھنے والا حساس شاعر اُس کی کیفیت دیکھ کر پریشان ہو جاتا ہے۔ دینے کی دکانداری بالکل ٹھنڈی ہے اور شاعر کو اُس کی راہ میں کانٹے ہی کانٹے نظر آتے ہیں۔ محاورات کے زیور سے آراستہ اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ایہو کہن محلّے والے کدوں ایہہ مُغروں لہندائے
ایہہ سُوکھے دا ماریا ہویا کھونہہ کھونہہ کردا رہندائے
ایہہ اک تھکا ٹُٹا راہی ایہدی راہ وچ کنڈے
کیہڑا ایہدے بھار ونڈاوے کون ایہدے دکھ ونڈے

اوکھے ویلے نکھڑ جاندے سجن یار نگینے
ایہہ اِک ایسی دنیا جتھے گلّی گلّی وچ دینے

''پٹ سیاپا'' ساس اور بہو کے روایتی لڑائی جھگڑوں کی داستان ہے۔ ساس کے مالک ومختار ہونے کی خواہش بہو کے حکم چلانے میں رکاوٹ بنتی ہے اور یہاں سے اِن دونوں کرداروں کے مابین طویل سرد جنگ کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ جنگ ساس کی موت یا بہو کی طلاق تک جاری رہ کر گھروں کی بربادی اور گھر والوں کی رسوائی کا سبب بنتی ہے۔ ساس کو بہو کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی خامی نظر آتی ہے اور بہو کو ساس کی کوئی بات گوارہ نہیں ہوتی۔ ادب واحترام اور شفقت ومحبت کے جذبات اِن رشتوں کے درمیان کم کم دیکھنے میں آتے ہیں۔ دیہاتوں میں اس طریق کا چلن عام ہے اور معمولی سے جھگڑے پر بہو اپنے میکے جا بیٹھتی ہے۔ یہ جھگڑے خاندانی دشمنی کی شکل اختیار کرتے دیر نہیں کرتے اور مستقل رقابت کئی فسادات کو اپنے ساتھ لے کر آتی ہے۔ اِن جھگڑوں سے متاثر ہونے والی ذات اُس شخص کی ہوتی ہے جس کو ماں کا احترام لازم ہوتا ہے اور وہ بیوی سے روٹھنا بھی درست نہیں سمجھتا۔ سارے دن کی تھکن لیے جب مرد گھر میں قدم رکھتا ہے تو ماں اور بیوی کی آئے روز کی آہ و بکا اُسے ذہنی مریض بنا دیتی ہے۔ انور مسعود نے یہاں بھی کردار نگاری کا کمال دکھاتے ہوئے چار کرداروں ساس، سسر، بہو اور بابو سے ساری نظم میں جان ڈال دی ہے۔ نظم کے آخری بند کی جھلک دیکھیے جو بہو کے رُوٹھ کر میکے جانے پر منتج ہوتا ہے:

میں ایس کپتی سسو دے جھگڑے توں ڈاہڈی اکی آں
تُسیں مَرد دی گل ودھانے توں میں ترلے لے لے تھکی آں
کوئی چوبھاں کدتک جردا اے کوئی سُوہاں کدتک سہندا اے
مرا اِتھے ہون گزارا نئیں ایہہ ویہڑا اوڈھن پیندا اے
ساہ سُکھ دا اِتھے آوندا اے کسے وڈے نوں نہ نکے نوں
میں ایہہ چلی پیکے جاندی آں سانبھو اپنے سَر جن نکے نوں

نظم ''ڈمّی'' میں عام آدمی کے اُن جذبات اور خیالات کو سمویا گیا ہے جو بڑی بڑی دکانوں کے شوکیسوں میں نئے نئے کپڑوں،

زیورات اور دیگر سامانِ آرائش سے لدی بے جان مورتیوں کو دیکھ کر اپنے دل میں محسوس کرتا ہے۔ اس کو دیکھنے والا غریب آدمی اپنے ساتھ اِس ''ڈمّی'' کا موازنہ کرتا ہے تو اُسے اپنے سے زیادہ ڈمی کی قدر و منزلت کا احساس ہوتا ہے۔ ایسے میں وہ سوچتا ہے کہ:

کدی تے ڈولے چڑھدی میری کوئی ریجھ نمانی
تیرے وانگوں شوکیساں دا
میں وی واسی ہوندا
تیرے ورگی، کرماں والی
میں اِک ڈمّی ہوندا

انور مسعود نے اپنی پنجابی نظموں میں ملکی سرحدوں کو عبور کر کے عالمی سامراج کے رویوں کا مشاہدہ بھی کیا ہے۔ نظم ''وار داتریا'' میں اُن طاقتوں پر قہر برسایا گیا ہے جو بغل میں چھری، منہ میں رام رام کا نعرہ لیے دوسروں کے امن و سکون کو برباد کر رہی ہیں۔ اس نظم کے چار بند ہیں۔ ایک بند بطور مثال پیش ہے:

توڑ دا قانون نوں جھکدا ئیں، تھکدا ئیں
اُس جیہا بے درد ہمسایہ وی ہو سکدا ئیں
اپنے ہمسائے نوں جو گٹی تے ٹکی جا رہیائے
داتری دے نال اِک تھوڑا دی چُکی جا رہیائے

''جمعہ بازار'' جمعہ کے دن لگنے والے سستے بازاروں میں سب سے زیادہ مقبول تھا۔ اس روز عام تعطیل ہوا کرتی تھی اور ملک میں امن و امان تھا۔ لوگ خصوصی طور پر تیار ہو کر اشیا کی خریداری کے لیے جاتے تھے۔ یہ ایک میلے کا سماں پیش کرتا تھا۔ اس نظم میں خریداروں کی نفسیات، بازاروں میں فروخت ہونے والی لاتعداد اشیا اور بیچنے والوں کے حربوں کو سامنے لایا گیا ہے۔ نظم کے سات بند ہیں اور جزئیات کے ساتھ جمعہ بازار کے ہر پہلو پر نظر ڈالی گئی ہے۔ نظم کے پانچویں بند میں تاجروں کا اندازِ دیانت دیکھیے:

تویں نرالی جاپی جس نے جو آواز لگائی
کہ ملوکاں والا بھائی کشمش وِکنے آئی
مونگ پھلی نوں آکھے کوئی پستے دی بھرجائی
گنے وٹیّن والا کُوکے لُٹی گئی مٹھیائی
برفی دی آواز سُنی تے شکر پارے ویکھے
کیسے کیسے عجب نظارے جمعہ بزارے ویکھے

ہر شاعر اپنے کلام میں اپنی دھرتی سے محبت پر کچھ نہ کچھ ضرور کہتا ہے۔ انور مسعود نے اردو کی طرح پنجابی میں پاکستان سے اپنی محبت کا اظہار کیا ہے۔ یہ اظہار نظم اور غزل دونوں میں موجود ہے۔ نظموں میں ''یومِ آزادی، ئمیں ریساں پاکستان دیاں'' اور ''۱۴ راگست'' شامل ہیں۔ ''یومِ آزادی'' اور ''۱۴ راگست'' خاص مواقع کے لیے لکھی گئیں۔ ''ئمیں ریساں پاکستان دیاں'' انعام یافتہ نظم ہے اور اس کا ہر ہر لفظ شاعر کی اپنی مٹی سے محبت کا گواہ ہے۔

''بدّل، ہالیا، اخبار، ریجھاں، حال اوئے پاہریا، وگوچہ، رکشے والا، اَوازار، گل وچوں گل نکلی، سُنک سُنک جانائیں، زرعی بجھارتاں، اینھے خورے کیہ ہونائے، پیو یار تنگ نہ کر جیسی نظمیں انور مسعود کی اُس حکمت کی عکاس ہیں جس میں وہ معاشرے کی نبض پر ہاتھ رکھ کر بیماری کی تشخیص ہی نہیں کرتے بلکہ علاج بھی تجویز کر دیتے ہیں۔ یہ نظمیں وقت کے سمندر میں بہہ جانے والے دورِ جدید کے سستے جذبات سے کوسوں دور ہونے کی بدولت ہر عہد میں زندہ رہنے کی صلاحیت سے بہرہ مند ہیں۔

کراچی سے تعلق رکھنے والے پروفیسر ڈاکٹر مجیب ظفر انوار حمیدی اُردو کے ایک بہت بڑے ادیب جناب انوار (عیگ) کے بہت بڑے صاحبزادے ہیں۔ یہ بچوں کے معروف ادیب ہیں۔ اب تک انہوں نے بچوں کے لئے سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں کہانیاں لکھ لی ہیں اور مسلسل لکھ رہے ہیں۔ پروفیسر صاحب کے اندازِ بیان کا طرۂ امتیاز شگفتگی اور بیساختگی ہے۔ خاکہ نگاری میں انہیں خصوصی ملکہ حاصل ہے۔ حالات و واقعات کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ تصویری بنا کر رکھ دیتے ہیں۔ ''ارمغانِ ابتسام'' کو فخر حاصل ہے کہ یہ اس کے لئے تسلسل سے لکھ رہے ہیں۔

ڈاکٹر عابد معز

ترکِ سگریٹ نوشی

ایک گھنٹہ کی اخبار بینی کے دوران جب میں نے پانچواں سگریٹ جلایا تو بیوی سے رہا نہ گیا۔ انہوں نے پوچھا۔ ''آپ بڑی رغبت سے سگریٹ نوشی کرتے ہیں، آپ کو سگریٹ نوشی کے فائدے تو معلوم ہی ہوں گے!''

مجھے یقین ہو چلا کہ اب سگریٹ نوشی ترک کرنے کی مہم کا آغاز ہوگا اور مجھے ڈیڑھ گھنٹے کا طویل لیکچر سننا پڑے گا۔ تمباکو نوشی کے لیے اتنا تو سہنا پڑے گا۔ اس خیال سے میں نے جواب دیا۔ ''نہیں، آپ بتایئے۔ میری معلومات میں اضافہ ہوگا۔ میں سن رہا ہوں۔''

''سگریٹ پینے والے کے گھر چوری نہیں ہوتی۔'' بیوی نے پہلا فائدہ بتایا۔

''کیوں؟'' میں نے سوال کیا۔

''سگریٹ پینے والا اپنی کمائی کا ایک ضخیم حصہ دھوئیں میں پھونک دیتا ہے۔ اس کے یہاں چوری کرنے کے لائق کوئی قیمتی شے نہیں رہتی اور دوسرے یہ کہ سگریٹ پینے والا کھانستے ہوئے رات بھر جاگتا رہتا ہے۔ چور کی شامت آئی ہے جو اس کے یہاں پکڑے جانے کے لیے چوری کرے گا۔'' بیوی نے وضاحت کی۔

میں خوشی سے سنتا رہا تو بیوی نے سگریٹ نوشی کا دوسرا فائدہ بتایا۔ ''سگریٹ پینے والے کو کتا نہیں کاٹتا۔ صرف بھونک کر رہ جاتا ہے۔''

میں سوالیہ نظروں سے بیوی کو دیکھتا رہا۔ چند لمحوں بعد انھوں نے وجہ بتائی۔ ''صحت خراب رہنے کے سبب سگریٹ پینے والے کو

لکڑی کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں لکڑی دیکھ کر کتا ڈر کر کاٹتا نہیں، صرف بھونک کر رہ جاتا ہے۔''

میں نے برا مانتے ہوئے سگریٹ کا کش لے کر کہا ''سیدھی طرح کیوں نہیں کہتیں کہ سگریٹ پینا چھوڑ دو۔''

''کتنی مرتبہ کہا ہے۔ ہر بار آپ میری بات کو سگریٹ کے دھوئیں میں اڑا دیتے ہیں۔''

''تو پھر مت کہا کرو۔'' میں نے مشورہ دیا۔

''آپ خواہ مخواہ ناراض ہونے لگے۔'' بیوی مجھے منانے لگیں ''سگریٹ نوشی کا سب سے اہم فائدہ تو میں نے بتایا ہی نہیں۔''

''چلئے۔۔۔ یہ احسان بھی کر دیجیے۔'' میں نے طنز کیا۔

''سگریٹ پینے والا بوڑھا نہیں ہوتا۔'' بیوی نے سگریٹ نوشی کا سب سے اہم فائدہ بتایا۔

''یہ کیوں کر ممکن ہے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

بیوی نے جواب دیا۔ ''اس لیے کہ وہ بوڑھا ہونے سے پہلے مختلف بیماریوں میں مبتلا ہو کر جوانی ہی میں چل بستا ہے۔''

بیوی اخبار میں کینسر سوسائٹی کی جانب سے چھپا اشتہار دکھانے لگیں۔ اعداد و شمار دے کر بتایا گیا تھا کہ سب سے زیادہ ہونے والے کینسر کی اہم وجہ سگریٹ نوشی ہے اور کینسر سے ہونے والی اموات دوسرے نمبر پر ہیں۔ ڈبڈبائی آنکھوں سے بیوی کبھی مجھے اور کبھی اشتہار کو دیکھتی رہیں۔ مجھے محسوس ہوا جیسے وہ اس خواہش کا اظہار کر رہی ہیں کہ میں جلد بیوہ ہونا نہیں چاہتی، تا قیامت سہاگن رہنا چاہتی ہوں!

مجھے آتا ہوا غصہ کافور ہوا۔ میں بیوی کو سمجھانے کے لیے سگریٹ نوشی کا جواز پیش کرنے لگا۔ ''انسان فرشتہ نہیں ہے کہ وہ صرف خوبیوں کا مالک ہو۔ انسان میں کچھ برائیاں بھی ہوتی ہیں۔۔۔''

بیوی نے بات کاٹی۔ ''اور آپ میں یہ برائی ہے کہ صرف سگریٹ نوشی کرتے ہیں۔''

بیوی کی بات کو اٹھاتے ہوئے میں کہنے لگا۔ ''دوسروں کو دیکھئے۔ کیسی کیسی برائیوں میں مبتلا ہیں۔'' اپنے گال پیٹ کر توبہ توبہ کا ورد کرتے ہوئے میں لوگوں کی مختلف برائیاں گنانے لگا۔

''لوگ جوا کھیلتے ہیں۔ رات رات بھر گھر سے غائب رہتے ہیں۔ ریس کورس جاتے ہیں۔ اپنی کمائی پونجی گھوڑوں پر لٹاتے ہیں۔ کرکٹ اور فٹ بال پر سٹہ کھیلتے ہیں۔ مقروض ہو جاتے ہیں۔ شراب پیتے ہیں۔ اپنا ہوش نہیں رہتا۔ مدہوش ہو کر کسی گندے نالے میں پڑے رہتے ہیں۔ اور تو اور ناچ دیکھتے، گانا سنتے اور ادھر اُدھر۔۔۔''

بیوی نے مجھے آگے بولنے سے روک دیا ''آپ کے سوچنے کی حد بھی یہیں تک ہے۔ اس سے آگے مت بڑھیے گا۔''

"میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ مجھے ایسی ویسی کوئی لت نہیں ہے۔ صرف سگریٹ نوشی کرتا ہوں۔ آپ بھی شکر اور فخر کیجیے کہ آپ کا شوہر ایک شریف اور نیک انسان ہے۔" میں نے بیوی کے سمجھانے کی کوشش کی۔

بیوی زچ ہوتے ہوئے بولیں "آپ اتنے برے بھی کیوں ہیں۔ آخر آپ سگریٹ کیوں پیتے ہیں؟"

میں مجبوراً سوچنے لگا کہ میں سگریٹ کیوں پیتا ہوں۔ خوشی میں پیتا ہوں یا غم سے گھبرا کر سگریٹ پیتا ہوں۔ سرور کے لیے پیتا ہوں یا دماغ کی کھڑکیوں کو کھولنے کے لیے سگریٹ کے کش لیتا ہوں۔ وقت کاٹنے کے لیے پیتا ہوں کہ تنہائی سے گھبرا کر سگریٹ سلگاتا ہوں۔

دیر تک سوچتے رہنے پر بھی کوئی وجہ سمجھ میں نہ آئی کہ میں سگریٹ کیوں پیتا ہوں۔ بس ایک خواہش ہوتی ہے، ایک کسک سی اٹھتی ہے۔ دل چاہتا ہے تو ہاتھ سگریٹ کی جانب بڑھ جاتا ہے اور میں سگریٹ پینے لگتا ہوں۔ جب کوئی معقول وجہ دریافت نہ کر سکا تو میں نے جواب دیا۔ "بس، سگریٹ کی عادت پڑ گئی ہے۔"

"سگریٹ کی عادت پڑی کیسے؟" بیوی نے سوال کیا۔

میں نے سگریٹ کا کش لے کر بتایا۔ "ایسے۔۔۔ پہلے کے بعد دوسرا، دوسرے کے بعد تیسرا اور پھر ایک کے بعد ایک سگریٹ پیتے پیتے عادت پڑ گئی۔"

"آپ نے پہلا سگریٹ کب پیا تھا؟" بیوی باضابطہ تفتیش کرنے لگیں۔

"ٹھیک سے یاد نہیں پڑتا۔ شاید بچپن میں۔ چودہ پندرہ سال کی عمر کو بچپن ہی کہنا چاہیے۔ اس وقت فلم دیکھنا، ہوٹل جانا اور سگریٹ پینا بڑا ہونے اور آزادی کی نشانی سمجھا جاتا تھا۔ جلد بڑے ہونے کے شوق میں ہم دو چار دوستوں نے ایک سگریٹ پی کر تمباکو نوشی کی ابتدا کی تھی۔ شروع میں چوری چوری سگریٹ پیا کرتا تھا۔ جب میرا بڑا ہونا تسلیم کر لیا گیا تو میں اپنے سے چھوٹوں کے سامنے سگریٹ پینے لگا۔۔۔"

"اور اب تو آپ کو بارہ خون معاف ہیں۔" بیوی نے درمیان میں روک کر کہا "گھر میں دندناتے دھواں چھوڑتے یوں پھرتے ہیں جیسے آپ نہیں کوئی اسٹیم انجن ہے۔ ویسے دن میں آپ کتنے سگریٹ پیتے ہیں؟"

بیوی کے سوالوں سے تنگ آ کر میں نے کہا "آپ پولس والوں کی طرح یوں تفتیش کر رہی ہیں جیسے میں کوئی مجرم ہوں اور مجھ سے کوئی بہت بڑا جرم سرزد ہوا ہے۔ میں صرف سگریٹ ہی تو پیتا ہوں۔"

"آپ کے صرف سگریٹ پینے سے ہر مہینے تین سو روپے برباد ہوتے ہیں۔ دائمی نزلہ اور کھانسی کے سبب ڈاکٹر حضرات الگ فائدے میں ہیں۔ سگریٹ نوشی سے آپ کی صحت جو خراب ہوئی ہوگی، ہمیں ابھی اس کا اندازہ نہیں ہے۔ گھر کی فضا خراب ہے۔ کپڑوں میں تمباکو کی بو ہے۔ بچوں کے لیے غلط مثال قائم ہو رہی ہے۔" اور پھر بیوی نے منصف بن کر فیصلہ سنایا۔ "آپ کو سگریٹ نوشی ترک کرنی ہوگی۔"

میں خود بھی سگریٹ چھوڑنا چاہتا ہوں۔ کئی مرتبہ کوشش کی لیکن کبھی بھی تین چار گھنٹوں سے زیادہ سگریٹ نوشی ترک کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ میں نے بیوی کا فیصلہ قبول کرتے ہوئے کہا "اس پیکٹ کے ختم ہونے کے ساتھ میری سگریٹ نوشی بھی بند۔"

بیوی نے میرے ہاتھ سے جلتا ہوا سگریٹ چھین کر بجھاتے ہوئے کہا "ابھی اور اسی وقت سے آپ کی سگریٹ نوشی ختم۔"

شام سے رات تک بیوی میری ٹوہ میں رہیں۔ مجھے باتوں میں لبھائے رکھا۔ کئی مرتبہ سگریٹ کی طلب ہوئی لیکن بیوی نے سگریٹ پینے نہ دیا۔ رات میں بھی بیوی نے پہرہ دے کر مجھے سگریٹ سے محروم رکھا۔ شام اور رات بالکل سوکھی یعنی بغیر سگریٹ کے گزری۔ صبح ہوئی تو تمباکو کی طلب مختلف طریقوں سے پریشان کرنے لگی۔ کسی صورت حاجت سے فارغ نہ ہونے دیتی تھی۔ بیوی کو سمجھایا کہ پرانی عادت ہے آہستہ آہستہ چھوٹے گی۔ منت سماجت کے بعد ایک سگریٹ کی اجازت ملی۔ سگریٹ کا پہلا کش لیا تو جیسے مشکل کا حل نکل آیا اور میں تیار ہو کر دفتر چلا آیا۔

دفتر پہنچ کر اطمینان کا سانس اور سگریٹ کا کش لیا۔ بیوی سے

کیے ہوئے وعدے کو گھر پر ہی چھوڑا۔ شام تک دفتر میں معمول سے زیادہ سگریٹ پیے کہ گھر واپس ہونے کے بعد سگریٹ نوشی پر پابندی ہے۔ شام گھر پہنچا تو بیوی نے سلام دعا سے پہلے سوال کیا ''دفتر اور راستے میں آپ نے کتنے سگریٹ پیے ہیں؟''

معصوم بن کر میں نے جھوٹ بولا ''ایک بھی نہیں!''

میرے جواب کا یقین نہ کرتے ہوئے بیوی نے میری تلاشی لی اور ایک جیب سے سگریٹ کی ڈبی برآمد کر کے میری جانب قہر آلود نگاہوں سے دیکھا۔

''میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ سگریٹ نوشی کی عادت آپ سے بھی پرانی ہے، مشکل سے چھوٹے گی۔ دفتر میں بغیر سگریٹ پیے کام سوجھتا نہ تھا۔ صرف دو سگریٹ پیے ہیں۔'' میں نے صفائی پیش کی۔

''ڈبیا میں دو سگریٹ باقی ہیں۔ یعنی آپ نے اٹھارہ سگریٹ پھونکے ہیں۔ آخر کیوں آپ اپنی اور ہماری صحت کے دشمن بنے ہوئے ہیں۔''

''ہماری صحت!'' میں نے حیرت سے دریافت کیا ''میرے سگریٹ پینے سے بھلا آپ کی صحت کیسے متاثر ہوتی ہے؟''

''سکنڈ ہینڈ اسموکنگ یعنی آپ کا چھوڑا ہوا دھواں دوسروں کی صحت بھی خراب کرتا ہے۔ آپ کے سگریٹ کا دھواں اچھی اور صاف ہوا کو آلودہ کرتا ہے اور ہم آپ کے ساتھ رہنے کی سزا خراب ہوا میں سانس لے کر بھگتتے ہیں۔ میرے خیال میں منے کی ناک جو بار بار بند ہوتی ہے وہ آپ کی تمباکو نوشی کی وجہ سے ہے۔ اگر میں یورپ یا امریکہ میں ہوتی تو آپ سے ہرجانہ وصول کرتی۔' پھر بیوی نے فرسٹ اور سکنڈ ہینڈ اسموکنگ کے اثرات پر روشنی ڈالنے کے بعد التجا کی۔ 'ہماری خاطر آپ سگریٹ نوشی سے پرہیز کیجیے۔ پلیز۔''

میں نے پھر سگریٹ نوشی ترک کرنے کا وعدہ کیا۔ شام اور رات بغیر سگریٹ پیے گزاری۔ نیند نہ آتی تھی۔ ٹی وی دیکھنے، اخبار پڑھنے اور پہلو بدل بدل کر بستر پر لوٹنے کے بعد مشکل سے نیند آئی۔ صبح آنکھ جلد کھلی اور آنکھ کھلتے ہی سگریٹ کی طلب شدت سے ستانے لگی۔ مجبوری کا رونا رونے کے بعد صرف ایک سگریٹ پینے کی اجازت کیا ملی، جیسے بند تالے کی چابی مل گئی۔ تیار ہو کر وقت سے پہلے دفتر روانہ ہوا۔

دفتر پہنچتے ہی میں نے سگریٹ نوشی یوں شروع کی جیسے دفتر میں میرا یہی کام ہے۔ مجھے سگریٹ سے سگریٹ سلگاتا دیکھ کر ساتھیوں نے وجہ دریافت کی ''سگریٹ بہت زیادہ پی رہے ہو۔ کیا پریشانی ہے؟''

''بیوی۔'' مختصر جواب دے کر میں سگریٹ پینے میں مشغول ہو گیا۔

''وہ تو شادی سے ہے، اب کیا ہوا؟'' میرے ایک ساتھی نے وضاحت چاہی۔

''بیوی سگریٹ نوشی ترک کرنے پر اصرار کر رہی ہیں۔ گھر پر سگریٹ پینا منع ہے۔ اس لیے تمباکو نوشی کا کوٹا دفتر میں پورا کر رہا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''تم تمباکو نوشی ترک کیوں نہیں کر دیتے!'' ایک سگریٹ نہ پینے والے ساتھی نے مشورہ دیا۔

''یہ کام تمھارے لیے آسان ہے لیکن ہمارے لیے بہت مشکل!'' میری طرح سگریٹ کے عادی ایک دوسرے ساتھی نے جواب دیا۔

''سگریٹ نوشی ترک کرنا ناممکن تو نہیں، مشکل ضرور ہے۔''

میں نے اپنے خیال کا اظہار کر کے ایک ساتھی سے پوچھا ''تمھاری بیوی بھی ایک وقت سگریٹ نوشی ترک کرنے کے لیے تمھارے سر ہو گئیں تھیں، تم نے کیا کیا؟''

''میں نے انھیں بھی سگریٹ نوشی کا عادی بنا دیا۔ اب ہم دونوں سگریٹ پیتے ہیں۔ ہمارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ تم بھی کوشش کرو۔'' ساتھی نے جواب دینے کے ساتھ مشورہ بھی دیا۔

''عورت کا سگریٹ پینا نسوانیت کے خلاف اور عجیب سا لگتا ہے۔'' میں نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

''عجیب سا محسوس ہوتا تھا۔ لیکن اب عورتیں آزادیِ نسواں کا نعرہ بلند کر کے مردوں سے زیادہ سگریٹ نوشی کر رہی ہیں۔'' میرے ساتھی نے دلیل پیش کی۔

''لیکن میں نہیں چاہتا کہ بیوی میری برابری کرے۔ میں اکیلا ہی سگریٹ پینا چاہتا ہوں۔'' میں جواب دے کر خاموشی سے سگریٹ کے کش لینے لگا۔

دفتر میں خوب سگریٹ پینے کے بعد میں مجرم بنا ڈرتے ڈرتے گھر پہنچا تو گھر بدلا ہوا نظر آیا۔ مختلف مقامات سے ایش ٹرے غائب تھیں اور ان کی جگہ خوبصورت گل دان رکھے ہوئے تھے۔ ہر شے قرینے سے لگی تھی۔ سگریٹ کا کچرا ڈالنے اور راکھ جھاڑنے کے لیے کوئی مناسب جگہ نظر نہ آتی تھی۔ میز اور دیواروں پر کیلنڈر اور تصویریں رکھی یا ٹنگی ہوئی تھیں جن پر تمبا کو نوشی کے خلاف فقرے درج تھے۔

بیوی نے مجھے دور ہی سے سونگھ کر ناراض ہوتے ہوئے کہا ''محسوس ہوتا ہے آج دفتر میں آپ نے کام نہیں کیا۔ صرف سگریٹ پھونکتے رہے ہیں۔ جائیے، نہا دھو کر اور معطر ہو کر آئیے۔ آپ کی سگریٹ نوشی ترک کرنے سے اس مہینہ جو رقم بچنے والی ہے، اس سے میں نے آپ کے دوستوں کے لیے پارٹی کا اہتمام کیا ہے۔''

اس اچانک پارٹی کے اہتمام سے خوشی بھی ہوئی اور غصہ بھی آیا۔ غصہ ضبط کرتے ہوئے میں پارٹی میں شریک ہوا۔ بیوی نے اعلان کیا کہ ان کے سرتاج کی ترکِ سگریٹ نوشی کی خوشی میں پارٹی منعقد ہو رہی ہے۔ انھوں نے شرکا سے میرے ثابت قدم رہنے کے لیے دعا کی درخواست کی۔

احباب نے استفہامیہ نگاہوں سے میری جانب دیکھا۔ میں نے گردن جھکائی تو احباب نے تالیاں بجا کر میری ترکِ سگریٹ نوشی کے اعلان کا خیر مقدم کیا۔ پر تکلف عشائیہ کے بعد یار دوستوں نے سگریٹ پیا کہ مجھ پر عائد کردہ پابندی سے وہ مستثنٰی تھے۔ میں حسرت سے انھیں تمبا کو نوشی کرتے دیکھتا رہا اور ان کے چھوڑے ہوئے دھوئیں کو پیتا رہا۔

پارٹی ختم ہونے کے بعد میں نے اپنا غصہ اتارا ''پرانی عادت ہے مشکل سے ختم ہوگی۔ میں نے سگریٹ نوشی ترک کرنے کا آپ سے وعدہ کیا ہے اور سنجیدگی سے کوشش بھی کر رہا ہوں۔ آہستہ آہستہ عادت چھوٹ جائے گی۔ یہ تماشا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔''

''عادتیں آہستہ آہستہ نہیں چھوٹتیں بلکہ عادتیں آہستہ آہستہ پڑتی ہیں۔ آپ کو سگریٹ نوشی ترک کرنے کا فیصلہ اور عمل یکدم سے کرنا ہوگا، جس کا اعلان آج پارٹی میں ہو چکا ہے۔''

''میں یکلخت سگریٹ نہیں چھوڑ سکتا۔''

''آپ کو سگریٹ چھوڑنا ہی پڑے گا۔ میں دیکھوں گی کہ آپ

۔۔۔۔البتہ مشاعروں کی بدولت چند روز جھوٹا عاشق بننا پڑا۔ ایک خیالی معشوق کی چاہ میں دستِ جنوں کی وہ خاک اُڑائی کہ قیس و فرہاد کو گرد کر دیا۔ کبھی نالۂ نیم شبی سے راہ سکوں کو ہلا ڈالا تو کبھی چشمِ دریا بار سے تمام عالم کو ڈبو دیا۔ آہ و فغاں کے شور سے کروبیاں کے کان بہرے ہوگئے۔ شکایتوں کی بوچھار سے زمانہ چیخ اٹھا۔ طعنوں کی بھرمار سے آسمان چھلنی ہوگیا۔ جب رشک کا تلاطم ہوا تو ساری خدائی کو رقیب سمجھا۔ یہاں تک کہ اپنے آپ سے بدگمان ہوگئے۔ جب شوق کا دریا امڈا تو کششِ دل سے جذبِ مقناطیسی اور قوت کہربائی کا کام لیا۔ بارہا تیغِ ابرو سے شہید ہوئے اور ایک ٹھوکر سے جی اُٹھے۔

دیباچۂ مسدسِ حالی

سگریٹ کیسے نہیں چھوڑتے۔"

"دیکھئے آپ میرے ذاتی معاملات میں دخل دے رہی ہیں۔"

ہمارے درمیان بحث چھڑ گئی۔ میری آواز کرخت اور اونچی ہوئی تو بیوی کے آنسو نکل پڑے اور بیوی کے آنسو میرا غصہ بہا لے گئے۔ بیوی بھی یکلخت سگریٹ نوشی ترک کرنے کے مطالبہ سے دستبردار ہوئیں۔ ہم نے بتدریج تمبا کو نوشی ترک کرنے کا پروگرام بنایا۔ طے پایا کہ میں سگریٹ کی ڈبیا نہیں خریدوں گا۔ ایک ایک سگریٹ خرید کر اپنی عادت کی تسکین کروں گا۔ میں کسی سے سگریٹ مانگ کر نہیں پیوں گا۔ ابتدا میں چوبیس گھنٹوں کے لیے چھ سگریٹ کا کوٹہ مقرر رہا۔ دو مہینوں بعد اس میں دو سگریٹوں کی کمی ہوگی۔ مقررہ سگریٹوں کے دام کے علاوہ پیسے نہیں ملیں گے۔ گھر پر کسی صورت سگریٹ نوشی نہیں ہوگی۔ میں اپنے ساتھ دیاسلائی یا لائٹر نہیں رکھوں گا۔ ہر دن صبح میں سگریٹ نوشی کے مضر اثرات پر ایک مضمون کا مطالعہ کروں گا اور شام میں بیوی کے سامنے سگریٹ نوشی ترک کرنے کے وعدہ کا اعادہ کروں گا۔ وغیرہ وغیرہ۔

سگریٹ نوشی ترک کرنے کے لیے وضع کیے گئے قوانین پر عمل ہونے لگا۔ میں صبح بیدار ہونے کے بعد اپنی طلب پوری کرنے کے لیے باہر چلا جاتا۔ گلی کے نکڑ کے پنساری سے ایک سگریٹ خریدتا اور سڑک پر سگریٹ پی کر گھر واپس آتا۔ ایک صبح جب میں سگریٹ پینے باہر جا رہا تھا تو بیوی نے پانی کا لوٹا تھماتے ہوئے طنز کیا۔ "سگریٹ تو چھوٹ نہیں سکتا۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ آپ پانی کا لوٹا بھی ساتھ لیتے جائیں۔"

میں خاموش رہنے کے سوائے کیا کر سکتا تھا۔

پنساری سے چار سگریٹ خرید کر دفتر جاتا اور واپس ہوتے ہوئے شام میں ایک سگریٹ خریدتا۔ پنساری سگریٹ دیتے وقت کچھ سوچ کر مسکرانے لگتا۔ میں اس سے گھڑی دو گھڑی ٹھہر کر بات کرنے لگا۔ شناسائی بڑھی تو میں ادھار سگریٹ لینے لگا۔ دن میں تین پیکٹ سے زیادہ سگریٹ پھونکنے والے کا گزارہ بھلا چھ سگریٹ پر کیسے ہوتا! پنساری سے ادھار اور احباب کے مفت سگریٹوں سے میرا کام چلنے لگا۔

گھر سے باہر سگریٹ پینے کی شرط میرے لیے مشکل کا باعث بنی رہی۔ گھر سے باہر نکلنے کے بہانے تلاش کرنے لگا۔ بازار سے سودا سلف اور دوسری چیزیں لانے لگا، جو میں پہلے کبھی نہ کرتا تھا۔ عمداً کوئی شے بھول کر آتا اور پھر بازار جا کر سگریٹ پی آتا۔ دوست احباب سے بھی غیر ضروری ملنے لگا۔ قصہ مختصر گھر اور باہر کے درمیان آوک جاوک ہونے لگی۔ رات میں دروازہ کھٹکھٹایا جانے کا بہانہ بناتا اور باہر آ کر سگریٹ نوشی کرتا۔ بیوی جلد تاڑ گئیں کہ میری غیر ضروری بھاگ دوڑ سگریٹ نوشی کے لیے ہے۔ اور جب پنساری ادھار وصول کرنے آیا تو ان کا شک یقین میں بدل گیا۔ غصے اور بے بسی سے ان کے آنسو بہہ نکلے کہ میں نے ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے۔

میں نے قسمیں کھا کر انہیں یقین دلایا "میں نے ایسا دانستہ نہیں کیا ہے۔ سگریٹ کی لت نے مجھ سے وعدہ خلافی اور بے ایمانی کروائی ہے۔ کم بخت سگریٹ میرے منہ سے نہیں چھوٹتا۔ میں اپنی عادت کا غلام ہوں۔ یقین کرو میں خود اس لعنت سے چھٹکارا چاہتا ہوں۔ خدارا میری مدد کرو۔"

بیوی آنسو پونچھ کر میری مدد کرنے کے لیے تیار ہوئیں۔ اپنی سہیلیوں سے مشورہ کیا۔ ایک سہیلی نے بتایا کہ لوہا ہی لوہے کو کاٹتا ہے۔ ایک عادت کو چھوڑنے کے لیے کوئی دوسری کم نقصان دہ عادت ڈال لینی چاہیے جس سے چھٹکارا پانا آسان ہوتا ہے۔

سگریٹ نوشی کی عادت سے پہلے ہی سے مجھے چائے اور کافی کا روگ پڑ چکا تھا۔ اب چیونگم، ناس اور پان کی عادتوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ چیونگم چبانا بچکانہ شوق ہے اور پھر میری دیکھا دیکھی بچے بھی جگالی کرنا شروع کر سکتے ہیں۔ ناس کے استعمال سے بیوی کو میرے ستیاناس ہونے کا گمان ہونے لگا۔ آخر بات پان پر ٹھہری۔ میں نے پان کھانا شروع کیا۔ چار دن تک پان کھانے اور گھر کے در و دیوار کو رنگنے کے باوجود بھی سگریٹ کی طلب کم نہ ہوئی۔ الٹا میں پان کے ساتھ سگریٹ نوشی کرنے لگا۔

کچھ زیادہ ہی سرور حاصل ہوا۔ یک نہ شد دو شد، اب طبیعت سگریٹ کے ساتھ پان بھی طلب کرنے لگی۔

اپنے تئیں ناکام ہو کر بیوی مجھے سگریٹ نوشی ترک کروانے والے ماہر کے پاس لے گئیں۔ موصوف نے مختلف سوالات کر کے مجھے پریشان کیا۔ آپ سگریٹ کب سے پیتے ہیں؟ کیوں پیتے ہیں؟ یہ عادت کیسے پڑی؟ کیا کوئی پریشانی یا غم لاحق ہے؟ کیا آپ ناکام عاشق ہیں؟ کیا آپ شاعری کرتے ہیں؟ کس برانڈ کا سگریٹ پیتے ہیں؟ دن میں کتنے سگریٹ پھونکتے ہیں؟ سگریٹ کب پیتے ہیں؟ کیسے پیتے ہیں؟ دھواں کتنی دیر تک اندر رکھتے ہیں؟ دھواں منہ سے نکالتے ہیں یا ناک اور کان سے بھی دھواں چھوڑتے ہیں؟ سگریٹ کون سے ہاتھ میں اور کس انداز سے پکڑتے ہیں؟ سگریٹ کیسے جلاتے ہیں؟ سگریٹ اطمینان سے پیتے ہیں یا جلدی جلدی کش مارتے ہیں؟ ایک منٹ میں کتنے کش لگاتے ہیں؟ خالص سگریٹ پیتے ہیں یا تمباکو میں کچھ دوسری اشیا بھی ملاتے ہیں؟ سگریٹ اکیلے پیتے ہیں یا دوست احباب کے ساتھ؟ ان کے نام اور ان کی عادات واطوار بتلایئے؟ سگریٹ پورا پیتے ہیں یا کچھ بچا کر پھینک دیتے ہیں؟ اگر بچاتے ہیں تو کتنا؟ سگریٹ کیسے بجھاتے ہیں؟ سگریٹ نہ پئیں تو کیا ہوتا ہے؟ اور آپ سگریٹ کیوں چھوڑنا چاہتے ہیں؟

آخری سوال کے جواب میں، میں نے بیوی کی جانب دیکھا جیسے کہنا چاہتا ہوں کہ ان کے سبب! لیکن میرے جواب دینے سے پہلے بیوی نے کہا ''یہ سگریٹ پینا کہاں چھوڑنا چاہتے ہیں۔ میں چھڑوانا چاہتی ہوں۔''

جواب سن کر معالج نے کہا ''تب تو علاج مشکل ہے لیکن کوشش کرنے میں ہرج بھی نہیں ہے۔''

معالج نے جتنے سوالات کیے تھے سگریٹ نوشی ترک کرنے کے لیے اتنے بلکہ کچھ زیادہ ہی مشورے دیے۔ پہلا مشورہ تھا کہ سگریٹ کی طلب ستانے لگے تو اپنا دھیان کسی دوسری طرف لگایئے۔ موصوف کا مشورہ سن کر مجھے اپنا ایک چھوڑا ہوا پرانا شوق یاد آیا۔ میں نے شاعری کو جلا بخشنے کا ارادہ کیا۔ جب بھی سگریٹ کی طلب ہوگی تو میں ایک شعر کہوں گا۔ سگریٹ نوشی ترک کرنے کے لیے میں نے شعر گوئی شروع کی۔ پہلا مصرعہ ہو جاتا لیکن دوسرے مصرعے کے لیے سگریٹ پینا پڑتا، بعض مرتبہ تین چار سگریٹ پھونکنا پڑتا تب کہیں شعر مکمل ہوتا۔ اصلاح کی غرض سے سگریٹ نوشی ترک کرنے کی کوشش میں کہا ہوا کلام استاد کو پیش کیا تو ارشاد ہوا۔ 'تم شاعری بند کر دو اور سگریٹ نوشی جاری رکھو۔ اس سے ادب کی صحت برقرار رہے گی اور ساتھ میں تمہاری عزت بھی!'

معالج نے کئی دوسرے مشورے بھی دیے تھے۔ سگریٹ نکالنے میں دیر کرو۔ سگریٹ کو چھپا کر رکھ دو اور اپنا وقت اسے ڈھونڈنے میں لگاؤ۔ جب سگریٹ مل جائے تو اسے جلانے کی بجائے سگریٹ سے کھیلتے رہو۔ طلب ستانے پر سگریٹ کے ٹکڑے کر دو اور سب سے چھوٹا ٹکڑا منتخب کر کے ہونٹوں سے پکڑے رہو۔ دوسرے ٹکڑوں کو کچرے میں پھینک دو اور ہو سکے تو ہونٹوں کے درمیان پھنسے ٹکڑے کو بھی پھینک دو۔ جب ناکام ہو جاؤ تو سگریٹ جلانے کا ارادہ کرو۔ جیب میں دیا سلائی یا لائٹر کسی صورت نہ رکھو۔ دوسروں سے مانگ کر یا کچن میں جا کر سگریٹ جلاؤ۔ سگریٹ جلانے کے بعد کش لینا بھول جاؤ اور سگریٹ بجھا دو۔ کش لینے کے لیے طبیعت مجبور کرے تو سگریٹ کو ہونٹوں سے دور رکھ کر کش لگاؤ اور پھر سگریٹ کو بجھا دو۔ دوسری تیسری بلکہ ہر مرتبہ یہی عمل دہراؤ۔ اس طرح جلد ہی سگریٹ نوشی ترک ہو جائے گی۔

موصوف کے قیمتی مشورے سن کر مجھے، سر درد کے علاج کے تعلق سے ایک سواری کے پیچھے لکھا یہ شعر یاد آیا ؎

دردِ سر کے واسطے صندل لگانا ہے مفید
اس کو گھسنا اور لگانا دردِ سر، یہ بھی تو ہے

سوچ سمجھ اور ناپ تول کر سگریٹ پینا اگر بس میں ہوتا تو میں سگریٹ نوشی کرتا ہی کیوں۔ سگریٹ نوشی ترک کروانے والے ماہر کے مشورے دھرے کے دھرے رہ گئے اور میری سگریٹ نوشی جاری رہی۔ کبھی زیادہ تو کبھی کم لیکن ختم نہ ہوئی۔ ہر طرف اور ہر طریقے سے مایوس ہو کر بیوی نے سگریٹ نوشی ترک کروانے کی مہم کو خیر باد کہا اور مجھے سگریٹوں کے حوالے کر دیا۔ میں سگریٹ جلاتا

تو وہ اٹھ کر دور چلی جاتیں۔ میں پہلے کی طرح بلکہ کچھ زیادہ ہی سگریٹ نوشی کرنے لگا۔ سگریٹ زیادہ مزے دار محسوس ہو رہے تھے۔ تمباکو کی بھینی بھینی بو مسحور کر دیتی تھی۔

اچانک ایک رات میری نیند ایک بھیانک خواب کے سبب بیدار ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ ادھ جلے سگریٹوں کی چتا پر میں لوٹن کبوتر کی طرح لوٹ رہا ہوں۔ درد اور تکلیف سے چلا رہا ہوں۔ ڈاکٹر دوائیں دے رہے ہیں لیکن کوئی افاقہ نہیں ہوتا۔ احباب بے بس کھڑے آرام کے لیے دعائیں مانگ رہے ہیں۔ بیوی اور بچوں کا روتے روتے برا حال ہے۔ دیر تک میں اپنے آپ کو بہلاتا رہا۔ نیند اڑ چکی تھی۔ کوشش کے بعد دو گھڑی سویا تھا کہ پھر وہی خواب نظر آیا۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ سگریٹ مجھے جانی دشمن دکھائی دینے لگا۔ میں نے سگریٹ کی ڈبیا کو اسی وقت کچرے میں پھینکا۔ ایش ٹرے کو ہٹایا اور سگریٹ نوشی سے ہمیشہ کے لیے توبہ کی۔

وہ رات اور آج کا دن، چھ مہینے بیت چکے ہیں میں نے سگریٹ کو منہ کیا ہاتھ تک نہیں لگایا۔ اور ہاں بیوی بھی اپنی اور میری کامیابی پر خوش ہیں۔

عابد معز صاحب کا تعلق حیدر آباد (بھارت) سے ہے۔ پیشہ کے اعتبار سے ڈاکٹر ہیں۔ اُردو ادب سے ان کی محبت بہت پرانی ہے۔ طنز و مزاح ان کا خصوصی میدان ہے۔ اُردو طنز و مزاح سے حوالے سے ان کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ ماہنامہ ''شگوفہ'' حیدر آباد کے مدیر بھی رہ چکے ہیں۔ ''شگوفہ'' کے علاوہ بہت سے ادبی وغیر ادبی جرائد میں ان کے مزاحیہ مضامین تسلسل کے ساتھ شائع ہوتے رہے ہیں۔ بہت نفیس طبعت کے مالک ہیں۔

مزاحیے

شافعہ خان

عبداللہ

عبداللہ نے کہیں سنا تھا کہ ایک دور دراز علاقے کی جامع مسجد میں جمعے کی نماز کے بعد اجتماعی دعا کروائی جاتی ہے۔ وہ اُسی سلسلے میں بروز جمعہ نیا کرتا پہنے عطر لگا کر جامع مسجد میں خطبہ سن رہا تھا۔ اُس نے ایک پرچی پر اپنی دعا لکھ کر مولوی صاحب تک پہنچادی تھی۔

آخر کار وہ وقت آ گیا جب مولوی صاحب منبر پر بیٹھے دعا فرما رہے تھے۔۔۔ ملکِ عزیز کے تمام غریبوں، مسکینوں، یتیموں، بیماروں سمیت ملک کے حالات کی بہتری کے لیے دعا فرمائی۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے لوگوں کی دی ہوئی پرچیوں پر ذاتی دعاؤں کی سماعت ہوئی۔

آخر کار عبداللہ کی پرچی کا نمبر بھی آ گیا۔ مولوی صاحب کی آواز مائیک پر گونجی "اے پروردگار، ہمارے عبداللہ بھیا کو اولادِ نرینہ عطا فرما۔ آمین۔"

مولوی صاحب کے ساتھ کئی سو لوگوں کے مجموعے نے آمین کہا۔

عبداللہ بھیا پر تھوڑی رقت طاری ہو گئی تھی۔ آنکھوں میں نمی ڈول رہی تھی۔ ان کی اِس رقت آمیز "آمین" کی آواز کو سن کر ہی ساتھ بیٹھے بندے نے بھانپ لیا کہ ہو نہ ہو یہی عبداللہ بھیا ہیں۔ دعا کے بعد سرگوشی میں مسجد کے باہر ملنے کی تمنا ظاہر کی۔

عبداللہ بھیا مسجد سے باہر نکل کر اپنی جوتیاں ڈھونڈنے میں مصروف تھے کہ وہی بندہ آ دھمکا۔

"عبداللہ بھائی۔۔۔"

عبداللہ نے مڑ کر دیکھا اور خوش مزاجی سے دانت نکال دیئے

"جی جی! فرمائیے۔"

"دراصل میں ایک حکیم صاحب کو جانتا ہوں جو اِسی قسم کی بیماریوں کا ماہرانہ علاج کرتے ہیں اور ماشاءاللہ ہزاروں لوگ اُن کے علاج سے فیضیاب ہو کر صاحبِ اولاد ہو چکے ہیں۔"

عبداللہ کی آنکھوں میں امید کے جگنو جگمگانے لگے "کیا آپ مجھے حکیم صاحب کا پتا سمجھا سکتے ہیں؟"

"جی جی وہی تو بتانے آیا ہوں۔۔۔"

اُن صاحب نے ایک پرچی پر حکیم صاحب کا پتا لکھ کر عبداللہ بھیا کے حوالے کیا اور سلام لے کر روانہ ہوئے۔

عبداللہ دل ہی دل میں شکر گزار ہو کر سوچ رہا تھا کہ اس دنیا میں آج بھی بھلے مانس لوگ موجود ہیں۔

لوکل بس میں سوار عبداللہ میاں حکیم صاحب سے ملنے کو رواں دواں تھے۔ بس اسٹاپ پر اتر کر راستہ پوچھتے منزل کی طرف

کسی انسان کا مرغا بننا اگرچہ ایک تکلیف دہ اور ناقابلِ یقین عمل ہے لیکن معاشرے میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو کسی نہ کسی حوالے سے مرغا بنتے ہیں۔ ہمارے ملک میں ٹریفک کے پیچیدہ نظام نے انسان کو مرغا بننے پر مجبور کر ہی دیا ہے۔ زندگی کے دیگر شعبوں میں بھی انسان مرغا بنے دکھائی دیتے ہیں۔ زمانہ طالبعلمی کے ابتدائی ایام میں خاص طور پر مرغا بننے کی مشق کروائی جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ان میں سے اکثر لوگ عملی زندگی میں بھی تختۂ مشق بنے رہتے ہیں۔

شامتِ اعمال از اظہر سلیم مجوکہ

گامزن ہوئے کہ راہ میں ایک مزار نظر آیا۔ کچھ ہرے چنے پہنے لوگوں نے عبداللہ بھیا کو گھیر لیا۔

''ہر مراد پوری ہوگی بابا۔۔۔ ہر مراد پوری ہوگی۔۔۔ ایک بار سچے سرکار کو حاضری دے تیری ہر مراد پوری ہوگی۔''

یوں تو عبداللہ ان باتوں پر اعتقاد نہیں رکھتا تھا مگر ہرے چنے والے لوگوں کے اس قدر وثوق سے پیش گوئی کرنے پر عبداللہ کا اعتقاد بھی متزلزل ہونے لگا۔ عبداللہ کے قدم یہ سوچ کر سچے سرکار کے مزار کی دہلیز پار کرنے لگے کہ کیا پتا وسیلے سے مراد بر آئے۔ عبداللہ میاں ایمان کی کرچیاں بکھیرتے، بدعت کے مرتکب ہوتے، سچے سرکار کی قبر کے سرہانے سر ٹیکے، دعاؤں میں مشغول، اولادِ نرینہ کی خواہش دل میں لیے بیٹھے تھے، دل کا غبار کچھ کم ہوا تو اُلٹے قدموں باہر نکلنے لگے۔ دروازے پر پہنچے ہی تھے کہ ہرے چنے والے لوگوں نے روک لیا۔

''زیارت کا نذرانہ تو دیتا جا۔۔۔ تیری مراد جلد پوری ہوگی۔۔۔!''

اب عبداللہ میاں مخمصے میں پڑ گئے۔ ایسا نہ ہو کہ مراد بر نہ آئے اور رقم ضائع ہو جائے۔ پر کچھ دیئے بنا بھی جان چھوٹنے والی نہ تھی۔ آخر کار بڑی دقت سے دل پر پتھر رکھ کر بٹوہ کھولا۔ سامنے پانچ ہزار کا نوٹ چمک رہا تھا۔ عبداللہ میاں نے اُس نوٹ کو چھوا تو ساتھ ہی چمٹے ہرے چنے والوں کی نظریں چمک اٹھیں۔ عبداللہ میاں نے وہ نوٹ انگلیوں سے پیچھے کر دیا، ساتھ ہی پانچ سو کا ہرا نوٹ موجود تھا۔

اُس کو بھی پیچھے کرتے ہوئے سو روپے کا لال کرارا نوٹ نکال کر ہرے چنے والوں کے حوالے کیا۔ ہرے چنے والوں کی خوشی غارت ہوگئی۔

عبداللہ میاں بے نیازی سے آگے چلتے بنے۔

لوگوں سے پوچھتے پچھاتے حکیم صاحب کے مطب پر جا پہنچے۔ اپنی باری آنے پر کچھ ہچکچاتے ہوئے حکیم صاحب سے اپنا مدعا بیان کیا۔ کچھ نجی سوالات پوچھنے کے بعد حکیم صاحب نے ایک معجون کی بوتل اور پھکی دی اور تین ماہ تک علاج جاری رکھنے کو کہا۔ ساتھ ہی ساتھ تین ماہ میں خوشخبری کی گارنٹی بھی دے دی۔

دیکھتے ہی دیکھتے تین ماہ گزر گئے مگر خوشخبری کا کوئی نام و نشان نہ تھا۔ حکیم صاحب معجون بدلتے جاتے اور دلاسے دیتے جاتے۔ مگر مراد بر نہیں آرہی تھی۔

ایک دن عبداللہ میاں حکیم صاحب سے ملاقات کے بعد بس میں بیٹھے باہر جھانک رہے تھے۔ راستے میں کئی دیواروں پر جلی حروف میں لکھا نظر آیا ''عامل جنید بنگالی'' اُس کے نیچے وہی عبارت ''ہر مراد پوری ہوگی'' کی نوید موجود تھی۔ مزید لکھا تھا۔

''ہمارے ہاں عاملوں کے پاس روٹھے محبوب کو منانے سے لے کر پسند کی شادی بے اولادی سے لے کر کسی کی جان لینے تک ہر کام کے دعوے موجود ہوتے ہیں۔''

عبداللہ میاں پہلے ہی نا امیدی کی کیفیت میں تھے اور نا امیدی کفر ہے اور جب انسان پہلے ہی کفر کا ارتکاب کر چکا ہو تو مزید کفر کرتے اُسے ذرہ بھر بھی شرم نہیں آتی۔ جیب سے موبائل نکال کر عامل جنید بنگالی کو کال کر بیٹھے۔

''ہیلو۔۔۔'' بھاری آواز سنائی دی۔

''ہیلو۔۔۔ عامل جنید صاحب بات کر رہے ہیں؟''

''نہیں میں اُن کا اسسٹنٹ ہوں۔۔۔ کیا کام ہے؟''

جی۔۔۔ وہ۔۔۔ میرا ایک مسئلہ ہے۔۔۔'' عبداللہ کی آواز حلق میں اٹکنے لگی۔

گزارے لائق

ایک لاہوریئے سے، جو ملکہ کا جلوس دیکھ کر آیا تھا، کسی نے پوچھا ''کیسی ہے ملکہ؟''

''بس گزارے لائق ہے!'' لاہوریے نے جواب دیا۔

پرانی آنکھیں نئے خواب از امجد اسلام امجد

''جمعرات کی شام سات بجے آستانے پر آجانا۔'' مختصر بات کے بعد فون بند ہوگیا۔

خدا خدا کر کے جمعرات کا دن بھی آن پہنچا۔ ٹھیک سات بجے عبداللہ میاں آستانے پر موجود تھے۔

عامل صاحب مصروف تھے۔ عبداللہ کو کمرے کے باہر بٹھایا گیا تھا۔ اندر سے اگربتی کی خوشبو آرہی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ کبھی تیز کبھی ہلکی آواز میں منتر پڑھنے کی آواز۔۔۔ اس کے بعد ایک عورت کی دلخراش چیخ۔۔۔ عبداللہ کو کچھ خوف محسوس ہوا کہ جانے مجھ پر کیا گزرنے والی ہے۔ اضطراب کے مارے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد دو خواتین کمرے سے باہر آئیں۔ ایک نے دوسری کو تھام رکھا تھا۔ غالباً اُس خاتون کے اندر سے جن نکالا گیا تھا۔

عبداللہ میاں ایک چیلے کے ساتھ خراماں خراماں چلتے عامل صاحب کے سامنے جا بیٹھے۔ عامل صاحب لال آنکھوں سے عبداللہ کو گھورنے میں مشغول تھے۔ عبداللہ میاں کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔

''بول! کیا مسئلہ ہے تیرا۔۔۔!!'' عامل نے غصیلی آواز میں پوچھا۔

''وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ میں۔۔۔ میں بے اولاد ہوں۔۔۔''

عبداللہ منمنایا۔

عامل نے اپنا بایاں ہاتھ عبداللہ کے سر پر رکھا اور منتر پڑھنے لگا۔ ساتھ ہی رکھے سلگتے کوئلوں پر کچھ چھڑکنے لگا۔

کچھ ساعتوں بعد عامل نے لال آنکھیں کھولیں اور بولا ''بڑا گہرا اثر ہے۔۔۔ اماوس کی رات میں توڑ کرنا پڑے گا۔''

''جی۔۔۔ جی۔۔۔ کیا مطلب؟''

''سفلی ہے تجھ پر۔۔۔ تیرا دشمن نہیں چاہتا کہ تو صاحب اولاد ہو۔۔۔ کالے بکرے کے خون سے یہ اثر زائل کرنا پڑے گا۔''

اگلی ہی ملاقات پر کالے بکرے کی رسی تھامے عبداللہ میاں آستانے پر موجود تھے۔ حلال بکرے کو چھری پھیر کر حرام کر دیا گیا۔ عبداللہ اس بات سے واقف نہ تھا کہ رات آستانے پر جی سے دعوت اڑائی جائے گی اور بکرے کی ایک ران عامل صاحب اکیلے ہی تناول فرمائیں گے۔

عامل صاحب نے سفلی کا عمل زائل ہونے کی خوشخبری دے دی ساتھ ہی ساتھ ہر جمعرات آستانے پر حاضری کی تلقین بھی کی۔ چند مزید لوگوں کو عامل صاحب کی کرامات بتانے کا وعدہ بھی لے لیا۔

ایک ماہ تک یونہی حاضری لگتی رہی۔

پھر ایک دن عبداللہ میاں یہ دیکھ کر دل پکڑ کر رہ گئے کہ اب آستانہ وہاں موجود ہی نہ تھا۔ عامل صاحب اپنا بوریا بستر سمیٹ کر کسی دوسرے شہر منتقل ہو چکے تھے۔

دو دن رنج کے عالم میں عبداللہ میاں گھر سے باہر نہ نکلے۔ آہستہ آہستہ اس فریبی دنیا سے انکا یقین زائل ہوتا جا رہا تھا۔

اتوار کا دن آگیا۔ عبداللہ میاں یونہی دلبرداشتہ سے ہو کر سنڈے میگزین کھول کر بیٹھے تھے اور افسوس کر رہے تھے کہ آخر یہ میگزین پہلے ہاتھ کیوں نہ لگا۔

(اگر ہماری قوم تواتر سے سنڈے میگزین پڑھتی رہے تو یقین جانیے وطنِ عزیز میں کوئی بے اولاد اور گنجا باقی نہ رہے۔)

عبداللہ میاں کو ایک معروف انفرٹیلیٹی سینٹر کا اشتہار نظر آیا۔ ساتھ ہی اولاد ہونے کی سو فیصد گارنٹی، ساتھ ہی ساتھ منی بیک گارنٹی۔

عبداللہ میاں کی تو آنکھیں چمکنے لگیں۔ اگلے ہی دن وہاں پہنچ گئے۔

ڈاکٹر کے سامنے بیٹھے عبداللہ میاں آج اتنے نروس نہ تھے۔

ڈاکٹر صاحب نے بڑے ہی مہذبانہ انداز میں پوچھا ''کیا کچھ ٹیسٹ پہلے کروائے ہیں آپ نے؟''

''نہیں ڈاکٹر صاحب۔۔۔''

ڈاکٹر صاحب نے پرچی پر کچھ ٹیسٹ لکھ کر دیئے۔ یہ ٹیسٹ کروالیں اور اگلے وزٹ پر اپنی وائف کو ساتھ لے کر آئیں تاکہ ان کے بھی کچھ ٹیسٹ ہوسکیں۔

''ہیں جی؟'' عبداللہ میاں ششدر ہوئے۔

''جی میری بیوی تو نہیں ہے۔۔۔گھر پر ایک اماں ہے اور میں۔۔۔ ہمارا اس دنیا میں تیسرا کوئی نہیں ہے۔ اب اماں نے کب سے رٹ لگا رکھی ہے کہ مجھے مرنے سے پہلے تیری اولاد دیکھنی ہے۔۔۔آپ کہتے ہیں تو اماں کو ساتھ لے آؤں؟''

ڈاکٹر صاحب نے بیل بجائی اور وارڈ بوائے سے کہا ''ان صاحب کو باہر لے جاؤ۔۔۔کوئی معجزہ ہی ان کی مراد پوری کرسکتا ہے۔''

☆☆☆☆

ڈھابے نما ہوٹل میں کافی رش تھا۔ ایک جگہ گورنمنٹ اسکول ٹیچر بیٹھا تھا جو صرف ماہانہ تنخواہ وصول کرنے اسکول جاتا تھا۔ ساتھ ہی کریانے والا تھا جو اشیائے خورد و نوش تو اچھی کوالٹی کی دیتا مگر ان کو تولنے میں ڈنڈی مار جاتا تھا۔ تھوڑا فاصلے پر ایک ادارے کا کلرک تھا جس کی اوپر کی آمدنی تنخواہ سے زیادہ تھی۔ اسی اثناء میں گوالا ڈھابے میں داخل ہوا جو دودھ میں پانی ملا کر اس کو دوگنا کر دیتا تھا۔ ڈھابے میں گہما گہمی اور شور تھا۔ ٹیلیویژن میں نواز شریف کو سزا ہو جانے کی خبر چل رہی تھی۔ لوگ آپس میں چہ مگوئیاں کر رہے تھے۔

''اچھا ہوا جو اس کو سزا ہوئی۔۔۔''

''لندن میں فلیٹس، مانچسٹر میں رئیل اسٹیٹ بزنس، سعودی عرب میں اسٹیل ملز، پاکستان میں شوگر ملز، لاہور میں ۱۷۰۰ ایکڑ عالیشان محل، ڈیری اور پولٹری بزنس، منی لانڈرنگ کرپشن، سپریم کورٹ پر حملہ، مارشل لاء لگوانا، دشمن ملک سے تعلقات اور وطن سے غداری۔۔۔''

غرض کہ اُس کے تمام تر ہی کالے کرتوت زیرِ بحث آگئے۔ عبد اللہ میاں بھی وہیں موجود تھے، ساتھ بیٹھے شخص سے پوچھا ''الیکشن قریب ہیں آپ کس کو ووٹ دیں گے؟''

بھئی میں تو شیر کو ووٹ دوں گا۔۔۔میرا بہنوئی اس بار الیکشن میں کھڑا ہو رہا ہے اپنے حلقے سے۔۔۔ظاہر ہے ووٹ تو گھر کو ہی جائے گا نا۔۔۔اور آپ بھی نون لیگ کو ووٹ دینا عبد اللہ بھیا۔۔۔آپ سے اُن کی خاص ملاقات کروادوں گا۔۔۔آپ پر نظرِ کرم رہے گی۔''

عبداللہ نے نون لیگ کو ووٹ دینے کی حامی بھی بھرلی۔

''آپ کو کیا لگتا ہے حالات کچھ بہتر ہوں گے؟'' عبداللہ نے سوال کر ڈالا۔

''نہیں بھائی۔۔۔یہ ملک کبھی ترقی نہیں کرسکتا۔۔۔ہمارے حکمران حرام خور ہیں ملک کہاں سے ترقی کرے گا؟''

عبداللہ میاں نے ہاں میں ہاں ملائی۔

آس پاس بھی سیاسی چہ مگوئیاں جاری تھیں۔

☆☆☆☆

اسلام کے نام پر حاصل کیے جانے والے اسلامی جمہوریہ پاکستان میں اسلامی کچھ بھی نہیں۔ ایک کلرک سے لے کر سیاستدان تک ہر کوئی اپنی پہنچ کے مطابق کرپشن کر رہا ہے۔ یہاں ایماندار بس وہ ہے جس کو بے ایمانی کا موقع نہ ملتا ہو۔ یہ ملک صاحب اولاد نہیں ہے۔ کوئی معجزہ ہی اس ملک کو ترقی پر گامزن کر سکتا ہے کیونکہ یہاں کا ہر فرد عبداللہ ہے۔۔۔

ہاں، ہم سب عبداللہ ہیں۔

شافعہ خان کا تعلق کراچی سے ہے۔ گو کہ لکھنے کا شوق بہت پرانا ہے مگر اس شوق کو فروغ دینے کا خیال حال ہی میں طاری ہوا ہے۔ ان کی تحریروں میں طنز و مزاح اور اصلاحی پہلو نمایاں ہیں۔ سیاحت سے گہری دلچسپی ہونے کے باعث شخصیت میں قدرت کی رنگینیوں کے عناصر بھی شامل ہیں۔ ''ارمغانِ ابتسام'' میں یہ ان کی دوسری تحریر ہے۔

ارشادالعصر جعفری

کالو

معنف کی کتاب قیس صحرائی سے ایک اقتباس

آج دل نے ایک نئی فرمائش کردی۔
''قیس صاحب۔ گالیاں تو سنئیں!''

دل کی اس فرمائش پر ہم نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں کہ کوئی ایسی ہستی نظر آئے تو دل کی فرمائش پوری کی جائے لیکن ابھی اردگرد کوئی بھی ایسی ہستی موجود نہیں تھی۔

ہم محسوس کررہے ہیں کہ ہمارے دل کی اس فرمائش پر آپ کے ماتھے پر سلوٹیں ابھر آئی ہیں اور شاید آپ یہ سوچ رہے ہیں کہ دل کی یہ کیسی فرمائش ہے۔ تو ہم آپ کو بتاتے چلیں کہ یہ ہمارا دل ہے۔ یعنی قیس چلبلائی ۔ ایم ایس سی۔ سڑکیات۔ ڈی ایس سی۔ آواریات۔ یونیورسٹی آف عشقیات۔ یہ دل کچھ بھی کہہ سکتا ہے۔ کسی بھی چیز کی فرمائش کرسکتا ہے۔ اس دل کے مالک کی پیدائش پر اس دل کو جنم دینے والی ہستی یعنی ہماری والدہ نے کہہ دیا تھا کہ۔

''پوت کے پاؤں پالنے میں نظر آجاتے ہیں'' ہماری والدہ ماجدہ کا ہمارے بارے میں یہ آفاقی بیان پڑھ کر یقیناً آپ کے دل میں خواہش جنم لے رہی ہو گی کہ آپ ہمارے بچپن سے بھی آگاہی حاصل کریں۔ ہمارا آپ سے وعدہ ہے کہ ہم آپ سے کچھ بھی نہیں چھپائیں گے۔ اپنے بچپن کے کارنامے بھی آپ کے علم میں لائیں گے۔ تبھی تو آپ ہمارے بارے میں جان پائیں گے اور پھر آپ فخر کریں گے کہ ایسی عظیم اور مہان ہستی آپ کے درمیان میں موجود ہے۔

لیکن پہلے ہم آپ کو دل کی اس فرمائش کے انجام کے متعلق تو بتاتے چلیں تاکہ اگر آپ عبرت حاصل کرنا چاہیے تو آپ کے سامنے کوئی واقعہ تو ہو۔

جی۔۔۔۔ ہم آپ کو بتا رہے تھے کہ دل کی فرمائش پر ہم نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں اور پھر چند لمحوں بعد ہماری نظر ''کالو'' پر پڑی۔ کالو بہت ہی بدقسمت لڑکی تھی۔ کیونکہ ہمارے ملک میں پیدا ہوگئی تھی۔ جہاں اس کے حسن کی قدر کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ اگر یہی کالو ویسٹ انڈیز یا افریقہ کے کسی ملک میں پیدا ہوئی ہوتی تو وہاں حسن کی شہزادی کہلاتی۔ کالو تھی بہت تیز لڑکی۔ گالیاں سنانے میں تو اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ اس کی تیز طرار زبان ایسی تھی کہ محلے کی بزرگ خواتین اپنی بچیوں اور بہوؤں کو اس سے دور رکھنے کی کوشش کرتی تھیں۔

ایک بار یہ اپنے ہی جیسی تیز طرار لڑکی سے باتیں کر رہی تھی کہ لڑکی نے اس سے پوچھا "کالو۔۔۔ یہ بتا یہ لڑکے اپنی محفلوں میں کس قسم کی باتیں کرتے ہیں؟"

حالانکہ اس سوال کا جواب تو اسے بھی معلوم تھا لیکن اس نے انجان اور معصوم بنتے ہوئے پوچھا۔

"لو۔ تمہیں نہیں پتا کہ یہ لڑکے آپس میں کس قسم کی باتیں کرتے ہیں!" کالو نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔۔۔ تیری قسم، مجھے تو نہیں پتا" لڑکی نے نہایت ہی معصوم سے لہجے میں کالو کی قسم کھاتے ہوئے کہا۔

"ارے بیوقوف، پاگل! یہ لڑکے بھی اسی قسم کی باتیں کرتے ہیں جس طرح کی ہم کرتی ہیں" کالو نے کہا۔

"ہائے اللہ۔ یہ لڑکے کتنے بے شرم ہوتے ہیں کالو" لڑکی نے شرماتے ہوئے کہا اور دوپٹے کا پلو دانتوں میں لے لیا۔

اب وہی کالو ہمیں نظر آ گئی تھی۔ نان سٹاپ گالیاں دینے میں اس نے ڈپلومہ کیا ہوا تھا۔ بہت سے لڑکوں کو بھرے چوک میں بے عزت کر چکی تھی۔ گالیاں سننے کا اس نے اچھا موقع اور کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔ لہٰذا جیسے ہی وہ قریب آئی۔ ہم نے اس سے کہا۔

"ہائے۔۔۔" اس نے صرف نظر اٹھا کر ہمیں دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔

"ہم نے کہا روپ کی رانی! ہماری طرف بھی دیکھو۔ ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں" ہم نے خالص لوفرانہ انداز میں کہا تو اس نے مسکرا کر ہماری طرف دیکھا۔ ہم نے سوچا کہ وہ ہمیں شہہ دے رہی ہے تاکہ ہم اسے مزید تنگ کریں تو وہ ساری کسر ایک دفعہ ہی نکال دے۔ یہ سوچ کر ہم نے پھر اس سے کہا "تمہاری یہ حسین ادائیں، تمہاری یہ مورنی جیسی چال۔ ہائے تم نے تو چھری پھیر کر رکھ دی ہے ہمارے دل پر۔"

"شکر ہے۔ تمہارے دل میں بھی میرے لئے جگہ بنی!!" کالو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آج سے تھوڑی ہے سویٹ ہارٹ۔ یہ تو برسوں سے، بلکہ صدیوں سے ہے۔" ہم نے فلمی انداز میں کہا۔

"واقعی۔؟ میرے رانجھے" کالو نے حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ کہا۔

"ہاں۔ تیرے اس چمکتے دمکتے حسن کی قسم!" ہم نے کہا۔ ہمارا خیال تھا کہ چمکتے دمکتے حسن کا سن کر وہ غصے میں آ جائے گی۔ کیونکہ وہ اور حسن ان دونوں کا کوئی جوڑ نہیں تھا مگر ہماری بات سن کر وہ شرمانے لگی۔

"یا اللہ خیر۔ یہ آج میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔" ہم نے دل ہی دل میں کہا پھر ہم نے کالو سے کہا۔

"کالو۔۔۔ دراصل میں تمہیں چھیڑ رہا تھا"۔

"کوئی بات نہیں۔ محبت میں چھیڑ چھاڑ ہوتی رہتی ہے۔ جس میں چھیڑ چھاڑ نہ ہو وہ بھی بھلا کوئی محبت ہوتی ہے"، کالو نے محبت پاش نظروں سے ہمیں دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔۔۔ میں تمہیں یہ کہہ رہا ہوں کہ۔۔۔"

"اچھا باقی باتیں پھر کریں گے۔ اب میرا گھر آ گیا ہے۔ میں جلد ہی تمہارے گھر آؤں گی۔" کالو نے ہماری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ پھر وہ تیز تیز قدم اٹھا کر گھر میں گھس گئی۔

دھت تیرے کی!!" ہم نے اپنی ہتھیلی پر اپنا مکہ مارتے ہوئے کہا۔

☆..........☆..........☆

ہم اپنے کمرے میں بیٹھے کتاب "محبوب پٹانے کے ۱۰۱ طریقے" عرف "محبوب آپ کے قدموں میں" پڑھ رہے تھے۔ اس کتاب کو پڑھ کر اور اس میں لکھے طریقوں پر عمل کر کے انسان ۲۰۲ مرتبہ با آسانی بھرے بازار میں "پٹ" سکتا تھا۔ ہم نے ابھی کتاب کے چند صفحے ہی پڑھے تھے کہ آواز سنائی دی۔

"رانجھا کہاں ہے۔ میں اس کے لئے چوری بنا کر لائی ہوں۔ وہ کہہ رہا تھا کہ مجھے چوری کھانے کا بہت شوق ہے" ہم نے آواز فوراً پہچان لی۔ یہ آواز کالو کی تھی۔

"رانجھا۔ کون رانجھا۔ یہاں تو کوئی رانجھا نہیں رہتا" یہ حیرت بھری آواز والدہ صاحبہ کی تھی۔

"آپ کا بیٹا قیس، قیس چلبلائی جسے صحرائی کہلانے کا بھی

بہت شوق ہے۔ اس کی پیدائش کے وقت کہیں آپ صحرا کا سفر تو نہیں کر رہی تھیں" کالو کی آواز سنائی دی۔

"ہوش کے ناخن لو لڑکی۔ یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو" والدہ صاحبہ کی غصیلی آواز سنائی دی۔

"سوری آنٹی۔ دراصل آپ کے بیٹے قیس نے میرا دماغ خراب کر دیا ہے۔ بہر حال وہ آج کل رانجھا بنا پھرتا ہے۔ مجھ سے کہتا ہے تیس چالیس بھینیں لے لو۔ میں ساری عمر ان کی خدمت کرتا رہوں گا"...... کالو نے فوراً ہی معذرت بھرے لہجے میں کہا۔

"اچھا۔ تم کمال کی بات کر رہی ہو۔ میں نے اس کی پیدائش پر اس کا نام کمال رکھا تھا لیکن اس کے باپ نے اس کا نام قیس رکھ دیا اور اب وہ قیس چلبلائی بنا پھرتا ہے۔ ویسے اس نے دنیا میں آ کر بہت سے کمال دکھائے ہیں اور ابھی نجانے کتنے کمال دکھائے گا" قیس کا نام سن کر والدہ صاحبہ نے ہمارے بچپن کا نام لیتے ہوئے کہا جواب متروک ہو چکا تھا۔

"جی۔ جی۔ آپ کا وہی باکمال کارنامہ۔ کہاں ہے وہ؟" کالو کی آواز سنائی دی۔

"میں بلاتی ہوں اسے۔ قیس!" والدہ صاحبہ نے پہلے کالو سے کہا پھر بلند آواز میں ہمیں پکارا۔ ہم نے کتاب جلدی سے تکیئے کے نیچے رکھ دی اور بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ والدہ صاحبہ کی ایک دو آوازیں اور بھی آئیں مگر ہم نے کوئی جواب نہ دیا۔

"یہ اس کا کمرہ ہے۔ جاؤ دیکھ لو اپنے باکمال رانجھے کو" والدہ صاحبہ کی آواز سنائی دی۔ پھر دروازہ کھلا ہم نے ہلکی سی پلکیں اٹھا کر دیکھا۔ کالو ہمارے سامنے تھی۔

"یہ کون سا وقت ہے سونے کا۔ اٹھو رانجھا جی۔ دیکھو تمہاری ہیر تمہارے لئے چوری بنا کر لائی ہے۔ مکھن کی چوری۔" کالو نے کہا پھر ہمارے پاؤں پکڑ کر ہلائے۔ ہم نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں۔ پھر کالو کو ایک نظر دیکھا اور چیخ ماری۔

"چڑیل۔ چڑیل۔ بھوت۔ بھوت۔۔۔" کہتے ہوئے ہم اچھل کر بستر سے نیچے آئے اور چیختے چلاتے چھت کی طرف دوڑے۔ چھت پر پہنچ کر ہم مرغیوں کے دڑبے میں گھس گئے۔

ہمیں دیکھ کر مرغیوں نے احتجاج شروع کر دیا۔

"آنٹی جی۔ لگتا ہے رانجھا خواب میں ڈر گیا ہے!" چند لمحوں بعد ہمیں کالو کی آواز سنائی دی۔

"ارے۔ باہر نکلو!!" والدہ صاحبہ نے دڑبے کے قریب آ کر کہا۔ ہم آہستہ آہستہ دڑبے سے باہر نکلے تو کالو کھی کھی کر کے ہنسنے لگی۔

"ہائے۔ رانجھا جی کیسے بھوت بنے ہوئے ہیں۔ شاید آئینہ دیکھ لیا تھا اس لئے ڈر گئے تھے"۔ کالو نے ہنستے ہوئے کہا۔ ہم شرمسار سے ایک طرف کھڑے ہوئے تھے جبکہ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

"رانجھا جی۔ چوری تمہارے کمرے میں رکھی ہوئی ہے۔ وہ کھا لینا اور ہاں میں نے ابا جی سے بات کر لی ہے۔ تیس چالیس تو نہیں البتہ تین چار بھینیں لے دیں گے۔ بس تم ان کی خدمت کے لئے تیار رہو" کالو نے کہا اور کھی کھی کرتی ہوئی چلی گئی۔ ہم بھی اس کے جانے کے بعد نیچے آ گئے لیکن ہم اماں سے نظریں نہیں ملا رہے تھے۔

"یہ کیا چکر ہے۔" اماں نے ہمیں گھورتے ہوئے کہا۔

"معلوم نہیں امی۔ یہ تو ویسے ہی کمپل ہو رہی ہے۔" ہم نے معصوم سی صورت بنا کر کہا۔

"میں تو تیری پیدائش کے دن سے کہہ رہی ہوں کہ پوت کے پاؤں پالنے میں ہی نظر آ جاتے ہیں۔" اماں نے کہا۔

"ویسے امی جان۔ اگر کالو کے ساتھ بھائی جان کی شادی ہو جائے تو ہم گھاٹے میں نہیں رہیں گے۔" اسی لمحے چھوٹے بھائی نے اپنے کمرے سے برآمد ہوتے ہوئے کہا۔

"وہ کیسے؟" اماں نے پوچھا۔

"ہم کالو بھابھی پر ٹکٹ لگا دیں گے۔ روزانہ سینکڑوں ہزاروں لوگ اس عجیب و غریب مخلوق کو دیکھنے آئیں گے۔ پھر تو ہم دنوں میں امیر ہو جائیں گے امی جان۔" بھائی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ہم نے اسے گھور کر دیکھا تو اس کی مسکراہٹ میں اضافہ ہو

گیا۔ ہم کچھ کہے بغیر گھر سے باہر آگئے۔

☆............☆............☆

ہم منی سینما گھر سے لوٹ رہے تھے۔ رات کافی اندھیری تھی اور ہم خراماں خراماں اپنے گھر کی طرف بڑھ رہے تھے کہ ایک آواز سن کر رک گئے۔

''رانجھا جی۔''

ہم نے آواز کی سمت دیکھا۔ یہ کالو کا گھر تھا۔ کالو دروازے پر کھڑی تھی پھر وہ دروازے سے باہر نکلی اور اس نے ہمیں بازو سے پکڑا۔

''آؤ رانجھا جی۔'' اس نے کہا۔ شاید ہمارے سوچنے کی حس سو چکی تھی۔ اس لئے ہم بلا ارادہ ہی اس کے ساتھ اس کے گھر چلے گئے۔ وہ ہمیں لے کر چھت پر پہنچ گئی۔

''مجھے معلوم ہے کہ تم آج کل اس منی سینما گھر میں آتے ہو اور یہاں جس قسم کی فلمیں چلتی ہیں ان پر پولیس کے چھاپے بھی بہت پڑتے ہیں۔ جس دن دھر لئے گئے تو سیدھے جیل جاؤ گے۔'' کالو نے کہا۔

''تمہارے ابے کو جب پولیس اس منی سینما گھر سے پکڑ کر لے گئی تھی تو چھڑا کر کون لایا تھا؟'' ہم نے کہا۔

''کون چھڑا کر لایا تھا؟'' کالو نے روانی میں کہا۔

''میں۔۔۔ جب میں تمہارے ابے کو چھڑا کر لا سکتا ہوں تو کیا خود کو نہیں چھڑا سکتا؟'' ہم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''زیادہ باتیں نہ بناؤ۔ میرے ابو اس چکر میں کبھی تھانے نہیں گئے!'' کالو نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

''پھر کس کس چکر میں تھانے گئے ہوئے ہیں۔ ذرا تفصیل سے بتاؤ!!'' ہم نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔

''ان جگت بازیوں کو رہنے دو اور مجھ سے پیار کی باتیں کرو۔ میں کتنی دیر سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں!'' کالو نے اس مرتبہ پیار بھرے لہجے میں کہا۔

''میرا انتظار کر رہی ہو۔ مگر کیوں؟'' ہم نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''ہیر اپنے رانجھے کا انتظار کیوں کرتی تھی؟'' کالو نے کہا۔

''ہیر کی روح ملے گی تو پوچھ کر بتاؤں گا۔'' ہم نے طنزیہ لہجے میں کہا لیکن طنز اس نے محسوس ہی نہ کیا۔

''ایک تو تُو مخول بہت کرتا ہے۔ ناٹی بوائے۔۔۔'' کالو نے پیار بھرے انداز میں کہا۔

''ہاں۔ میں نے سرکس میں بھی تو کام کرنا ہے۔'' ہم نے ایک مرتبہ پھر طنزیہ لہجے میں کالو سے کہا۔

''رانجھا جی۔ مجھے احساس ہے کہ تم مجھے بہت چاہتے ہو۔ اسی ایک احساس کی وجہ سے میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔ اور وہ فیصلہ میری زندگی کا بہت اہم فیصلہ ہے!'' کالو نے کہا۔

''کیا؟'' ہم نے پوچھا۔

''میرے ابو ہمارے راستے کی دیوار بنیں گے۔ پھر میرا ایک چچا بھی ہے جو بالکل کیدو کی طرح ہے۔ وہ دونوں نہیں چاہیں گے کہ ان کی اتنی سوہنی دھی ایک آوارہ، لوفر اور بدصورت لڑکے سے عشق کرے اور اس سے شادی بھی کرے۔'' کالو نے کہا۔

''ہائیں۔ اتنی سوہنی دھی، آوارہ، بدصورت اور لوفر۔'' حیرت کی شدت سے ہم سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔

ہاں۔ مگر تم فکر نہ کرو تم جیسے بھی ہو مجھے پسند ہو۔ تم ایسا کرو کہ مجھے بھگا کر لے جاؤ!'' کالو نے کہا۔

''میں تمہیں بھگا کر لے جاؤں۔۔۔ مگر کیوں؟'' ہم نے حیرت سے اچھلتے ہوئے کہا۔

''اس لئے کہ میرے ابا جان میری شادی کہیں اور کر دیں گے!'' کالو نے وجہ بتاتے ہوئے کہا۔

''وہ تمہاری شادی کہیں بھی کر دیں۔ مجھے بھلا کیا اعتراض ہے!!'' ہم نے کہا۔

''تمہیں مجھ سے محبت ہے نا۔ ویسی ہی محبت جیسی رانجھے کو ہیر سے تھی؟'' کالو نے کہا۔

''مجھے تم سے محبت ہے۔ کس بے وقوف نے تم سے یہ کہا ہے۔'' ہم نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''تم نے۔ اس دن تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ تم صدیوں سے

مجھ سے محبت کرتے ہو۔'' کالو نے کہا۔

''ارے بابا اس دن بھی میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میں نے تم سے چھیڑ خانی کی ہے۔ مجھے تم سے کوئی محبت وحبت نہیں ہے۔'' ہم نے جھنجھلا کر کہا تو اس کی آنکھوں سے آگ سی برسنے لگی۔

''ہونہہ۔ تو اس دن تم نے میرا مذاق اڑایا تھا۔'' اِس نے ناگنی کی مانند پھنکارتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔ اس دن میرا دل چاہتا تھا کہ میں کسی لڑکی سے گالیاں سنوں۔ اس سلسلے میں تم شہرت کی بلندیوں پر ہو۔ تم نظر آ گئیں تو میں نے تمہیں چھیڑ دیا۔'' ہم نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ اس وقت تو تم جاؤ کیونکہ تم میرے گھر پر ہو مگر یاد رکھنا عورت اپنی بے عزتی کا انتقام بہت بُرا لیتی ہے اور میں تم سے انتقام لوں گی۔'' کالو نے غصے سے بھرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ارے تم عورت ہو؟'' ہم نے چونکتے ہوئے کہا۔

''تو تم کیا سمجھتے ہو؟'' کالو نے ہمیں آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا۔

''میں تو تمہیں لڑکی سمجھتا تھا!'' ہم نے نہایت ہی معصومیت سے کہا۔

''شٹ اپ اینڈ گیٹ آؤٹ۔۔۔'' اس نے پہلے سے بھی زیادہ غصیلے لہجے میں کہا۔

☆............☆............☆

عید کی آمد آمد تھی۔ بازار میں حد سے زیادہ بھیڑ تھی۔ عورتوں اور لڑکیوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی جیسے برسات میں جوہڑوں پر مینڈکوں کی۔ ہم بھی آنکھیں سینکنے کے لئے بازار میں موجود تھے۔ ہم ایک پری وش کو دیکھ رہے تھے کہ ہمیں ایک زوردار دھکا لگا۔ ہم لڑکھڑا گئے۔ سنبھل کر دیکھا تو سامنے کالو تھی۔ اس کے ہاتھ سے شیشے کا جگ اور گلاس گر کر ٹوٹ چکے تھے جبکہ کالو کے رونے کی آواز تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ کافی لوگ ہمارے قریب کھڑے ہو گئے تھے۔

''تمہیں شرم نہیں آتی۔ مجھے اکیلا دیکھ کر میرے پیچھے پڑ گئے ہو۔ پچھلے چوک میں تم نے میرا پاؤں کچلا۔ پھر مجھے بازو سے پکڑا۔ اب تم نے ٹکر مار کر میرا اتنا نقصان کر دیا!'' کالو نے روتے ہوئے کہا۔

ہمارے اوسان معطل ہو چکے تھے۔ ایسی صورت حال پہلے کبھی پیش نہیں آئی تھی۔ ہم چپ چاپ کھڑے تھے۔

''تم کیا سمجھتے ہو۔ اس ملک میں غیرت مند لوگ نہیں رہتے جو تم میرے پیچھے پڑ گئے ہو۔ یہاں سب غیرت مند ہیں۔ جو بے غیرتی دکھاتا ہے اسے مزہ چکھا دیتے ہیں!!'' کالو نے وہاں موجود لوگوں کی غیرت کو جگایا۔ اس کے اس جملے نے واقعی جلتی پر تیل کا کام کیا۔ ایک آدمی ہماری طرف بڑھا۔

''اے لڑکیوں کو چھیڑتا ہے۔۔۔'' اس نے ہماری کمر پر ایک دھپ رسید کیا۔ کالو اسی لمحے کھسک گئی جبکہ ایک نوجوان آگے بڑھا۔

''ٹھیک ہے۔ لڑکیوں کو چھیڑنا لڑکوں کا حق ہے۔ مگر تمہاری آنکھوں پر کیسی پٹی بندھی ہے کہ تمہیں لڑکی اور افریقن بھینس میں فرق ہی نظر نہیں آیا۔'' نوجوان نے ہمیں مکا مارتے ہوئے کہا۔

''بڑے افسوس کی بات ہے۔ یہ ہے۔ تمہارا معیار۔ اسی معیار پر پڑے گی تمہیں مار!!'' ایک اور نوجوان نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''آئندہ چھیڑنا ہو تو کسی حسین وجمیل لڑکی کو چھیڑنا۔ تاکہ مار بھی پڑے تو افسوس نہ ہو۔۔۔ اب گھر کی طرف دوڑ لگاؤ ورنہ حقیقتاً بہت مار پڑے گی۔'' ایک اور نوجوان نے نصیحت کی تو ہم وہاں سے کھسکنے لگے۔

ارشاد العصر جعفری کا تعلق سرگودھا سے ہے۔ خاصے طویل عرصہ سے قلم کی مزدوری کر رہے ہیں۔ ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عمدہ شاعر بھی ہیں۔ مختلف رسائل میں پابندی سے شائع ہوتے آئے ہیں۔ طنز ومزاح میں خاصے وکھرے ٹائپ کے انداز کے مالک ہیں۔ طنز ومزاح پر مبنی ان کی ایک کتاب ''قیس صحرائی'' شائع ہو چکی ہے۔ عمران سیریز کے سلسلے میں ان کے درجنوں ناول شائع ہو چکے ہیں۔

مزاحیے

م-ص-ایمن

پوسٹ مارٹم

اپنے لڑکپن کی کچھ شرارتیں پیش کرتا ہوں۔ آج بھی کبھی یاد آتی ہیں تو لبوں پہ مسکان سی سج جاتی ہے۔

فلمی گانے جو مقبول ہو جاتے ہیں عام طور پر زبان زد عوام بھی ہو جاتے ہیں۔ بعض افراد کی عادت بھی ہوتی ہے وہ روزمرہ کام کے دوران گانے سنتے ہیں۔ بالخصوص حجام، درزی اور اس قسم کے پیشے والے گانا سنے بغیر کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ بعض ساتھ ہی گنگناتے ہیں اور بعض از خود ہی گنگنا لیتے ہیں۔ ہمارا زیادہ وقت کارپینٹری میں گزرا ہے یوں ہمارا تعلق بھی اسی 'دوسرے' گروپ سے ہے۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ایک شخص کوئی گیت، گانا یا غزل گنگنا رہا ہو تو سننے والا بھی اس کا اثر لیتا ہے۔ اس کے ذہن میں اس گانے کے بول گونجتے رہتے ہیں اور گنگنانے والا خاموش ہو جائے تو سننے والا بھی گنگنانا شروع کر دیتا ہے اور گانے یا غزل کا سلسلہ وہیں سے جوڑتا ہے جہاں سے منقطع ہوا تھا۔ آج اسی عوامی عادت کو موضوع بناتے ہوئے چند غزلیں اور گانے آپ کی تفریح کے لیے۔

کارپینٹری میں ہمارے ایک استاد تھے، ضمیر الدین نام تھا ان کا۔ وہ کام میں مگن ہوتے تو اکثر ایک گانا گنگنایا کرتے تھے لیکن ہمیشہ ایک ہی مصرعہ یعنی پہلا مصرعہ ہی گنگناتے۔ ''بہارو پھول برساؤ میرا محبوب آیا ہے۔ میرا محبوب آیا ہے۔''

پھر اچانک ہی خاموش ہو کر کام کی جانب متوجہ ہو جاتے۔ سننے والے گانا مکمل ہونے کے منتظر رہتے لیکن ضمیر بھائی نے کبھی اس کے سوا کچھ نہ سنایا۔ پھر یوں ہوا کہ انہوں نے یہ مصرعہ مزید مختصر کر دیا۔۔۔ موڈ میں ہوتے تو بے خیالی میں گنگنانا شروع کرتے۔ ۔۔۔ بہارو۔۔۔

اچانک ہی انہیں کچھ خیال آتا۔ دائیں بائیں دیکھتے گویا کسی کو تلاش کر رہے ہوں۔ مجھ پر نظر پڑتی۔ مجھے اپنی جانب ہی متوجہ پا کر دھیرے سے مسکراتے اور اپنے کام میں مصروف ہو جاتے۔ دوسرے ساتھی کہتے ہی رہتے کہ گانا پورا نہ کریں کم از کم ایک مصرعہ تو پورا کر دیں یہی کافی ہے لیکن وہ جواب تک بھی نہ دیتے۔

ہوا یہ تھا کہ ایک بار ''ہم دونوں اکیلے'' ہی تھے یعنی تیسرا کوئی نہ تھا۔ وہ گنگنا اٹھے۔۔۔ بہارو پھول برساؤ میرا محبوب آیا ہے

۔۔۔میرا محبوب آیا ہے۔

میں نے پوچھ لیا۔ ''ضمیر بھائی! یہ تو آپ نے کئی بار بتایا ہے کہ آپ کا محبوب آیا ہے ۔۔۔۔ لیکن یہ نہیں بتایا کہ کون سے ہسپتال کی 'آیا' ہے''

☆☆☆☆

میری بھی عادت ہے کہ کام کرتے ہوئے بے خیالی میں کچھ نہ کچھ گنگنانا شروع کردیتا ہوں۔اسی طرح کام کے دوران ایک بار میں غزل گنگنا رہا تھا ۔

آج یہ کس کو نظر کے سامنے پاتا ہوں میں
پیار کی بھولی ہوئی یادوں سے ٹکراتا ہوں میں

جب میں گا رہا ہوتا ہوں تو دیگر ساتھی اپنا کام روک کر سنتے ہیں۔گاتے گاتے میں آخری شعر تک پہنچ گیا ''تو نہ رو۔۔۔تو نہ رو۔تو نہ رو میرے لیئے جان تمنا۔۔۔''

ایسے میں نائب قاصد نے آکر کہا ''استاد! آپ کا فون ہے، بریگیڈیئر صاحب بلا رہے ہیں۔''

میں نے گانا ادھورا چھوڑ دیا اور نائب قاصد کے ساتھ چل پڑا۔

ہمارا ایک ساتھی تھا اس کے دانت نہیں تھے۔ پیدائشی بوڑھا تھا۔۔۔وہ بات کرتا کچھ لیکن اس کے لبوں سے نکلتا کچھ تھا۔مثال کے طور پر ایک بار دوران گفتگو وہ بولا ''میجر جیلانی کی بیگم نے کہا ہے۔۔۔'' لیکن دانت نہ ہونے کی وجہ سے ''میرزیلانی'' ہی اس کے لبوں سے نکلا اور سب کو ہی یہ جملہ یوں سنائی دیا ''میری زنانی کی بیگم نے کہا ہے۔''

میں نے اس کا یہ جملہ اچک لیا کہ ''تیری زنانی کی کون سی بیگم ہے؟'' اور کافی عرصہ تک اُس سے شغل ہوتا رہا۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی کہ جب میں نائب قاصد کے ساتھ جا رہا تھا تو میری ادھوری چھوڑی ہوئی غزل اس نے پوری کرنا چاہی ''تو نہ رو۔۔۔تو نہ رو۔۔۔تو نہ رو۔۔۔۔میرے لیئے ۔۔۔''

میں نے سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''اوئے کوئی بھی نہ روئے۔۔۔اسی کو اکیلے رونے دو۔۔۔''

☆☆☆☆

ہماری ایک چھوٹی سی لائبریری ہے۔ہماری لائبریری کا ایک ممبر تبلیغی جماعت میں شامل ہوگیا۔تبلیغی دورے پر جاتا رہتا لیکن کتابیں پڑھنا جاری رکھیں، جب بھی شہر میں اور گھر میں ہوتا۔۔۔ لائبریری پر ضرور آتا۔

ایک بار میں کتابوں کی جلد بناتے ہوئے ایک غزل گنگنا رہا تھا کہ وہ آگیا۔میں خاموش ہوگیا لیکن میری گنگناہٹ اس کی سماعت سے ٹکرا ہی گئی تھی۔السلام علیکم اور حال احوال کے تبادلے کے بعد بولا ''ایمن بھائی! بڑے موڈ میں معلوم ہوتے ہیں۔گانے وانے گا رہے ہیں۔۔۔ایں؟؟''

مجھے شرارت سوجھی میں نے کہا ''ہاں یار ایسے ہی بس جی چاہا تو شروع ہوگیا لیکن مزہ نہیں آتا اکیلے میں۔۔کوئی سننے والا نہ ہو تو اکیلے گانا عجیب سا لگتا ہے۔لوگ پاگل سمجھتے ہیں۔۔۔''

ہنستے ہوئے بولا ''یہ تو ہے!''

میں نے کہا ''آپ کو سناؤں گانا؟''

بولا ''نہیں! میں نہیں سنتا گانے وانے۔''

میں نے کہا ''سن لیں یار 'کس والا' گانا ہے۔''

بولا ''لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔۔۔ میں نہیں سنتا۔۔۔ ایسے

گانے تو میں بالکل بھی نہیں سنتا۔''

''میرا جی چاہتا ہے کہ کوئی سننے والا ہو تو میں بھی کھل کر گاؤں۔''

بولا''نہیں۔۔۔میں نے گانے سننا چھوڑ دیے ہیں۔۔۔ پہلے بہت سنتا تھا۔۔درزی کا کام کرتا تھا۔۔۔۔جب تک گانا نہ سن لوں کام ہی نہیں ہوتا تھا۔اب شکر ہے یہ عادت ختم ہو گئی ہے۔''

میں نے پوچھا''آخری گانا کون سا سنا تھا آپ نے؟''

بولا''یاد نہیں کون سا سنا تھا۔۔۔بس جب سے تبلیغ پر جانا شروع کیا ہے۔اچانک ہی سب کچھ چھوٹ گیا ہے۔''

میں نے بائیں آنکھ دباتے ہوئے سرگوشی میں مشورہ دیا''یار! آج اور سن لیں۔۔۔اسے بھی اسی کھاتے میں ڈال دینا۔''

وہ ہنسا اور بولا'' نہیں نہیں۔۔۔!نہیں سنوں گا۔''

''سن لو یار!''میں نے منت کی''موڈ بنا ہوا ہے۔اس وقت آپ کے علاوہ کوئی نہیں ہے،میرے پیٹ میں گولا سا بنا ہوا ہے جب تک سنا نہیں دوں گا۔کھل کر نہیں گاؤں گا گولا بنا رہے گا۔۔ سن لیں 'کس' والا گانا سناؤں گا۔۔۔''

وہ دو قدم پیچھے ہٹا،دروازے سے باہر ہو کر دائیں بائیں دیکھا''کوئی آ تو نہیں رہا؟''ایسا نہ ہو کہ اچانک کوئی آ جائے اور وہ گانا سنتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑے جائیں۔میں گاتا ہوا پکڑا جاؤں تو خیر ہے۔ وہ سنتے ہوئے نہ پکڑے جائیں۔

بولا''اچھا چلیں آپ اتنا اصرار کر رہے ہیں تو سنا ہی دیں۔''

میں نے کہا''ایک 'کس' والا گانا سناؤں یا دو 'کس' والا؟''

بولا ''جو بھی سنانا چاہیں جلدی سنا دیں۔''

میں نے کہا''نہیں بھئی!جو بولیں گے وہ سناؤں گا ایسا نہ ہو کہ میں ایک 'کس' والا سنا دوں تو آپ بولیں 'دو کس' والا سنانا تھا۔''

وہ بار بار باہر کی جانب دیکھ رہا تھا۔کافی وقت ضائع ہو گیا تھا۔کوئی اچانک آ بھی سکتا تھا،پھر الٹے قدموں دو قدم پیچھے ہوا۔ دائیں بائیں دیکھا،تسلی ہو گئی کہ عنقریب کوئی نہیں آنے والا تو بولا

''چلیں آپ دو 'کس' والا گانا سنا دیں۔''

میں نے گانا شروع کیا۔

کس کس کو بتائیں گے جدائی کا سبب ہم
تو مجھ سے خفا ہے تو زمانے کے لیئے آ

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا''یار ایمن بھائی! آپ بھی کمال کرتے ہیں۔''

میں نے خوش ہو کر کہا''اچھا گاتا ہوں ناں؟''

بولا''نہیں!یہ بات نہیں ہے۔میں سمجھا تھا آپ 'دہ' والا گانا سنائیں گے وہ۔۔۔وہ انگریزی والی کس''پھر ہنسا''میرا مطلب ہے کوئی بیہودہ گانا!''

اب میں نے لاحول پڑھی''لاحول ولا قوۃ یار اظہار صاحب! آپ کیا گمان رکھتے ہیں میرے بارے میں؟۔۔ میں؟۔۔اور آپ کو بے ہودہ گانا سناؤں گا؟''

وہ ہنستے ہوئے بولا''اچھا یہ بتائیں اگر میں ایک 'کس' والا گانا سننے کی فرمائش کرتا تو کیا سناتے؟''

میں نے فوراً کہا ''کس نے بجائی ہے یہ بانسریا۔۔۔میرا دھڑکن لاگا جی۔''

☆☆☆☆

اکرم ایک کارپینٹر ہے ہمارا دوست،اس کی کچھ حرکتیں ایسی ہیں جو ناقابل فراموش ہیں۔حاضر جوابی کی ایسی صلاحیت کہ لوگوں کو سوچنے کا موقع بھی نہ ملے اور وہ کہہ بھی گزرے۔یہ مثال کافی ہے کہ وہ اردو مادری زبان کا حامل ہے،پشتو بالکل بھی نہیں جانتا لیکن اس کے سامنے دو افراد پشتو بول رہے ہوں تو بطور ترجمان یہ فوری طور پر انہی الفاظ کا ترجمہ اردو کے ملتے جلتے الفاظ میں کچھ یوں کرتا ہے کہ سننے والا ہنستے ہوئے لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے۔اور وہ لوگ اپنی پشتو بھول جاتے ہیں۔

ہمارا ایک ساتھی عابد دعوت اسلامی میں چلا گیا۔پہلے وہ بھی گانے وغیرہ گایا کرتا تھا لیکن دعوت کی محفلوں میں شرکت کرنے کے بعد اس میں بے حد تبدیلی آ گئی،اس کے سامنے کوئی گانا گاتا تو اُسے بھی نصیحت کرتا کہ گانا نہیں گانا چاہیئے۔

ایک بار اکرم گانا گا رہا تھا۔۔۔برسات میں۔۔۔'' تو عابد نے فوراً ٹوک دیا کہ'' گانا نہیں گایا کرو، یہ شاعری ہوتی ہے اور شاعری جھوٹ ہوتی ہے، جھوٹ سخت گناہ ہے!''

اکرم بولا'' میں تو خیال رکھتا ہوں لیکن یونہی بس اچانک ہی بے خیالی میں گنگنانا شروع کر دیا ہے۔ میرا ارادہ نہیں تھا۔''

عابد بولا'' اگر ایسا موڈ بنے تو کوئی نعت پڑھ لیا کرو، گنگناہٹ کا شوق بھی پورا ہو جائے گا اور گناہ بھی نہیں ملے گا۔''

بات آئی گئی ہو گئی تھی۔ ایک بار عابد اور اکرم آمنے سامنے بیٹھے کوئی کام کر رہے تھے۔ اکرم کا موڈ بنا۔ اس نے گانا شروع کیا۔'' کیا مل گیا۔۔۔'' اور پھر اچانک ہی عابد کی موجودگی کا احساس ہوا تو گانا وہیں روک لیا اور پوری توجہ کام پر کر لی۔

اپنے دھیان میں مگن کام کرتے عابد نے بے خیالی میں ہی اس کے شروع کیئے ہوئے گانے کو آگے بڑھایا۔

صورت حال پہلے جان لیں کہ عابد سب کو منع کرتا ہے کہ گانا نہ گائیں، اس کے بجائے کوئی نعت پڑھ لیا کریں اور حال یہ کہ بے خیالی میں ساری نصیحتیں بھول کر خود شروع ہو گئے اور اکرم! جو کہ شرارت کا پتلا ہے، اس نے عابد کا گانا کاٹ کر نعت پڑھنا شروع کر دی۔۔۔ (جن افراد کو اس پر اعتراض ہو ان سے معذرت کہ گانے کے ساتھ نعت کا جوڑ نہیں ہوتا لیکن جو واقعہ ہوا ہے وہ بیان کر رہا ہوں۔ جی چاہے تو مسکرا دیں، جی چاہے تو مذمت کر دیں۔۔۔میری نہیں اس کی جو دوسروں کو نصیحتیں کرتے ہیں اور خود کو اس سے مستثنیٰ سمجھتے ہیں) ہاں تو اکرم نے عابد کے احترام میں گانا روک دیا لیکن عابد کے دماغ میں اس کے بول گونج اٹھے تھے اس نے اسے آگے بڑھایا۔ اکرم نے اس کی پروا نہ کرتے ہوئے نعت پڑھنا شروع کی اور پڑھتے ہوئے کسی کی طرف دیکھے بغیر ورکشاپ سے باہر نکل گیا۔

'' کیا مل گیا بھگوان تجھے دل کو دکھا کے
ارمان کی نگری میں میری آگ لگا کے
کیا مل گیا''

'' یا نبی سلام علیک۔۔۔یا رسول سلام علیک۔۔۔یا حبیب

۔۔۔سلام علیک۔۔۔صلوٰۃ اللہ علیک۔۔۔''

جب نعت پڑھی جا رہی ہو تو نعت کا اپنا ایک احترام ہوتا ہے، کچھ عابد کی شخصیت کا بھی احترام تھا۔ سب کے سب خاموش رہے۔

کچھ دیر بعد عابد کو موقع ملا تو اس نے عابد سے شکایت کر دی

'' یار تم نے آج میری بے عزتی کروا دی!''

اکرم بولا'' میں نے؟۔۔۔کب۔۔۔کیسے؟''

وہ بولا'' میں گانا گا رہا تھا اور تو نے۔۔۔''

'' تو بھائی جی آپ خود ہی تو کہتے ہیں گانا گانے کا موڈ ہو تو نعت پڑھ لیا کرو، اس میں بے عزتی والی کیا بات ہوئی۔''

'' بس یار غلطی ہو گئی،۔۔۔تو یار! اس وقت مجھے اشارہ ہی کر دیتا۔۔۔؟''

'' میں کیسے اشارہ کرتا۔۔۔سب آپ کو ہی دیکھ رہے تھے آپ کسی کو نہیں دیکھ رہے تھے، وہ تو شکر کریں آپ بھگوان کو پکار رہے تھے۔۔۔''

گانا یاد آتے ہی عابد اچانک خاموش ہو گئے۔

☆☆☆☆

میں ایک بار ٹرین میں سفر کر رہا تھا۔ میرے ہمسفر کالج کے دو جوان لڑکے تھے۔ وہ بھی آپس میں اجنبی ہی تھے لیکن ان میں تعارف جلد ہی ہو گیا۔ کچھ دیر باتیں کیں اور پھر اپنے اپنے موبائل سے ایک دوسرے کو گانے سنانے لگے۔ ایک گانا بجا۔

دل کی تنہائی کو آواز بنا لیتے ہیں

درد جب حد سے گزرتا ہے تو گا لیتے ہیں

میرا اُن سے ابھی تعارف نہیں ہوا تھا۔ جس لڑکے کا موبائل تھا، میں نے اس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر متوجہ کیا "بیٹا! آپ پڑھتے ہیں یا پڑھ چکے؟"

اس نے جواب دیا "جی!۔۔ میں پڑھ رہا ہوں!"

میں نے کہا "بیٹے! آپ پڑھے لکھے ہیں۔ کم از کم میرا نہیں تو اپنی تعلیم کا ہی خیال کر لیا کریں۔ اگر آپ کے آس پاس کوئی شریف آدمی ہو تو احتیاط کیا کریں اتنے گندے گانے نہ سنا کریں۔"

وہ یکدم چونک پڑا "کون سا گندہ گانا سن رہا ہوں میں۔"

میں نے تحمل سے پوچھا "یہ جو سن رہے ہیں۔ یہ گانا شریف آدمی کے سامنے، یا کسی محفل میں سننے کے قابل ہے؟"

وہ بولا "کیا برائی ہے اس میں مجھے تو بہت پسند ہے۔"

میں نے کہا "اس کا مطلب ہے آپ نے یہ گانا سنا ہے لیکن غور سے نہیں سنا۔"

"نہیں نہیں میں نے کئی دفعہ سنا ہے۔۔۔ مجھے زبانی بھی یاد ہے۔"

"اس گانے میں ایک جملہ ہے کراہیت والا۔۔۔ جو محفل میں سنانا ٹھیک نہیں ہے۔۔۔"

"ایسا تو کچھ نہیں ہے اس میں!" اس کی حیرانی بڑھتی گئی۔

دونوں پوری طرح میری جانب متوجہ ہو چکے تھے

میں نے کہا "اچھا اگر ایسا ہے تو بتائیں کہ درد جب حد سے گزرتا ہے تو "ہگا لینے سے" درد میں کتنا افاقہ ہوتا ہے؟"

میرے لبوں پر شریری مسکراہٹ ابھر آئی تھی لیکن میں سنجیدہ نظر آنے کوشش کر رہا تھا۔

وہ حیران ہو کر بولا "میں آپ کی بات نہیں سمجھا!"

"بھئی اس گانے میں گلوکار کہتا ہے کہ "درد جب حد سے گزرتا ہے تو ہگا لیتے ہیں۔۔۔"

"ہگا لیتے ہیں نہیں کہہ رہا انکل۔۔۔! گا لیتے ہیں کہہ رہا ہے!!" ایک نے میری غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی۔

میں نے کہا "آپ نے غور سے نہیں سنا۔۔۔ میں غور سے سنا کرتا ہوں۔۔۔"

اب انہوں نے غور سے سنا۔

"دل کی تنہائی کو آواز بنا لیتے ہیں۔۔۔۔ درد جب حد سے گزرتا ہے تو گا لیتے ہیں۔۔۔ ہگا لیتے ہیں۔۔۔۔ ہوں اوں ہوں ہوں۔۔۔۔ ہگا لیتے ہیں۔۔۔۔ ہوں اوں ہوں ہوں۔"

جب انہوں نے غور سے سنا اور مجھے مسکراتے دیکھا تو خوب ہنسے اور آپس میں بولے واقعی یار یہ تو ہگا لیتے ہیں کہہ رہا ہے۔ پھر میری ان کے ساتھ دوستی ہو گئی۔ میں نے کہا "آپ لوگ صرف

ایکٹروں کی صحت کے متعلق ہمیں بڑا فکر رہتا ہے ہمارے ڈائریکٹر حضرات بیحد انتہا پسند ہیں۔ یا تو ہمیں تپ دق کے مارے ہیرو دکھائی جاتے ہیں یا ایسے جیسے بورا رکھا ہو اب ان دونوں قسم کے حضرات کو کوئی حق نہیں کہ وہ محبت کے پاس بھی پھٹکیں۔

سینما دیکھتے وقت محبت کے متعلق ہمارے خیالات بڑے لطف ہوتے ہیں اور ذرا سی ناگوار بات سے صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے اگر ہم ایک بھاری بھرکم گینڈے کو ہیرو کے روپ میں دیکھیں جو ایک موٹی تازی ہیروئن سے عشق کا دعویٰ رکھتا ہو تو لازماً افسوس ہو گا۔

لہریں از ڈاکٹر شفیق الرحمن

وقت گزارنے کے لیئے گانا سنتے ہیں لیکن میں سمجھ کر سنتا ہوں جو سمجھ میں نہ آئے وہ کتنا ہی اچھا ہو میں نہیں سنتا جیسے ایک گانا ہے ۔

کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے
کہ جیسے تجھ کو بنایا گیا ہے میرے لیئے

اسی میں ایک شعر ہے ۔

سہاگ رات ہے گھونگھٹ اٹھا رہا ہوں میں
سمٹ رہی ہے تو شرما کے میری بانہوں میں

لڑکا یہ گانا گاتا ہے ۔ یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے لیکن یہی گانا لڑکی بھی گاتی ہے تو وہ بھی گھونگھٹ اٹھانے کا کہتی ہے ۔ بھلا لڑکی دوسری لڑکی کا گھونگھٹ اٹھا سکتی ہے؟''

وہ بولا ''نہیں !۔۔لڑکی تو ایسا نہیں کہتی !''

پھر اس نے سرچ کی اور وہی گانا پہلے مرد کی آواز میں اور پھر لڑکی کی آواز میں سنا اور بڑے غور سے سنا ۔۔ پھر ہنس پڑا ''انکل ! آپ بھی خوب ہیں ۔ کیا چیز بتائی ہے ۔ میں اسے ابھی ڈیلیٹ کرتا ہوں ۔ آج آپ کو ایک گانا ''دکھاتا'' ہوں ۔۔۔''

آدھی رات کا وقت ۔ شہر سے گاؤں آنے والی پتلی سی سڑک ۔۔ پولیس کا ایک سپاہی ڈیوٹی پر جا رہا ہے ۔ سامنے سے ایک نوجوان لڑکا سینما میں فلم کا آخری شو دیکھ کر سائیکل پر گھر واپس آ رہا ہے ۔ ایسے لڑکے جو فلم کے شوقین ہوتے ہیں وہ خود کو کسی ہیرو سے کم نہیں سمجھتے ۔۔ وہ بھی ایک گانا گاتا ہوا آ رہا تھا ۔

ہوتی ہے بڑی ظالم یکطرفہ محبت بھی
وہ یاد تو آتے ہیں پر یاد نہیں کرتے

گانا گاتے ہوئے جب وہ سپاہی کے قریب سے گزرا تو سپاہی نے اسے رکنے کا حکم دیا ''رک اوئے ۔۔ رک جا''

سائیکل سوار ذرا آگے جا کر رک گیا ۔ سپاہی نے حکم دیا ''ادھر آ اوئے !۔۔ کدھر سے آ رہا ہے ۔۔ کدھر جا رہا ہے ۔''

سائیکل سوار نے سائیکل کو یو ٹرن دیا اور گانا بدلا ''مجھ کو اس رات کی تنہائی میں آواز نہ دو '' (سپاہی کے سامنے سے گزرتے ہوئے ذرا سا آگے ہوا) '' آواز نہ دو '' (اور ایک یو ٹرن اور لیتے ہوئے اس کے عین سامنے سائیکل کو روک دیا) آواز نہ دو ۔۔

''اوئے تو آدھی رات کو سڑک پر سائیکل چلا رہا ہے ۔۔۔ اس میں بھی حق نہیں ہے ۔''

اس نے کسی ہیرو کی طرح لہکتے ہوئے گانے میں ہی اس کے سوال کا جواب دیا ۔۔۔ ''روشنی ہو نہ سکی دل بھی جلایا میں نے !'' ۔۔۔ ساتھ ہی اس نے سر کو جھٹکا دیا ۔ اس کے بالوں کی لٹ ۔۔ لٹک گئی اور چہرہ سپاہی کے بہت قریب آ گیا ۔

پولیس کا سپاہی چاہے رنگروٹ ہی کیوں نہ ہو وردی میں ہو تو خود کو افسر ہی سمجھتا ہے ، سو اس سپاہی کو بھی غصہ آ گیا کہ میں شریفانہ انداز میں اس سے بات کر رہا ہوں اور یہ میرے سامنے گانا گا رہا ہے ، میری توہین کر رہا ہے ۔ اس نے ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے گال پر جڑ دیا جس کی آواز رات کے سناٹے میں دور تک گونجی ۔ سائیکل سوار کے چودہ طبق روشن ہو گئے ۔ اسے ذرا بھی امید نہیں تھی کہ ایسا ہو جائے گا ۔ اس نے سائیکل کے ہینڈل پر گرفت مضبوط کی اور پیڈل پر دباؤ بڑھایا ، سائیکل ایک جھٹکے سے آگے بڑھی اور سپاہی کی دسترس سے دور ہوتا گیا ۔

''جس کی آواز رلا دے مجھے وہ ساز نہ دو''

سپاہی بوکھلا گیا بولا ۔۔۔ ''رک اوئے !۔۔ میں کہتا ہوں !''

''آواز نہ دو ۔۔۔''

''رکتا ہے کہ نہیں ؟''

''آواز نہ دو ۔۔۔۔۔''

''میں کہتا ہوں رک جا نہیں تو ۔۔۔''

''آواز نہ دو ۔۔۔۔''

م ۔ ص ۔ ایمن کا تعلق کراچی سے ہے ۔ موصوف بہت اچھے افسانہ نگار اور بچوں کے ادیب ہیں اور بہت سے معیاری رسائل میں ان کی کہانیاں تواتر سے شائع ہو رہی ہیں ۔ ''بزمِ احبابِ ظرافت'' کے جوائنٹ سیکرٹری ہیں ، جو کراچی میں خاصی فعال ہے اور کئی کامیاب محفلیں برپا کر چکی ہے ۔ بہت اچھا مزاح تخلیق کرتے ہیں ۔ اندازِ بیان میں شگفتگی اور شائستگی ہے ۔ ''ارمغانِ ابتسام'' کے مستقل لکھنے والوں میں شامل ہیں ۔

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

تو چلو یوں ہی سہی خواب میں رکھی جائے
پھر بھی مرغی تو کوئی قاب میں رکھی جائے
مولوی کہتے تھے پینے میں کوئی حرج نہیں
صرف مستی نہ مئے ناب میں رکھی جائے
کالی دولت نہ چھپا کار میں گھر میں مسٹر
سب سے بہتر ہے یہ تالاب میں رکھی جائے
اے خدا ملک میں خالص ہے دوا اور نہ غذا
گر شفا رکھنی ہو زہراب میں رکھی جائے
نوکری دوسری کرنی نہ پڑے شام کے وقت
آمدن بالا ہو اور ''جاب'' میں رکھی جائے
چور سے کہتا تھا شاعر یہ پکڑ کر دیواں
شاعری میری نہ اسباب میں رکھی جائے
فیس بک پر یہ منسٹر نے دیا ہے پیغام
کچھ تو عزت مرے القاب میں رکھی جائے
اعلیٰ حکام یہ کہتے تھے سِوِل سروس کے
اب انا گوندھ کے ہر ''صاب'' میں رکھی جائے
اک مصنف نے وصیت کسی نقاد سے کی
مری تحریر نہ احباب میں رکھی جائے
شوق سے چشم تماشا کو کریں وا لیکن
کچھ حیا دیدہ بیتاب میں رکھی جائے
ہر سخن فہم بدل دیتا ہے مظہر اس کو
اب عبارت مری اعراب میں رکھی جائے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

گرد و غبار لفظوں کا کافی کثیف ہے
شاعر ہے موٹا ، شعر نزار و نحیف ہے

فصلیں اگائے جائے غزل کی زمین پر
یہ سوچتا نہیں کہ ربیع ہے؟ خریف ہے؟

بے جوڑ ایک جوڑے کو دیکھا ہے باغ میں
چھوٹا سا قافیہ ہے تو لمبی ردیف ہے

میری غزل کو چھاپ دیا اپنے نام سے
ڈاکو ہے وہ کہ جس کا تخلص شریف ہے

بیوی کو گر نہ مار سکیں آنکھ مارئیے
ایمان کا یہ درجہ اگرچہ ضعیف ہے

اس ملک کا خدا ہی ہے حافظ عزیزِ من
منصف جہاں بکاؤ ہے حاکم بھی تھیف ہے

آیا بڑھاپا بھول گئے سارے چونچلے
لیلیٰ بنی عفیفہ ہے مجنوں عفیف ہے

بیماریاں اُڑاتا ہے ساری مذاق میں
مظہر کو دیکھو کیسا طبیبِ ظریف ہے

تنویر پھولؔ

ڈاک محبوبہ کی وہ لایا نہیں
ڈاکیا مردود تو آیا نہیں

کھا گئی جلدی سے خط عاشق کا وہ
عشق نامہ اُس نے پڑھوایا نہیں

آپ نے ''تو لفٹ'' ہم کو کر دیا
آپ کا انداز یہ بھایا نہیں

دس پلیٹیں کھا کے آئے شیخ جی
کہتے ہیں، دعوت میں کچھ کھایا نہیں

آپ کو ہمسائی یوں اچھی لگی
آج اُس کے پاس ہمسایہ نہیں

مولوی کو مل گیا حلوہ بہت
اس لئے بچوں کو دکھلایا نہیں

پانی کی قلت بتائی خان نے
بولے، ہم دس روز سے 'نایا' نہیں

چل رہا تھا ساتھ جو اُس شوخ کے
اُس کا گھر والا ہے وہ، تایا نہیں

پھولؔ جی کے سن لئے اشعار سب
آپ نے کچھ ان پہ فرمایا نہیں

تنویر پھولؔ

جوتے سے دشمنوں کی مرمت نہ کیجئے
ننگا ہیں آپ، ایسی حماقت نہ کیجئے

ہرگز نہ ماہ رُو کہیں کالی چڑیل کو
کس نے کہا کہ آپ محبت نہ کیجئے

''زردار'' بنتے بنتے وہ پہنچے ہیں جیل میں
زنہار ایسا ''کارِ شرافت'' نہ کیجئے!

کیسے وزیرِ مال ہیں؟ لگتے ہیں نائی آپ
پبلک کی روز روز حجامت نہ کیجئے

کارِ عظیم اُس کے ہے کمرے میں جھانکنا
خطرے کا سامنا کسی صورت نہ کیجئے

بھوکا رکھا ہے آپ نے کیوں موٹے سانڈ کو
گر پیٹ پھاڑ دے تو شکایت نہ کیجئے

ہم جانتے ہیں، آپ ہیں مہمانِ بے حیا
گھر میں ہمارے آنے کی زحمت نہ کیجئے

ہم نے کہا کہ آپ کو مرغا بنائیں ہم
کہنے لگے کہ ایسی ظرافت نہ کیجئے

جو یار مطلبی ہیں اُنہیں دُور ہانک دیں
ڈنڈا اُٹھائیں پھولؔ! مروّت نہ کیجئے

ڈاکٹر عزیز فیصل

کیا یہ کہنا تنج کی توہین ہے؟
یہ بھی گویا ایک ٹچ سکرین ہے

اس تلفظ کش لکھارن کا کلام
شاعری کی کاوشِ تدفین ہے

انسدادِ عشق ہے منشورِ قیس
دشت میں یوٹرن والا سین ہے

مائنس ون ہو اگر بیوی کی کھپ
پھر تو جیون چین ہے، تسکین ہے

زن مریدی کے بتاتا ہے جو ٹپس
اس کی نیکی کس قدر سنگین ہے

حسن کی ہر پارٹی جائن کرو
بے وفائی کا یہی آئین ہے

آف دی ریکارڈ، دائی نے کہا
دل کا وہ پیدائشی رنگین ہے

اتنی لمبی چھوڑتا ہے مولوی
جتنی لمبی کار لیموزین ہے

عین دورانِ ڈکیتی ،وہ ڈکیت
باوضو رہنے کا بھی شوقین ہے

کہہ بھی سکتا ہے حریفِ قہقہہ
یہ غزل تھوڑی بہت نمکین ہے

عید پر بھی اس نے رو دھو کر کہا
ایشیا بھر کا وہ مسٹر بین ہے

اس میں ہے سارا ہی نسوانی سٹاف
شہر میں رنڈووں کی جو کنٹین ہے

لوگ خوش ہیں عید پہ فیصل مگر
تو بشیراں کے لیے غمگین ہے

ڈاکٹر عزیز فیصل

آتا ہے پورے سال میں ہر بار عید پر
شب دو بجے کو خواب میں دلدار عید پر

سقراط کا وہ جام بقیہ کرے گا نوش
جھوٹوں کے خاندان کا سردار عید پر

عیدی وہ دے گا نرس کو بیگم کے نام پر
ہو جائے جس کی اہلیہ بیمار عید پر

عاشق تڑا چکا ہے کئی ایک پسلیاں
اونچی پھلانگتے ہوئے دیوار عید پر

میں خوردنی نمک کے فلیور کی آڑ میں
کرتا ہوں شیر خورما تیار عید پر

کیا خواب چاندرات میں دیکھے گا رات بھر
رنڈوا ہمارے شہر کا اس بار عید پر

بھیجا ہے بھر کے خاص سویوں کا اک ٹرک
شاید کہ دل سے خوش ہو وہ گلنار عید پر

بیگم کو دینا چاہیے عیدی میں ہر برس
دو لاکھ والا کاغذی دینار عید پر

کیوں کر نہ اپنا آخری کڑوا رقیب بھی
کھوتے پہ لد کے بھیج دوں قندھار عید پر

بیگم بصد خلوص بناتی ہے مطلقاً
سرتاج خاص و عام کو نادار عید پر

ہم چوڑیوں میں تول کر اس کو دکھائیں گے
مل جائے گر وہ فربہی مُیار عید پر

کرمہ جبیں کے قرب کی لینڈنگ میں احتیاط
ہے فکس تم پہ بیگمی ریڈار عید پر

فیصل میں اس لیے بھی ہوں قدرے سکون میں
چھپتا نہیں ہے ایک بھی اخبار عید پر

عرفان قادر

اُٹھ کر شہر سب، سُننے کلام آیا تو کیا ہو گا
لیے انڈے ٹماٹر خاص و عام آیا تو کیا ہو گا

چھپا کر اُس کے گھر میں جاکے رشوت دینے والاں!
اگر دفتر میں وہ تیرے نہ کام آیا تو کیا ہو گا

خزانہ لیڈروں نے لوٹ کر خالی کیا جس میں
وطن میں پھر وہ جمہوری نظام آیا تو کیا ہو گا

الف بے عشق کی سیدھی نہیں ہوتی کبھی، پچولا
وہاں پر میم کے ہی بعد لام آیا تو کیا ہو گا

تمنا شربتِ دیدار کی رکھتا ہے دل میں تُو
بھرا پیپسی کا تیرے پاس جام آیا تو کیا ہو گا

مہینوں بعد مِلتا ہے سماعت کا وہ دشمن، اب
سنانے اپنی غزلیں صبح و شام آیا تو کیا ہو گا

شکم پرور، ہوئے مشہور ہیں پیٹو جو بچپن سے
انھی کے ہاتھ میس کا انتظام آیا تو کیا ہو گا

بچے گا کیا ترا، او کالیے! آزاد پھرتا ہے
ارے شیطان، جب ماہِ صیام آیا تو کیا ہو گا

یہ تُو جو ''جیریوں'' کے بیچ میں مسرور بیٹھا ہے
اچانک ہی تری محفل میں ''ٹام'' آیا تو کیا ہو گا

ہے کیا یہ لازمی، بیگم کو بھی کاغان لے جائیں؟
اکیلا ہی اگر میں گھوم گھام آیا تو کیا ہو گا

شریف النفس بن کے سب ابھی محفل میں بیٹھے ہیں
ہمیں معلوم ہے وقتِ طعام آیا تو کیا ہو گا

سبق تاریخ کا کہتا ہے، مت پنگا کسی سے لو
اگر امریکہ پھر سے ویت نام آیا تو کیا ہو گا

ہے میری جیب خالی اور شیدائی وہ مُرغے کی
نظر ''کے ایف سی'' کا مونوگرام آیا تو کیا ہو گا

محبت کے سفر میں تیز رفتاری نہیں اچھی
سڑک کا ایک دم سے اختتام آیا تو کیا ہو گا

عرفان قادر

وہ ڈائیٹنگ سے بھی تھوڑے سے کم نہیں ہوئے تو!
کبھی جو لارج تھے، اب میڈیم نہیں ہوئے تو!

تھے ہم نہیں جنھیں کاٹا ہے سگ نے لیلیٰ کے
''ہمارے ہونے کا دھوکہ ہے، ہم نہیں ہوئے تو؟''

تھی مُنہ سے آگ اگلتی وہ، اور حیرت ہے
قریب لوگ تھے جتنے، بھسم نہیں ہوئے تو

نہ فائدہ ہوا کھڈوں کے کھودنے کا ذرا
رقیب کوچے میں اُن کے دھڑم نہیں ہوئے تو

زباں دراز ہیں اہلِ زبان پھر کیونکر؟
قلم دراز گر اہلِ قلم نہیں ہوئے تو

ملیں گی جب بھی، کریں گی وہ بات پھر کس کی؟
''نشاط''، ''نادیہ'' اور ''الکرم'' نہیں ہوئے تو!

لگائی میں نے بھی تصویر ایکٹریس کی تھی
کوئی غلط نہیں تم ہینڈسم نہیں ہوئے تو

بھرے ہی جائیں گے جیبیں وہ ڈاکٹر کی سدا
مریض راہیِ مُلکِ عدم نہیں ہوئے تو

تمھاری بزم سے اٹھیں گے کون لوگ بھلا
جب اُن کے حلق تلک پُر شکم نہیں ہوئے تو

نوید صدیقی

ٹکٹ حسبِ لیاقت ہے؟ نہیں تو!
یہ جو کچھ ہے سیاست ہے؟ نہیں تو!

ہیں نظم و نثر دونوں بے سروپا
بجا ان کی اشاعت ہے؟ نہیں تو!

ہزاروں دوست ہیں جو فیس بک پر
کوئی ان میں فراست ہے؟ نہیں تو!

مسلسل ہائے ہائے ہائے ہائے!
بڑھاپے کی علامت ہے؟ نہیں تو!

موبائل لوڈ بھیجا ہے "صبا" کو
ٹھرک کو یہ سخاوت ہے؟ نہیں تو!

سنا ہے خیر سے شادی شدہ ہو
تمھیں رونے کی عادت ہے؟ نہیں تو!

مسلمانی کا چرچا ہے وطن میں
یہ اسلامی ریاست ہے؟ نہیں تو!

خلائی طاقتیں ہیں اس کے پیچھے
عدالت ہی عدالت ہے؟ نہیں تو!

کرپشن بھی پانامہ میں ہے شامل
فقط مالِ تجارت ہے؟ نہیں تو!

چلو مانا بہت "بدماش" ہوں میں
شریفوں میں شرافت ہے؟ نہیں تو!

نوید صدیقی

بھری دنیا میں آخر دل کو بہلانے کہاں جائیں
نکل کر اب حکومت سے یہ دیوانے کہاں جائیں

خزانے پر لگے پہرے عدالت کی نگاہوں کے
جنھیں کھانے کی عادت ہے وہ اب کھانے کہاں جائیں

جو ہم کہتے ہیں اس پر کان دھرتا ہی نہیں کوئی
ہم اپنے دھاندلی کے راگ کو گانے کہاں جائیں

سفارت ہے، وزارت ہے، نہ کرسی، ممبری کوئی
سمجھ میں کچھ نہیں آتا سکوں پانے کہاں جائیں

تو ہی بتلا ہمارے ووٹروں کو کھینچنے والے
جو ہارے ہیں وہ اپنی جیت منوانے کہاں جائیں

تمنا تھی کہ آئندہ اسمبلی میں بھی ہم ہوتے
عوام الناس کو لیکن اب اکسانے کہاں جائیں

دلشاد نسیم

تم نے شادی کے اگر کھائے چھوارے ہوتے
تم بھی اوروں کی طرح بے سے بے چارے ہوتے

کھاتے پائے بھی ہم اور کھاتے نہاری جاناں
اور بکرے بھی کسی طرح تمہارے ہوتے

پیسے ہوتے جو مرے پاس بناتے کوئی فلم
ہاتھ میں اپنے بھی دو چار ستارے ہوتے

وِگ اگر چھوڑ کے جاتی کبھی وہ پاس مرے
میں نے بھی بال کئی بار سنوارے ہوتے

تم اگر ہوتے سیاسی تو مزہ عشق کا تھا
تم نے ہم پر بھی کئی ہونڈے وارے ہوتے

دل کو بارش نے کیا آج مری جاں سوگی
ورنہ پاپڑ کی طرح شعر کرارے ہوتے

آپ کے گھر کی طرف میٹرو بھی جاتی نہیں
جانِ من خواب میں آ جاتے سہارے ہوتے

کاش دو گانا کبھی ہم نے نہ گایا ہوتا
کیدو یہ ویلے ہمارے نہ تمہارے ہوتے

جہانگیر نایابؔ

چاہے جتنی خراب لکھیں گے
پھر بھی غزلیں جناب لکھیں گے

بانسری کو رباب لکھیں گے
شمع کو آفتاب لکھیں گے

موگرا کو گلاب لکھیں گے
کوفتہ کو کباب لکھیں گے

روز لکھیں گے آٹھ، دس غزلیں
ہفتے میں اِک کتاب لکھیں گے

مصرعۂ طرح دیجیے تو سہی
شعر ستّر جناب لکھیں گے

باگمتی کو لکھیں گے جہلم
گھاگرہ کو چناب لکھیں گے

ہم ہیں بسیار گوئی میں یکتا
خوب غزلیں جناب لکھیں گے

اب کے بدنامیوں کو بھی نایابؔ
اپنے حق میں خطاب لکھیں گے

شاہین فصیح ربانی

وہ سکہ نوٹ ہو یا آٹا دال جو بھی ہو
مگر فقیر کو خیرات ڈال، جو بھی ہو

بناؤ کھانا کہ بھر لیں شکم کے دوزخ کو
ہو مرچ سبز، سیہ یا کہ لال جو بھی ہو

یہ کوئی وقت ہے مہمان بن کے آنے کا
کسی طرح وہیں باہر سے ٹال، جو بھی ہے

کسی طرح ہمیں دولت ہماری لوٹا دے
کرنسی پونڈ کہ ڈالر ریال، جو بھی ہو

لگی ہو بھوک تو انساں خوشی سے کھاتا ہے
وہ گھاس پھوس ہو پتے کہ چھال جو بھی ہو

نیا پرانا کوئی قافیہ بتاؤ ہمیں
ردیف گانٹھ ہی لیں گے، خیال جو بھی ہو

ہمیں مزاج ودیعت ہے شاعرانہ فصیحؔ
کریں گے مدحتِ حسن و جمال جو بھی ہو

ڈاکٹر امواج الساحل

''آتا ہے پورے سال میں اِک بار عید پر''
دستور یہ ملن کا مرے یار عید پر

بجلی نہیں تھی پانی کہاں سے وہ لیتے پھر
آیا ہے بل انہیں تو طرحدار عید پر

تھی گرمیوں کی عید پسینہ تھا بہہ رہا
جاناں کو دیکھ کھل اٹھا گلزار عید پر

سب سو گئے تو بور طبیعت جو ہو گئی
سوچا، کریں شرارتِ اشعار عید پر

ہے ووٹ کا زمانہ تو وعدے ہیں بے شمار
پھر تو نظر نہ آئیں گے سرکار عید پر

ہے نعرہ ان کا قوم کی خدمت کریں گے یہ
مہنگائی بڑھ ہی جاتی ہے ہر بار عید پر

جلسے جلوس خطبے سبھی کچھ تو ہے یہاں
سب نے لگایا اپنا ہے بازار عید پر

کیں نہ شرارتیں تو کیا زندگی ہوئی!
ہے ان میں ایک شادیاں ہوں چار عید پر

دیکھے جو نرخ مہندی کے اور چوڑیوں کے تو
عیدی سے دیکھو بھاگا ہے دلدار عید پر

امواجؔ کا ہے نعرہ یہاں کون اہل ہے
گو اپنا سب سراہے ہیں کردار عید پر

محمد خلیل الرحمٰن خلیل

سنا ہے جیل کو پھر صاف کرنے والے ہیں
سنا ہے اس میں ''اداکار'' بھرنے والے ہیں

اُسے بھگا کے عدالت میں کرنی ہے شادی
ہم اس کے عشق میں یہ کام کرنے والے ہیں

ہوئے جو آج یکے بعد دیگرے نااہل
انہیں اگست میں پھر ووٹ پڑنے والے ہیں

مرے چمن میں وہ غنڈوں سمیت آئی ہے
''مرے گلاب نہیں خواب جھڑنے والے ہیں''

اِسی بہانے ملاقات میری ہونی ہے
سنا ہے اُس کے بھی نانا گزرنے والے ہیں

خبر ملی ہے کہ پولیس آ رہی ہے یہاں
اِسی لیے تو یہ شاعر بکھرنے والے ہیں

یہ مار کھائیں بلا ناغہ اپنی بیگم سے
شریر دوست مرے کب سدھرنے والے ہیں

حرام کھانے جو معدے خراب کرتے رہے
حلال نیکیوں سے سارے سنورنے والے ہیں

کہیں یہ خام خیالی نہ ہو خلیل تری
ترے وہ خواب محل میں اُترنے والے ہیں

محمد خلیل الرحمٰن خلیل

کیا تری بر سرِ پیکار ہے؟ کیا کہتے ہو؟
کیا وہ بھی غازیٔ گفتار ہے؟ کیا کہتے ہو؟

چار من سے بھی زیادہ تو یہ ہو گی لڑکی
کیا یہ موٹو تری دلدار ہے؟ کیا کہتے ہو؟

یہ نچاتی ہی رہے گی تجھے تگنی کا ناچ
تیری بیگم بڑی عیّار ہے؟ کیا کہتے ہو؟

جاں چھڑکتے ہیں گلی کے سبھی شیدے میدے
خوبرو اِتنی وہ مٹیار ہے، کیا کہتے ہو؟

بھول جاتی ہے یہ ''موٹو'' جو میاں اپنے کا نام
کیا ہی بے ڈھنگا سا کردار ہے، کیا کہتے ہو؟

گھر کے جالے میں اُتاروں کہ میں دھووں کپڑے؟
یہ نہ پوچھوں تو پڑے مار ہے! کیا کہتے ہو؟

آنے دیتی نہیں بیگم کی کسی ڈانٹ کا غم
وہ نکیلی مری نسوار ہے! کیا کہتے ہو؟

سر دبائے، جو سکوں دے، ملے فرحت جس سے
رہتی ''وہ'' چاند کے اُس پار ہے، کیا کہتے ہو؟

کیوں خلیل اُس کو نہیں ملتا یہاں استثنیٰ
جس کی بیگم بڑی بیمار ہے، کیا کہتے ہو؟

روبینہ شاہین بیناؔ

کبھی سیاست میں ڈیل ہو گی کبھی سیاہ کاروبار ہو گا
تو کیا یہ طے ہے یہاں ہمیشہ رذیل ہی تاجدار ہو گا

وہ جس کے دل میں ذرا بھی خوفِ خدا نہیں ہے، حیا نہیں ہے
ملے گی عزت اُسے کہاں پر وہ کس طرح نام دار ہو گا

یونہی کمائیں گے کالی دولت، یونہی چھپائیں گے قومی دولت
عجب ضمیروں کے آدمی ہیں نہ بوجھ دل پر نہ بار ہو گا

ہے سچ یہی کہ سزا ہمیشہ اُسے ملی ہے، جو بولتا ہے
جو سر کبھی حق پہ اُٹھ نہ پائے وہ سر کہاں تاجدار ہو گا

عجیب پیٹو ہیں پاک دھرتی کو چاٹتے اور نوچتے ہیں
مزید چاہیں کہ لُوٹ کھائیں، نہ اِن کو ذوقِ ڈکار ہو گا

جہاں بھی دیکھا کسی کُروی کو تو دل ہی دل میں مچل اُٹھا ہے
عجب ہے رنگین اُس کی فطرت، کبھی گلوں پہ نثار ہو گا

نہ تند سے میری بن سکی ہے، نہ ساس سے گاڑھی چھن سکی ہے
میاں کو تو اب سنبھال رکھنا یہیں سے پھر کوئی وار ہو گا

اگرچہ سب ہی سنبھالے بیٹھے ہیں اپنی سیٹیں مقننہ میں
مگر عدالت لگے گی جب جب ہر ایک باہر فرار ہو گا

روبینہ شاہین بیناؔ

محبت میں ہر جستجو ہے مثلث
رقیب اور میں اور تو ہے مثلث

زمیں پر وہ اِک نوکِ خط پر کھڑا ہے
لڑوں کس سے میرا عدو ہے مثلث

مصور کا ذوقِ جمال اوج پر ہے
چنانچہ خطِ لالہ رو ہے مثلث

مری کاوشیں بھی مثلث ہی ہوں گی
اگر میرا ذوقِ نمو ہے مثلث

جنوں ہے تو کارِ خرد کچھ نہیں ہے
نشہ ہے تو پھر ہر سبو ہے مثلث

کسی بھی مسافت کا امکاں نہیں ہے
سفینہ لبِ آبجو ہے مثلث

تجھے لگ رہا ہے کہ میں کج ادا ہوں
مجھے لگ رہا ہے کہ تو ہے مثلث

نوید ظفر کیانی

حُسن کے ٹو کی پہاڑی بنا سر ہونے تک
عشق اُکتا گیا خوباں کی نظر ہونے تک

اِس طرح حزبِ مخالف ہے کسی مشکل میں
جیسے بھوکوں کے ہوں احوال ڈنر ہونے تک

تیرے اپنے بھی نہ پہچان سکیں گے تجھ کو
پارلر میں تیرے چہرے پہ colour ہونے تک

پیڑ پھل پھول رہا ہے تو افادہ کیا ہے؟
جب مسافر نہ رہے کوئی ثمر ہونے تک

کارکن آپے سے باہر ہیں، بھڑے پھرتے ہیں
جانے درگت کیا بنے شیر و شکر ہونے تک

آپ تنقید کے لٹھ لے کے یونہی گھومتے ہیں
پلے پڑتا نہیں "یوٹرن" ہنر ہونے تک

بھاگنا ہی میرا بنتا ہے ترے کوچے سے
تیرے پپا کے وقوعے میں Killer ہونے تک

شوق سے بونگا کہے جائیں مرے لوگ مجھے
میری لایعنیوں کے علمِ جفر ہونے تک

کوئی اچھی طرح گمراہ نہیں ہو سکتا
نیوز چینل پہ اگر اور مگر ہونے تک

بیویاں بام پہ آتی نہیں شب بارہ بجے
سوتھڑے پر ہی پڑے رہنا سحر ہونے تک

لوٹ آؤ گے تو کہلاؤ گے لیڈر پھر سے
تم بھی لوٹے ہو اُدھر ہو کے اِدھر ہونے تک

ریڈ انڈین پہ بھی امریکہ میں کب گزری ہے
مجھ کیانی پہ جو گزری ہے ظفر ہونے تک

نوید ظفر کیانی

جب جڑوں میں بیٹھ کر رہ جائے درباری گروپ
ملک میں کھل کھیلنے لگتا ہے بیوپاری گروپ

جس پہ لٹکے ہیں، صلیبیں اپنے کرتوتوں کی ہیں
کیسے سمجھائے شریفوں کو عزاداری گروپ

گنجوں کے ناخن بھی بڑھنے لگ گئے ہیں خیر سے
غیر سرکاری ہوا ہے جب سے سرکاری گروپ

اِس تغیر پر تو اب پیرِ فلک بھی دنگ ہے
ہو گیا مظلوم کیسے ایک تاتاری گروپ

اِن کے حصے کے ابھی احمق ہیں باقی قوم میں
آ گیا ہے پھر سے حج فرما کے زرداری گروپ

فال اِس سے کامیابی کی نکلوائی تو ہے
ایک طوطا بھی لئے پھرتا ہے خرکاری گروپ

ٹین ڈبے لے کے نکلے ہیں گلی میں خان جی
اِن کے ٹھیلے پر بھی ہے لوٹوں کا اک بھاری گروپ

جس سے ہنگامہ بپا ہے مقتدر ایوان میں
حلیۂ مسماری میں ہے ایک معماری گروپ

بولنے پر آئیں تو کومہ نہ فل اسٹاپ ہو
رکھا ہے ہر پارٹی نے ایک بمباری گروپ

جب لفافے مل گئے تو بات پکی ہو گئی
چینلوں پر محوِ فن رہتا ہے ملہاری گروپ

کالے انگریزوں کے پنجے میں نظامِ قوم ہے
کس طرح پتلون سے بڑھ پائے شلواری گروپ

ملک تو پہنچا ہوا ہے ارتقاء کی اوج پر
شرپسندوں نے بنا رکھے ہیں ناداری گروپ

اب لگا رکھی ہے بولی مقتدر حضرات نے
بارور کیا خاک ہو گا کوئی خودداری گروپ

سیّد فہیم الدین

نسوار بیچ کر تو کبھی پان بیچ کر
پاتے ہیں رزق چوک میں ہم نان بیچ کر

باقی تو سارے چھیچھڑے اور اوجھڑی ہی تھی
قصاب جا چکا ہے فقط ران بیچ کر

یہ کہہ دیا پولس نے کہ رشوت تو لیں گے ہم
آخر کو کام کرتے ہیں ہم جان بیچ کر

اُس سے کہا گیا تھا تو کچھ اور بیچ لے
لیکن وہ خوش ہوا ہے مسلمان بیچ کر

عزت تو کوئی پا نہ سکا آج تک فہیم
ذلت ہی اُس نے پائی ہے ایمان بیچ کر

سیّد فہیم الدین

خوبصورت بھی مالدار بھی ہو
ایک بیوہ کہ جس سے پیار بھی ہو

یار بنگلہ تو لازمی ہو گا
اور بنگلے کے ساتھ کار بھی ہو

قابلِ دید ہو سلامی بھی
ساتھ میں ساس جی کا پیار بھی ہو

سارا مینو ہو کچھ مرغن سا
ساتھ میں پھر ذرا اچار بھی ہو

ایک بیوی ملے فہیم ابھی
آگے تعداد چاہے چار بھی ہو

گوہر رحمٰن گہرؔ مردانوی

اشتہا اور بڑھاتی ہے مٹن کی خوشبو
گیٹ تک آئی ہے نتھنوں میں چکن کی خوشبو

گرچہ مرغوب غذاؤں میں بہت کچھ ہیں مگر
میل تک بھانپ بھی لیتے ہیں چکن کی خوشبو

خوش خوراکی سے جو مرتا ہے ناداں ہے شہید
مار دیتی ہے نہاری سے اٹھن کی خوشبو

ڈاکٹر روک نہ، پرہیز کی ایسی تیسی
جبکہ سلویٰ میں رچی ساتھ ہو مَن کی خوشبو

اک لگن سر میں سمائی ہے، گہرؔ کھا پی لیں
سونگھ لیتے بھی ہیں آٹے کے لگن کی خوشبو

گوہر رحمٰن گہرؔ مردانوی

آنکھ گر اے سمارٹ مارے گا
کوئی کس کر چماٹ مارے گا

یوں نہ کر، تو نہیں ہے (رنگیلا)
عشق کا ہنس کے پارٹ مارے گا

خود تو سویا ہے بیچ کر گھوڑے
اب خراٹے آ لاٹ مارے گا

دیر کی تو خبر ہے پھر لاتیں
سر مجھے آٹھ آٹھ مارے گا

کون ہے وہ سخی، ملے ربا!
منہ پہ میرے پلاٹ مارے گا

جائیو مت گہرؔ سرِ بازار
وہ دوکاں دار باٹ مارے گا

عبدالرحمٰن واصفؔ

کیوں سمجھتی ہے مجھے عقل کا اندھا، سالی!
مجھ سے کھائے گی طمانچے یہ تمنا سالی!

میری مٹی میں رچا صبر مجھے کافی ہے
کوئی لے جائے مری آنکھ سے دنیا سالی

تیرے حصے کی تب وتاب مبارک ہو تجھے
میں فقیر اور مرا فخر ہے کہنہ سالی

موئی بے کار محبت کی کہانی رک جا
ورنہ جانا ہی مقدر ہے تو جا جا، سالی!

ادھ موا کر کے رکھا ہے کسی ہجرت نے مجھے
کرتی جاتی ہے مسلسل مجھے صحرا سالی!

نوؔر جمشید پوری

بن کر سپاہی ملک کا،خطرہ اٹھائیے
ہر دن نیا نہ ملک میں فتنہ اٹھائیے

بہتر رہے گا آپ جو وردی اتار کر
جا کر غریب غرباء سے ہفتہ اٹھائیے

پہلے ہی کتنے فرقوں میں ہم بٹ چکے ہیں اب
ہر دن نیا نہ قوم میں شوشہ اٹھائیے

قربت نصیب ہوگی ذرا بڑھ کے آپ گر
مدت سے درمیان ہے، پردہ اٹھائیے

جب بھی خریدیں خام کوئی پھل دکان سے
دو چار ان کے ساتھ میں پختہ اٹھائیے

گزری تمام عمر اسیری میں اب ذرا
دل سے ہمارے،نظروں کا پہرہ اٹھائے

روشن کرے گا گوشۂ دل پیار سے صنم
در پر پڑا ہے نوؔر کا نامہ، اٹھائے

شوکت جمالی

اقبال شانہ

وہ آئے مرے دل پہ چھریاں چلا کے
مری سرجری ''پوسٹ مارٹم'' بنا کے

مہینوں ہمیں نیند آتی نہیں تھی
وہ جب دیکھ لیتے تھے چلمن ہٹا کے

پرندوں پہ تحقیق کرنے چلے ہیں
وہ اپنے ہی طوطے کو اُلو بنا کے

اُجاڑی ہے فصلِ محبت جو میری
مرے دل کی کھیتی میں بھینسیں چرا کے

دوانہ ہوں میں، شوق سے سُن رہا ہوں
غزل گا رہے ہیں وہ ڈھولک بجا کے

بڑے شوق سے اس نے شادی رچالی
جو شانہ تھا اُس کو دوانہ بنا کے

آ کر مری آنکھوں کو ذرا دیکھ ستمگر!
ہیں تیری محبت میں ابھی خشک، ابھی تر

قاصد بھی ہے پیغام رسانی سے گریزاں
آنکھوں کو ہے طوطے کی طرح پھیرے کبوتر

پوچھو کہ عدو لینے کو آتا ہے بھلا کیا؟
منہ پھیر کے غصے سے وہ کہتے ہیں ''ترا سر!''

بدلے میں وفا کے مجھے کیا دو گے، بتا دو!
یہ فیصلہ ہو جائے ابھی اور یہیں پر

ہم اُن کی گلی جان لُٹانے کو جو پہنچے
بولے ''ہمیں بدنام نہ کر! اور کہیں مر!!''

تو کس لئے ٹالے ہے بھلا کل پہ مرا کام
گر قتل ہی کرنا ہے تو کر آج، ابھی کر

ارمان یوسف

سفر وسیلہ ظفر

سٹون ہینج

بابِ دہم

پہلوانی پتھروں کے عجائبات

سفرنامے لندن ایکسپریس کا ایک باب

ہم جیسے ایک عظیم مفکر، مبلغ، دانشور، حکیم لامت، شہنشاہ اور ظلِ الٰہی شیخ ارمان الدین گجراتی سمیت کسی کو بھی آج تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ سٹون ہنج کس نے تعمیر کیے تھے اور ان کی تعمیر کا مقصد کیا تھا؟

بھی جب ہمیں نہیں معلوم، جہاں سے علم کے چشمے پھوٹ رہے ہیں تو چینی نقالوں، جاپانی انجینیئروں، امریکی باگڑبلوں یا برطانوی لونڈوں کو بھلا کیسے پتا چل سکتا ہے؟

آپ جان تو گئے ہوں گے کے ہم کن پتھروں کی بات کر رہے ہیں، یہ وہ پتھر نہیں جن کے بارے میں مصطفیٰ زیدی نے فرمایا تھا ؎

انہیں پتھروں پہ چل کے اگر آ سکو تو آؤ!
مرے گھر کے راستے میں کہیں کہکشاں نہیں ہے

بلکہ یہ وہ دیو ہیکل اور پہلوانی پتھر ہیں جنھیں آپ اپنے لیپ ٹاپ یا کمپیوٹر کی سکرین پر اکثر دیکھتے ہیں۔ گھبرائیں نہیں آج ہم نے انہیں ڈھونڈ نکالا ہے، یہ یہیں تھے برطانیہ کے علاقے امیز بری میں۔ لمبے تڑنگے کھڑے پتھر سر پر پتھر ہی رکھے جیسے سزا بھگت رہے ہوں یا تماشا کر رہے ہوں۔ یہ اہرامِ مصر جیسی جدید تعمیرات سے بھی پہلے کے ہیں۔ یہ ابتدائی انسانی تاریخ کے دور کے ہیں۔

لگ بھگ تین ہزار سال قبل مسیح ان کی بنیاد ڈالی گئی تھی۔ پتھروں کی اس عمارت کے تین بنیادی حصے تھے جن میں پہلا لمبا گول دائرہ جو نیلے پتھروں سے بنایا گیا تھا اور بعد میں بڑے بڑے پتھر کھڑے کر کے ان کے کاندھوں پہ پتھر ہی لاد دیے گئے تھے۔ اسی کے قریب بھاری پتھروں کے نشان ملتے ہیں جو زمانے کی سختیاں جھیلتے جھیلتے اب فقط تینتالیس ہی آن بچے ہیں، باقی بلی کھا گئی؛ وقت کی ظالم اور تیز دھار پنجوں والی بلی، جو آج کل ہماری جوانی بھی نوچنے پہ تلی ہے مگر ہم بھی کہاں ہیں قابو میں آنے والے۔ نہیں نہیں ابھی نہیں۔

کھا گئی؛ وقت کی ظالم اور تیز دھار پنجوں والی بلی، جو آج کل ہماری جوانی بھی نوچنے پہ تلی ہے مگر ہم بھی کہاں ہیں قابو میں آنے والے۔ نہیں نہیں ابھی نہیں۔

بعض محققین کہتے ہیں کہ یہ پتھر یو کے کی ایک ریاست ویلز سے لائے گئے تھے اور بعض کے نزدیک انہیں آئر لینڈ کے دریا سے لایا گیا تھا۔ بہر حال قصہ جو بھی ہو یہ پتھر آج بھی ایک عجوبہ ہیں۔ قدیم دور کے فنِ تعمیر کا ایک عجوبہ۔

حیرت انگیز طور پر گرمیوں میں جب سورج طلوع ہوتا ہے تو عین دو بڑے پتھروں کے بیچ اور باہر لگے ایک چھوٹے پتھر کی ناک کی سیدھ کے برابر نکلتا ہے جس سے اس بات کا بھی قوی امکان پیدا ہو جاتا ہے کہ اس زمانے کے لوگ بھی سورج کی چال اور ستاروں کی حرکات کو اچھی طرح سے سمجھتے تھے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اسی پتھر کے ذریعے موسموں کے بدلنے کا اندازہ لگاتے ہوں اور سورج اور چاند کے دن بھی گنتے ہوں کیونکہ یہ اس قدر صحیح انداز سے رکھے گئے ہیں۔

پتھروں کے ان عجائبات کے دیکھنے کے لئے ہر سال دنیا بھر سے اسی لاکھ کے قریب لوگ یہاں آتے ہیں۔ آپ فی الحال اپنے کمپیوٹر کی سکرین پر ہی دیکھئے یا پھر خواب میں۔ ہم نہیں انگلی تھام کے یہاں گھمانے والے۔

ارمان یوسف کا پشتینی تعلق مظفر گڑھ سے ہے لیکن سکونت برسہا برس سے لندن میں ہے۔ ارمان صاحب خوبصورت لب و لہجے کے شاعر اور ایک اچھے انشاء پرداز ہیں۔ مختلف رسائل و جرائد میں باقاعدگی کے ساتھ شائع ہو رہے ہیں۔ طنز و مزاح ان کا سلوب بیان ہے۔ ان کی اوّلین تصنیف ''لندن ایکسپریس'' ہے۔ یہ اُن کا سفرنامہ ہے جو ''ارمغانِ ابتسام'' میں بھی قسط وار شائع ہو رہا ہے۔ ''ارمغانِ ابتسام'' کے اولین کرم فرماؤں میں سے ہیں۔

اشیرباد

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

بڑھاپا

کوئی انسان اگر موت کو چکمہ دینے میں ساٹھ سال سے اوپر تک کامیاب رہے تو اس پر بڑھاپا آ جاتا ہے۔ بڑھاپے کو بیماری کہنا تو غلط ہی لگتا ہے کہ یہ انسانی زندگی کے ادوار میں سے ایک دور ہے۔ کہتے ہیں کہ بڑھاپے اور بچپن کا زمانہ ایک ہی سا ہو جاتا ہے بلکہ اکبر تو اس سے چند قدم آگے بڑھ کر یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔

ضعیفی زور پر آئی، ہوئے بے دست و پا اکبر
کیا بچوں سے بدتر ہم کو پیری نے جواں ہو کر

اکبرالہ آبادی

مگر اس دور میں بیماریوں کی افراط اکثر لوگوں کو یہ کہنے پر مجبور کرتی ہے کہ بڑھاپا ''بُرا آیا'' ہے کہ انسان اپنے آپ کو سنبھال بھی نہیں سکتا اور اسے کسی نہ کسی سہارے کی ضرورت ضرور پڑتی ہے ۔

بوڑھوں کے ساتھ لوگ کہاں تک وفا کریں
لیکن نہ موت آئے تو بوڑھے بھی کیا کریں

اکبرالہ آبادی

طبی اصطلاح میں بچوں کی بیماریوں کے شعبے کو جیسے پیڈیاٹرکس کہا جاتا ہے اسی طرح بزرگوں کی بیماریوں سے متعلق شعبے کو شعبہ جیریاٹرکس کا نام دیا گیا ہے۔ بڑھاپا اور بیماری کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے اگرچہ یہ آفاقی سچائی نہیں۔ لہذا آپ کو اس عمر میں بھی چست اور چاق و چوبند بزرگ نظر آ سکتے ہیں مگر ترقی پذیر ممالک میں رقیب کو طوالت عمر کی دعا فقط اس لئے دی جاتی ہے کہ ۔

تا کہ ہو پوری طرح سے وہ بڑھاپے میں ذلیل
''دشمن جاں کو بھی جینے کی دعا دی جائے''

نوید صدیقی

ترقی یافتہ ممالک میں، جہاں اوسط عمر ساٹھ برس سے کہیں زیادہ ہے۔ پچپن برس کی عمر کو تو جوانی ہی میں شامل کیا جاتا ہے۔ مگر ترقی پذیر ممالک میں غربت و افلاس، ناخالص غذا، صفائی کے فقدان اور بیماریوں کی یلغار کے سبب لوگ پچاس برس سے پہلے ہی بوڑھے نظر آنے لگتے ہیں۔ اور بقول مسٹر دہلوی بعض اوقات زندگی کے مصائب و آلام وقت سے پہلے ہی انسان کو

بوڑھا بنادیتے ہیں:

یہ ہے اِک کلیہ بڑھتی ہے جتنی عمر انسانی
اضافہ تجربوں میں بھی اسی کے ساتھ ہوتا ہے
مگر مستؔر بہت سے تجربات ایسے بھی ہوتے ہیں
سبب بنتے ہیں جو خود عمرِ انساں میں اضافے کا

مستؔر دہلوی

جوانی اور بڑھاپے کی اس درمیانی مدت کو جسے ادھیڑ عمر بھی کہا جاتا ہے لوگوں کی زندگی اسی ادھیڑ بن میں گزر جاتی ہے کہ وہ جوان ہیں یا بوڑھے۔ زندگی کے اس دور کی کچھ اس طرح عکاسی کی گئی ہے ۔

جوانی چشمکیں کرنے لگی ہے
بڑھاپا دھمکیاں دینے لگا ہے

امیرؔ الاسلام ہاشمی

مجھے بوڑھا کہا جاتا ہے کیسے؟
خفا اِس پر میں سب سے ہوگیا ہوں
بجا کہ عمر ہے ستر برس کی
مگر میں بوڑھا کب سے ہوگیا ہوں

نوید ظفرؔ کیانی

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی نے یہ نظم ایسے ہی نوجوان بوڑھوں کے متعلق لکھی ہے۔

میرے بچپن (۵۵) کے دن

دانت جھڑنے لگے ، ہاتھ ہلنے لگے
قلب مُضطر اُلٹ چال چلنے لگے
گل خزاؤں میں یوں رنگ بھرنے لگے
آنکھ میں موتیا اب اترنے لگے
ہر طرف بے بسی کے یہی سین ہیں
میرے بچپن کے دن کتنے سنگین ہیں

ہے بہ فیضِ ملاوٹ یہ حالت مری
ہانپ کر طے ہوئی ہے یہ آدھی صدی
کون جانے کہ کب ہوگی فل سنچری
ہے حوادث سے معمور یہ زندگی
آہنی ہاتھ تھے جو کبھی ، ٹین ہیں
میرے بچپن کے دن کتنے سنگین ہیں

گال پچکے ہوئے آنکھ ہے زرد زرد
ہے ہر اک جوڑ میں آجکل میرے درد
چھوڑ کر اپنے پیچھے میں سالوں کی گرد
کھینچتا ہوں صبح و شام اب آہِ سرد
یوں بڑھائے قدم جانبِ دین ہیں
میرے بچپن کے دن کتنے سنگین ہیں

یہ نہیں کہ مرے گھر میں ٹی۔وی نہیں
دال روٹی نہیں چینی اور گھی نہیں
ہے سبھی کچھ مگر اب وہ دل ہی نہیں
مانتی کوئی بھی بات بیوی نہیں
دے رہی ہے تری بچے ''ففٹین'' ہیں
میرے بچپن کے دن کتنے سنگین ہیں

زندگی ہے رواں بس یونہی دم بہ دم
ہر نیا دن کرے اس کو کچھ اور کم
اب نہیں راستے میں کوئی پیچ و خم
سوئے پینشن بڑھائے ہیں ہم نے قدم
عمر کے رخش پہ بیٹھے بے زین ہیں
میرے بچپن کے دن کتنے سنگین ہیں

کب کسی سے تھی یاں دوست داری مری
نوکری ہی سے تھی صرف یاری مری
عمر گزری ہے کرسی پہ ساری مری
آئے گی کب بھلا دیکھو باری مری
گورکن سارے مائل بہ تدفین ہیں
میرے بچپن کے دن کتنے سنگین ہیں

بڑھاپے کی آمد سے ہر کوئی نہیں گھبراتا بلکہ بقول انور مسعود بعض لوگ تو اس کا اعلان ببانگ دہل کرتے نظر آتے ہیں، اور کچھ باہمت بزرگ تو بڑھاپے کے فوائد بھی گنوانے بیٹھ جاتے ہیں:

وہ بتلاتا پھرے ہے ہر کسی کو
بڑھاپا اس کے سر پر آ گیا ہے
اسے ہے خواہش اعلان پیری
ہمارا یار بھی سٹھیا گیا ہے

انور مسعود

عمر کے بڑھنے سے کیا کیا فائدے حاصل ہوئے
کس قدر تھے مسئلے ہم جن سے بے غم ہو گئے
اب نہ کنگھی کی ضرورت ہے نہ ہے ٹوتھ برش کی
کتنے اخراجات تھے جو خود بخود کم ہو گئے

انور مسعود

عمرِ عزیز پھنس گئی ستر کے پھیر میں
لیکن یہ اور بات کہ جی دار پھر بھی ہیں
نہ منہ میں دانت ہے نہ کوئی آنت پیٹ میں
ایک اور عقد کے لئے تیار پھر بھی ہیں

نوید ظفر کیانی

حلیہ

اتنی بوسیدہ ہے اب تو رخ ہستی کی نقاب
آج پڑھتا ہوں تو صفحات گرا کرتے ہیں

امیر الاسلام ہاشمی

چہرے پہ مہ و سال کی گرد جھریوں کی صورت اپنے نقش پا ثبت کئے، آنکھوں میں بہ یک وقت گزرے برسوں کی دلپذیر اور اندوہناک تحریریں، سماعتوں میں شیرینی گفتار سے لے کر تلخی دوراں کی مختلف آوازیں، حاصل زیست کی خوشیاں اور ناکامیوں کی اداسیاں بڑھاپے کی زندگی کو یادگار بناتی رہتی ہیں۔ کسی بزرگ کے بڑھاپے کا حلیہ مذکورہ چیزوں کی افراط و تفریط سے بنتا اور بگڑتا ہے۔ ذیل میں درج اشعار ان کیفیتوں کو الفاظ کا جامہ پہناتے ہوئے دیکھے جا سکتے ہیں ۔

عجب جھری زدہ چہرہ ہے اپنا
چھوہارے جیسی صورت ہو گئی ہے

امیر الاسلام ہاشمی

ہماری بیوی تو حاضر جواب اتنی ہے
سوال بننے سے پہلے جواب حاضر ہے
دکھا کے چہرے کی سب جھریاں وہ کہتی ہے
رفاقتوں کا پرانا حساب حاضر ہے

امیر الاسلام ہاشمی

پہلے کرسی تھی آج کھٹیا ہے
وہ اسیری تھی یہ رہائی ہے
حال یہ ہے کہ حال پتلا ہے
پیٹ چلتا ہے آنکھ آئی ہے

اپنی آنکھوں میں خود کھٹکتے ہیں
موتیے سے بھی آشنائی ہے

امیر الاسلام ہاشمی

بڑھاپے سے ہوا ہے جسم بالکل سوکھ کر کانٹا
مگر ناظرؔ تمھاری یہ گل افشانی نہیں جاتی

ناظرؔ ٹونکی

میں بھی جیسے ہوں اسپ پیری پر
جانے کب سے کہیں رُکا ہوا ہوں

نوید ظفر کیانی

ضعف پیری سے ہے اعضاء پہ تعطّل وارد
کیا چلیں کاریں کہ پٹرول نہیں کاروں میں

بشیر احمد چونچال

لگے وہ عمر میں فرعون کے زمانے کا
تمام عمر کی لیڈیز کو کہے، باجی!

روبینہ شاہین بینا

روداد مریضِ ضعیف

ہو صرف ہاتھ میں ''پینشن'' تو کیا کیا جائے
اور اُس پہ رعشے کی ''لرزن'' تو کیا کیا جائے
اُٹھے جو کھانسی کا طوفان، سانس رُک جائے
ہو بجلیوں میں نشیمن تو کیا کیا جائے
تمام جوڑ دُکھیں، جسم درد بن جائے
بدن میں سارے ہو اینٹھن تو کیا کیا جائے
فشارِ خون کرے انتشارِ قلب و دماغ
جو دل کی تیز ہو دھڑکن تو کیا کیا جائے
تمام دانت جدائی کا داغ دے جائیں
مگر وہ دیں ہمیں منجن تو کیا کیا جائے
مٹھائی بند ہوئی ہے نمک سے ہے پرہیز
ہر ایک شے پہ ہو قدغن تو کیا کیا جائے
دماغ کھائیں نہ اُن کا تو اور کیا کھائیں
ملیں جو کھانے کو بینگن تو کیا کیا جائے
نظامِ معدہ کا ماہر لگائے ہم کو ''ڈرپ''
نہ ہو حکیم کا چورن تو کیا کیا جائے
بجا کہ ضعفِ سماعت ہے اور نظر کمزور
مُخل ہو پسِ چلمن تو کیا کیا جائے
اگرچہ دیکھ کے داڑھی بُلائے نرس ہمیں
مگر ہو دل کی جو پھسلن تو کیا کیا جائے
مَرَض تمام ہیں اپنے رفیقِ دیرینہ
ہو ڈاکٹر کو جو اُلجھن تو کیا کیا جائے
نہ کوئی سُلگے بڑھاپے کی آگ میں مظہرؔ
مگر ہو جسم جو ایندھن تو کیا کیا جائے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

سفید بال اور خضاب

گو سفید بالوں کا طوالت عمر سے سو فی صد تعلق نہیں کہ کبھی کبھار یہ کچھ امراض میں یا موروثی طور پر بغیر کسی مرض کے بھی نظر آجاتے ہیں۔ ہمارے ایک جاننے والے کہ جن کے بال موروثی طور پر بیس سال کی عمر میں ہی سفید ہو گئے تھے اس بزرگی پر کبھی

کبھی شاد بھی نظر آجاتے تھے کہ بس میں فوراً سیٹ مل جاتی، بل جمع کرانے میں قطار کے بغیر ہی جلد از جلد کام ہو جاتا بلکہ نوخیز لڑکیاں بھی بزرگی کے کچھ نمبر دے کر سر پر ہاتھ پھروا لیتیں۔ لیکن اصلی

بزرگوں کو بالوں کی سفیدی کو جوانی کی سیاہ زلفوں میں بدلنے کا شوق اور لگن چین سے نہیں رہنے دیتا۔

میں رنگ پیری میں بھر رہا ہوں
خضاب سے بن سنور رہا ہوں

حاجی لق لق

گزری سیاہ کاری میں یارب تمام عمر
آدھی شباب میں کٹی آدھی خضاب میں

رئیس امروہوی

اٹ گیا سر سفید بالوں سے
تیرگی چھٹ گئی اُجالوں سے

بشیر احمد چونچال

سفید بال اگر دھوپ کی عنایت ہیں
توہم بھی چہرے پہ کچھ دھوپ مل کے دیکھتے ہیں

شہزاد قیس

پرانے مجنوں سبھی اپنے دیکھے بھالے ہیں
سفید بال ہیں لیکن اعمال کالے ہیں

روبینہ شاہین بینا

آئی ہے جب سے اپنی پڑوسن شباب پر
بیوی ہماری رہتی ہے کچھ اضطراب میں

ہوتے نہیں سیاہ کیوں علوی سفید بال
''بیوی نے کچھ ملا نہ دیا ہو خضاب میں''

احمد علوی

نہ بڑھتی عمر سے گھبرا نہ یوں پریشاں ہو
پرابلم سبھی حل یہ خضاب کردے گا

عرفان قادر

دیکھا جو زلفِ یار میں کاغذ کا ایک پھول
میں کوٹ میں گلاب لگا کر چلا گیا
پوڈر لگا کے چہرے پہ آئے وہ میرے گھر
میں ان کے گھر خضاب لگا کر چلا گیا

سرفراز شاہد

کمر

صفی شباب جو کھویا گیا ہے پیری میں
اسی کو ڈھونڈ رہا ہوں کمر جھکائے ہوئے

صفی لکھنوی

ضعفِ پیری سے کمر تو جھک گئی ہے شیخ کی
پر در توبہ پہ اس کھوسٹ کی گردن خم نہیں

بشیر احمد چونچال

دانت

یہ دردنداں جو چوکیدار ہیں جھڑ جائیں گے
پوپلے منہ کا یہ دروازہ کھلا رہ جائے گا

عنایت علی خان

کسی ریستوران میں میاں بیوی مصروف طعام تھے مگر حیرت اس بات کی تھی کے دونوں کے سامنے کھانا رکھا تھا مگر صرف شوہر

مسلسل کھائے جارہا تھا اور اس کی بیوی اسے دیکھے جارہی تھی۔ کسی نے قریب جاکر وجہ جاننی چاہی تو شوہر اپنے پوپلے منہ سے بتیسی نکالتے ہوئے بولا دراصل ان کی بتیسی کہیں گر گئی ہے اب یہ بتیسی لگائیں گی تو کھانا کھائیں گی۔ اور یہ لطیفہ بھی کم معروف نہیں کہ ایک کنجوس بزرگ نے جب بہت سی چھلی ہوئی مونگ پھلیاں اپنے مہمانوں کو پیش کیں۔ واقف کاراُن کی اس دریا دلی پر حیرت زدہ رہ گئے اور فیاضی کی وجہ پوچھ ہی لی۔ بزرگ اپنی رال پونچھتے ہوئے بولے "بھئی اب دانتوں سے مونگ پھلیاں کہاں چبائی جاسکتی ہیں۔ میں نے ان کے اوپر کی چاکلیٹ چوس لی ہے، توسوچا کہ مونگ پھلیاں خوامخواہ پھینکنے کا کیا فائدہ چلو کسی کا پیٹ ہی بھر جائے گا۔"

جب تک دانت سالم رہتے ہیں انسان ان کی قدر نہیں کرتا مگر بڑھاپے کی آمد دانتوں کی اہمیت کو جب اجاگر کرتی ہیں تو بہت دیر ہوچکی ہوتی ہے:

کھانے کو "روسٹ" تھے تو بہت بیقرار دانت
منہ میں مگر تھے سارے نحیف و نزار دانت
تھے جب چنے نہ پاس تو سالم تھے دانت سب
جب مل گئے چنے تو بچے صرف چار دانت

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

بوڑھوں کے ہاسٹل میں بنی ہیں گنڈیریاں
للکار ہے یہ بوڑھوں کی بتیسیوں کے نام

شوکت جمال

اے میری سابق بتیسی
ساٹھ برس تک چکی پیسی
رخصت میرے اصلی دانتو
اصلی وصلی نسلی دانتو

سید ضمیر جعفری

بجا خدا سے شکایت یہ بیویوں کی ہے
کبھی ضعیف نہ ہو وہ جواں نہیں ملتا
کسی کی آنت نہیں ہے کسی کے دانت نہیں
یہاں کسی کو مکمل میاں نہیں ملتا

انور علوی میرٹھی

آنکھیں

اک دھندسی ہے جس میں ہیولا سا ہے کوئی
ہے کون میرے سامنے مجھ کو خبر کہاں
اب مائینس تھری کا بھی چشمہ اتر گیا
"اب دیکھئے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں"

انور مسعود

بڑھاپے میں ضعف بصارت کے بہت سے نقصانات میں سے ایک یہ بھی نقصان ہے کہ عینک لگنے کے بعد منکوحہ اپنی اصلی شکل میں پھر سامنے آجاتی ہے اور ایسے بھی ہوتا ہے ۔

جب سے عینک لگی نظر والی
زہر لگنے لگی ہے گھر والی

سرفراز شاہد

نہ بیوی ہماری نہ ہم دیکھتے ہیں
بڑھاپے میں دونوں ہی کم دیکھتے ہیں

امیر الاسلام ہاشمی

یاد کرتا ہوں نوجوانی کو
جو کبھی لوٹ کر نہیں آتی
اب تو عینک لگا کے بھی عاصی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

عاصی اختر

شباب یار اب لحہ بہ لحہ بڑھتا جاتا ہے
ستم یہ ہے کہ بینائی مری کم ہوتی جاتی ہے

حاجی لق لق

بڑھاپے میں ایک ایسا وقت بھی آتا ہے انساں پر
کسی کی جان ہو وہ اپنی جاں معلوم ہوتی ہے
ہر اک ففٹی پلس کو دوستو چشمے کے اندر سے
ہر اک تھرٹی پلس بچوں کی ماں معلوم ہوتی ہے

احمد علوی

سماعت

محفل میں وہ بھی آئے دیکھو مگر یہ قسمت
پہنے ہوئے نہیں تھا میں چشمۂ بصارت
سوچا زباں سے کہہ دوں میں حالِ دل ہی لیکن
لائے نہیں تھے اس دن وہ آلۂ سماعت

شوکت جمال

رعشہ

اب آئے ہو تجدید مراسم کے لئے جب
ہے ہاتھ میں رعشہ مرے اور پشت خمیدہ

شوکت جمال

رعشہ پڑ گیا جسم کو جھٹکے لگتے ہیں
میرے مولا یوں تو نہ دھکے مار مجھے

انعام الحق جاوید

عمر کی ٹیکنالوجی ہے رعشہ
وائبریشن پہ میں لگا ہوا ہوں

نوید ظفر کیانی

دیکھ کر رعشہ جناب شیخ کا میں نے کہا
کیا کریں گے اس بڑھاپے میں خمیرے چاٹ کر
ہے تپ لرزاں کی زد میں آپ کا سارا وجود
"اب عصا بنوایئے نخلِ تمنا کاٹ کر"

امیر الاسلام ہاشمی

باپ کے بعد بن گیا دادا
میری آنکھوں پہ چڑھ گیا چشمہ
میرے ہاتھوں میں آ گیا رعشہ
اُڑ گئے بال ہوگیا گنجا
"زندگی سے یہی گلہ ہے مجھے
تو بہت دیر سے ملا ہے مجھے"

احمد علوی

نسیان

بڑھاپا اور نسیان اکثر لازم و ملزوم سمجھے جاتے ہیں۔ کسی دعوت میں مہمان نے دیکھا کہ عمر رسیدہ میزبان خاتون خانہ اپنے شوہر کو بار بار نت نئے پیار کے ناموں سے بلا رہی ہیں "جانو یہ برتن اٹھا دینا"، "سوئٹو پلیز وہ ڈش دینا"، "جان ذرا پانی کا گلاس تو

دے دو" مہمان اس عمر میں یہ التفات دیکھ کر بہت متاثر ہوا اور کہنے لگا کہ "ماشاللہ بھابھی اس عمر میں بھی آپ میرے دوست سے اتنا پیار کرتی ہیں اور اسے اتنی عزت دیتی ہیں کہ کبھی اس کو نام سے نہیں بلاتیں"۔ بوڑھی میزبان ہنس کر بولیں "کیا بتاؤں بھائی جی میں پانچ سال سے ان کا نام بھول چکی ہوں۔ اب پوچھوں تو شرم آتی ہے۔ اس لئے میں بس اسی طرح کام چلا لیتی ہوں"

ایسا تھا مرا حافظہ نسیان سے پہلے
کرتا میں پہن لیتا تھا بنیان سے پہلے

ڈاکٹر نعیم مشتاق

لیکن اس کے برعکس کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ـ

کتنی ستم ظریفی ہے اے عمر رائیگاں
آئی ہے آج عقل تو سٹھیا گیا ہوں میں

امیر الاسلام ہاشمی

بڑھاپے میں عشق

ستر برس میں سوجھی ہے شادی کی آپ کو
اس عمر میں یہ پھول کھلائے تو کیا کیا
دو کھوپڑی پہ بال ہیں دو منہ میں دانت ہیں
"سب کچھ لٹا کے ہوش میں آئے تو کیا کیا"

احمد علوی

خرگوش کا ہے خواب تو کچھوے کی چال ہے
ہنستے ہیں لوگ شوخیٔ گفتار دیکھ کر
جوشِ شباب میں ترے آنگن میں کودتا
یاد آ گیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

طٰہٰ خان

جوانان محبت کے جگر میں درد ہوتا ہے
مگر شادی شدہ لوگوں کے سر میں درد ہوتا ہے
بڑھاپے کا مگر درد محبت بھی نرالا ہے
خیال کوئے جاناں سے کمر میں درد ہوتا ہے

طٰہٰ خان

کیا بتائیں شب وصل کا ماجرا
بس بسر ہوگئی کھانستے کھانستے

وہ تو اظہار الفت کے تھے منتظر
یاں سحر ہوگئی کھانستے کھانستے

طٰہٰ خان

جن کی جانب آنکھ اٹھانا بھی تھا ہم کو ناگوار
عہد پیری میں ہمیں وہ بھی گوارا ہوگئیں

امیر الاسلام ہاشمی

حسن جادو جگائے گا اپنا
ایک دو دن کے اب جلال کے بعد
کتنے باریش اس کو گھوریں گے
بوڑھے شوہر کے انتقال کے بعد

امیر الاسلام ہاشمی

مشورہ

کہا نتھو نے میں کمزور ہوں بیمار رہتا ہوں
جوانی ڈھل گئی تنہا ہوں اور بیزار رہتا ہوں
ارادہ ہے کسی بیوہ سے ہی شادی رچا ڈالوں
کہو کیا رائے دیتے ہو بڑا لاچار رہتا ہوں
اسے میں نے کہا نتھو کرو جلدی کرو شادی
وگرنہ رہتی سہتی بھی جوانی کھو ہی جائے گی
یہ مت سوچو کہ بیوہ ہو تمہیں کیا فکر ہے اس کی
کوئی ہو کیسی ہو کر لو وہ بیوہ ہو ہی جائے گی

حکیم غلام نبی

عاشق کوتو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

کیا قہر ہے یارو جسے آجائے بڑھاپا
اور عیش جوانی کے تئیں کھائے بڑھاپا
عشرت کو ملا خاک میں غم لائے بڑھاپا
ہر کام کو ہر بات کو ترسائے بڑھاپا

سب چیز کو ہوتا ہے برا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

آگے تو پریزاد یہ کہتے تھے ہمیں گھیر
آتے تھے چلے آپ جو لگتی تھی کہیں دیر
لو آکے بڑھاپے نے کیا اور بھی اندھیر
جو دوڑ کے ملتے تھے وہ اب لیتے ہیں منہ پھیر

سب چیز کو ہوتا ہے برا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

آگے تھے جہاں گلبدن اور یوسف ثانی
دیتے تھے ہمیں پیار سے چھلوں کی نشانی
مرجائیں تو اب منہ میں نہ ڈالے کوئی پانی
کس دکھ میں ہمیں چھوڑ گئی ہائے جوانی

سب چیز کو ہوتا ہے برا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

ہم بھی تھے جوانی میں بہت عشق کے پورے
وہ کون سے گلرو ہیں جو ہم نے نہیں گھورے
اب آکے بڑھاپے میں ہوئے ایسے ادھورے
پر جھڑ گئے دم اڑ گئی پھرتے ہیں لنڈورے

سب چیز کو ہوتا ہے برا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

کیا یار الٹ ہم سے گیا ہائے زمانہ
جو شخص کہ تھے اپنی نگاہوں کا نشانہ
چھیڑے ہے کوئی ڈال کے دادا کا بہانہ
ہنس کر کوئی کہتا ہے کہاں جاتے ہو نانا

سب چیز کو ہوتا ہے برا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

پوچھیں جسے کہتا ہے کہ کیا پوچھے ہے بڈھے
دیکھیں ہیں جسے کہتا ہے کیا دیکھے ہے بڈھے
بیٹھیں ہیں تو ہو دھوم کہاں بیٹھے ہیں بڈھے
آویں ہیں تو یہ غل کہ کہاں آوے ہے بڈھے

سب چیز کو ہوتا ہے برا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

پنگھٹ کو ہماری اگر اسواری گئی ہے
تو واں بھی لگی ساتھ یہی خواری گئی ہے
سنتے ہیں کہ کہتی ہوئی پنہاری گئی ہے
لو دیکھو بڑھاپے میں بھی مت ماری گئی ہے

سب چیز کو ہوتا ہے برا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

پگڑی ہو اگر لال گلابی تو یہ آفت
کہتا ہے ہر اک دیکھ کے کیا خوب ہے رنگت
ٹھٹھے سے کوئی کہتا ہے کر شکل پہ رحمت
لاحول ولا دیکھئے بوڑھے کی حماقت

سب چیز کو ہوتا ہے برا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

نقلیں کوئی ان پوپلے ہونٹوں کی بناوے
چل کر کوئی کبڑے کی طرح قد کو جھکاوے
داڑھی کے کئے انگلی کو لا لا کے نچاوے
یہ خواری تو اللہ کسی کو نہ دکھاوے
سب چیز کو ہوتا ہے برا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

گر حرص میں داڑھی کو خضاب اپنی لگاویں
جھری جو پڑی منہ پہ اسے کیسے مٹاویں
گو مکر سے ہنسنے کے تئیں دانت بندھاویں
گردن تو پڑی ہلتی ہے کیا خاک چھپاویں
سب چیز کو ہوتا ہے برا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

یہ ہونٹ جو اب پوپلے یارو ہیں ہمارے
ان ہونٹوں نے بوسوں کے بہت رنگ ہیں مارے
ہوتے تھے جوانی میں تو پریوں کے گزارے
اور اب تو چڑیل آن کے اک لات نہ مارے
سب چیز کو ہوتا ہے برا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

تھے جیسے جوانی میں پیے جام سبو کے
ویسے ہی بڑھاپے میں پیے گھونٹ لہو کے
جب آ کے گلے ملتے تھے محبوب بھبھو کے
اب کہیے تو بڑھیا بھی کوئی منہ پہ نہ تھوکے
سب چیز کو ہوتا ہے برا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

کرتے تھے جوانی میں تو سب آپ سے آ چاہ
اور حسن دکھاتے تھے وہ سب آن کے دلخواہ
یہ قہر بڑھاپے نے کیا آہ نظیر آہ
اب کوئی نہیں پوچھتا اللہ ہی اللہ
سب چیز کو ہوتا ہے برا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

نظیر اکبرآبادی

بڑھاپے میں بلا لگنے لگی ہے
جوانی میں حسیں جو تھی بلا کی

سرفراز شاہد

قصور میرا نہیں ہے، حسینوں کا ہے ظفر
وہ کیوں حسین مجھے لگتے ہیں بڑھاپے میں

نوید ظفر کیانی

بڑھیا

جب پیٹ ملائی سا وہ دیتا تھا دکھائی
کھانے کو چلی آتی تھی مصری و ملائی
اور آ کے بڑھاپے کی ہوئی جب کہ چڑھائی
سب اڑ گئی کافر وہ ملائی و مٹھائی
اس غم سے نہ کچھ پیتی نہ کچھ کھاتی ہے بڑھیا
یہ درد وہی جانے جو ہو جاتی ہے بڑھیا

جب منہ میں نہ ہوں دانت تو مسی ملے کیا خاک
اور سر کے جھڑے بال تو کنگھی کرے کیا خاک
پلکوں میں سفیدی ہو تو کاجل لگے کیا خاک
جب ناک ہی سوکھی ہو تو پھر نتھ کھلے کیا خاک
اس خواری خرابی میں پھر آجاتی ہے بڑھیا
یہ درد وہی جانے جو ہوجاتی ہے بڑھیا

نظیر اکبرآبادی

بڑھاپے میں اولاد

عشق کامیاب ہوجائے تو شادی کی منزل شادمانی و کامرانی کے ساتھ دولہا میاں کے قدم چومتی ہے۔اور اس کے بعد قدرت فیاضی سے کام لے تو مولود کی کلکاریوں سے گھر کی فضا گونجنے لگتی ہے

ہوا ہے دشمنوں کی بددعاؤں میں اثر پیدا
بجھی ہے آگ لیکن ہوگیا کیوں کر شرر پیدا
مٹھائی بانٹتے پھرتے ہیں وہ سارے محلے میں
بڑھاپے میں ہوا ہے ان کی گھر لختِ جگر پیدا

نظر برنی

کچھ جوانی میں اُن سے ہو نہ سکا
گل کھلانے لگے بڑھاپے میں

ساجد کلیم ساجد

بڑھاپا اور بیماریاں

ترقی یافتہ ممالک میں اچھی طبی سہولیات کے سبب بوڑھوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہورہا ہے۔عمر میں اضافے کے باعث بیماریوں کی کثرت اور شدت میں بھی اضافہ دیکھنے میں آرہا ہے۔چھوٹی موٹی بیماریاں تو کچھ نہیں کہتیں مگر بڑھاپے کی آمد کی نشاندھی ضرور کردیتی ہیں اور مریض روزمرہ کے معمولات میں بھی بڑھتی ہوئی عمر کے تقاضوں کو مدنظر رکھتا ہے

وہ بیت گئے دن جب آزاد و دل وجاں تھے
اب دل کی خبر مظہرؔ تم شام و سحر رکھنا
ہے دردِ محبت سے اب دردِ کمر بڑھ کر
سامانِ سفر میں بس اک پین کلر رکھنا

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

عہد پیری میں لاکھ بیماری
ختم سرکاری ناز برداری
ڈاکٹر کے علاج مہنگے ہیں
ڈھونڈتے ہیں حکیم پنشن یاب

شیخ نذیر احمد

بڑھاپے میں جوانی کی تمنا

ساٹھ کے پھیر میں بھی شاہ جہانی مانگے
دل بھی کیا شے ہے بڑھاپے میں جوانی مانگے

امیر الاسلام ہاشمی

تو مجھے ایسا کوئی کشتہ کھلا دے سائیں
جو بڑھاپے میں جواں مجھ کو بنا دے سائیں

نیاز سواتی

ملا ہے نسخہ جوانی پلٹ کا جب سے مجھے
تمام شہر کے بڈھے مری تلاش میں ہیں

پاگل عادل آبادی

اب بڑھاپے میں ہم سے کیا ہوگا
کاش کر لیتے کچھ جوانی میں

چونچال سیالکوٹی

اپنی قیمت ہے اس بڑھاپے میں
سو کے پچاس یہ بھی خوب رہی

چونچال سیالکوٹی

یوں تو کہنے کو بخشش کی خاطر ہی بوڑھے
روز و شب گڑگڑا کر دعا مانگتے ہیں
ہاں مگر جب حسینوں کو یہ دیکھتے ہیں
تو جوانی کی اکثر دعا مانگتے ہیں

نوید ظفر کیانی

سرجری کے بعد بڑھیا بن کے آئی نوجواں
کہہ رہی تھی عمرِ رفتہ کو پکڑنا چاہیے

منزہ سیّد

اگر حفیظؔ جالندھری بڑھاپے میں نظم لکھ کر اور ملکہ پکھراج اسی عمر مبارک میں یہ گاتی ہوئی نظر آسکتی ہیں کہ ''ابھی تو میں جوان ہوں'' تو پھر ہم کون ہوتے ہیں کہ اعتراض کریں کہ ڈاکٹر کہتے ہیں کوئی شخص کتنا ہی بوڑھا اور عمر رسیدہ دکھائی دے اپنے ذہن میں خود کو پچیس سال سے بڑا نہیں سمجھتا کہ بظاہر جسم ضعیف ہوجاتا ہے مگر دماغ اتنا ہی جوان رہتا ہے۔ اس لیے اکثر بزرگ یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں

شکستہ عمر میں بھی ہم نہایت چلتا پرزہ ہیں
کوئی یہ کہہ نہیں سکتا کہ ہم بیمار ٹائپ ہیں

امیر الاسلام ہاشمی

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی اسلام آباد سے تعلق رکھتے ہیں۔ طبی حوالے سے مزاحیہ شاعری انہیں کی اختراع ہے۔ ان کے طنز ومزاح پر مبنی نصف درجن سے زیادہ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ طنز و مزاح نگاری کے ساتھ ساتھ نہایت شستہ و شگفتہ شاعری کے مرتکب بھی ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ ''ارمغانِ ابتسام'' کے اوّلین کرمفرماؤں میں شامل ہیں۔

ولائتی زعفران

ہائے سارہ فرگوسن

سوتا ڈونسینڈ انوید ظفر کیانی

۱۷ ؍ جولائی یہ بکواس سن کر تو میرے کان پک گئے ہیں کہ پرنس اینڈریو بہت خوش شکل ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تو جانے مجھے کیوں پورا پورا یقین ہو چلا ہے کہ یہ وہی ذات شریف ہیں جن کے ذمے ہمارے کالج کی دیواروں کی مرمت اور سفیدی کرنے کا کام ہے شاید اس کی وجہ اینڈریو کی گردن ہے جو خود بھی اینٹوں سے بھرے ہوئے کسی ٹوکرے سے کم نہیں۔ ویسے احتیاط اچھی چیز ہے، چھٹیوں کے بعد کالج کھلے تو میں اپنے کالج جا کر ضرور تصدیق کروں گا ۔کیا خبر یہ وہی ہو، ہماری سادہ لوح ملکہ کو بیوقوف بنانا کون سا مشکل کام ہے اسے مدتوں پہلے ہمارا آئین بیوقوف بنا چکا ہے، یہ تو پھر ایک جیتے جاگتے مستری کی بات ہے۔

یار لوگ پرنس اینڈریو کے سفید دانتوں کو بڑے رشک سے دیکھتے ہیں۔ شاید انہوں نے ڈریکولا کی فلم نہیں دیکھی ہے۔ جب میں یہ سوچتا ہوں کہ یہ دانت سارہ فرگوسن کی نہتی گردن میں پیوست ہونے والے ہیں تو ایک بے ساختہ سی جھرجھری لے کر رہ جاتا ہوں۔ جانے فرگوسن کو اس جوکر میں کیا نظر آیا ہے۔ ہوشمند قسم کی لڑکیاں عموماً ایسے جیون ساتھی کا انتخاب کرتی ہیں جو مہذب ہو، مہم جو ہو، ہیلی کاپٹر وغیرہ اُڑانا جانتا ہو اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے ذاتی بینک بیلنس کے معاملے میں بھی قدرے خوش قسمت ہو۔ یہ نہیں کہ دوسروں کے ٹکڑوں پہ پل رہا ہو۔ اگر اس تناظر میں دیکھا جائے تو فرگی نے بڑے گھاٹے کا سودا کیا ہے، پرنس اینڈریو اس کے ساتھ قطعاً اچھا نہیں لگتا۔ بات دراصل یہ ہے کہ سارہ فرگوسن پیدا ہی اس لئے ہوئی ہے کہ جوان ہو کر ایڈرائن مول کی بیوی بنے۔ میں نے اسے متعدد خطوط میں یہی بات باور کرانے کی کوشش کی ہے اور چاہا ہے کہ وہ ۲۳؍ جولائی سے پہلے پہلے ہوش میں آجائے اور تقدیر کے فیصلے کو تسلیم کر لے، تاہم تا دم تحریر اس نے مجھے کوئی جواب نہیں دیا۔ غالباً وہ پرنس اینڈریو سے متعلق اپنے فیصلے پہ پچھتا رہی ہوگی۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس کے لئے فوری طور پر کسی فیصلے پر پہنچنا بھی مشکل ہوگا۔ ایک طرف پرنس اینڈریو ہے، اس کا سماجی گلیمر ہے اور دولت ہے جبکہ دوسری طرف یہ بندۂ حقیر یعنی ایڈرائن مول ہے، افلاس ہے اور اس کی شاعری۔ بظاہر فیصلہ واقعی بہت دشوار ہے۔

مری جان سارہ، مری جان سارہ
مرے لب پہ رہتا ہے نام اک تمہارا

تم اینڈی سے شادی رچانے چلی ہو
اری ظلم کیا یہ کمانے چلی ہو
چلی آؤ لینکاسٹر مری جانب
کہ آتی ہے یہ رہگزر میری جانب
محلات کی رنگین دنیا کو چھوڑو
نکل کر وہاں سے کوئی ٹیکسی پکڑو
میں ایم۔ آئی میں منتظر ہوں تمہارا
مری جان سارہ، مری جان سارہ

۱۸/جولائی

سارہ فرگوسن کی طرف سے آج کوئی جواب نہیں آیا۔

میں نے بکنگھم پیلس فون کھڑکایا لیکن ملکہ نے بھی ملازمین کے نام پہ کیا کیا چیزیں اکٹھی کر رکھی ہیں۔ ایک گدھے نے جو خود کو ریسپشنسٹ کہتا تھا، مجھے سارہ سے بات نہیں کرنے دی۔ وہ کہنے لگا "سارہ فرگوسن کسی اجنبی سے بات کرنا پسند نہیں کرتی ہیں۔" میں نے اس کی جہالت اور کم علمی پر ماتم کرتے ہوئے کہا "ارے یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟ میں سارہ فرگوسن کے لئے یا وہ میرے لئے اجنبی نہیں ہیں۔ وہ تو میری جنم جنم کی ساتھی ہے میری روح ہے۔" میں پورے وثوق سے تو نہیں کہہ سکتا کہ جواباً اس نے بڑبڑاتے ہوئے کیا کہا تھا لیکن اتنا یقین ہے کہ اس قسم کا مظاہرہ اگر اس نے ہٹلر کے سامنے کیا ہوتا تو وہ اس کی کھال کے جوتے بنا کر افغان مہاجرین میں تقسیم کر دیتا۔ ویسے میں بھی ہٹلر سے کوئی کم نہیں ہوں، فون پر تو اس شاہی چمچے کا کچھ نہ بگاڑ سکا لیکن ٹیلی فون کا ریسیور اس زور سے دیوار سے مارا کہ اس کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ آخر وہ بھی کہاں جائے گا کسی دن بکنگھم پیلس کے باہر پکڑا گیا تو ایسی چپیٹیں لگاؤں گا کہ نانی یاد آ جائے گی بچہ جی کو۔ میں نے اسی لمحے انتہائی اضطراب کے عالم میں ٹھیک صبح گیارہ بجے اپنی عزیز از جان محبوبہ سارہ کو حسب ذیل ٹیلی گرام بھیجا۔

فرگی! میں تم سے ملنے کے لئے آ رہا ہوں مجھ سے کل دو پہر دو بجے محل کے گیٹ پر ملو۔

فقط تمہارا اور صرف تمہارا

ایڈ رائن مول (عمر ۳۲-۱۳ صرف)

نوٹ:۔ میں نے دھوپ والی عینک پہن رکھی ہوگی۔ ہاتھوں میں سفری بیگ ہوگا۔

۱۹/جولائی

بکنگھم پیلس۔ دو بجے دوپہر۔

وہ نہیں آئی میں نے وہاں پر مٹر گشت کرتے ہوئے محافظ کو روک کر پوچھا کہ سارہ محل میں موجود بھی ہے یا نہیں؟ جواب حوصلہ افزا تھا۔ اس نے بتایا کہ سارہ اندر ہی ہے اور ملکہ اُسے شاہی آداب پڑھا رہی ہے۔ گویا صیاد نے معصوم کو پابندِ رسن کر رکھا ہے۔ میں نے اس محافظ سے درخواست کی کہ وہ میرا پیغام سارہ تک پہنچا دے لیکن اب اُس کی توجہ اس جاپانی سیاح پر مرکوز ہو چکی تھی جو بڑے پر جوش انداز میں اس کے اعلیٰ نسل کے گھوڑے کی پیمائش کرنے میں مشغول تھا۔ اُس کے چہرے پہ کاروباری مسکراہٹ کی مکروہ چمک دوڑ رہی تھی۔ اب یہ جاپانی جب اپنے ملک کو لوٹ کر جائے گا تو پہلی فرصت اِسی پروجیکٹ میں لگا دے گا اور اس قسم کے گھوڑوں کی نقلیں بنا بنا کر زمانے بھر کو ارزاں نرخوں پہ فراہم کرنا شروع کر دے گا۔ جانے ہم انگریزوں کو کب عقل آئے۔

گھر واپسی کے لئے میں نے ایک ٹرام پکڑی۔ میرے ڈیپارٹمنٹ میں ایک انتہائی موٹی عورت نے ایک سادہ لوح منگولی کو پھانس رکھا تھا۔ اس کی زبان ٹرام کے برخلاف قطعاً نان سٹاپ تھی۔ وہ شاہی عقد کے دن سے متعلق منصوبوں کے بارے میں بتا رہی تھی اور بلا تکان بولے جا رہی تھی۔ میرا جی چاہا کہ میں کسی ایٹم بم کی طرح پھٹ پڑوں اور چیخ چیخ کے بتاؤں کہ موٹی بھینس! تم اپنی زبان کو لگام دو! تم اپنے دیدوں کو پھاڑ بھی ڈالوگی، تب بھی تمہیں ۲۳/جولائی کے روز دنیا کی ہر سکرین خالی ملے گی کیونکہ اس دن کوئی شادی وادی نہیں ہو رہی ہے، چنانچہ بہتر یہی ہے کہ تم اُن تمام چیزوں کے آرڈر منسوخ کر دو جن کے آرڈر تم نے اس دن کی خوشی کے بہانے اپنی تربوز نما توند کی پرورش کے لئے دے رکھے ہیں۔ اب تم اس دن بھینس سے ہتھنی بننے کا پروگرام کینسل کر دو۔"

میں یہ نعرۂ حق بآواز بلند کرنا چاہتا تھا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ دنیا احمق اور گنوار لوگوں سے بھری پڑی ہے۔ وہاں موجود لوگ سوچتے بھی تو فقط یہی کہ کوئی کم ظرف اور کمزور اعصاب کا مالک شخص ہے، جس سے نوجوانی کی مونہہ زور گھوڑی قابو نہیں ہو رہی ہے۔ دوسرے ہزار ہا جوانوں کی طرح فرگوسن فوبیا میں مبتلا ہوگیا ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ لوگ اس انداز سے سوچیں۔ ظاہر ہے کہ معاملہ اتنا بھی یک طرفہ نہیں ہے۔ اس بات کا گواہ یا تو میں ہوں یا پھر میرا خدا۔۔۔۔۔ بلکہ سارہ فرگوسن بھی تو ہے۔

۲۰ رجولائی سارہ نے ابھی تک میرے خطوط کا جواب نہیں دیا ہے، یقیناً اُس کے پاس ڈاک ٹکٹ نہ رہے ہوں گے۔

۲۱ رجولائی میں نے ڈاکیے کو بلا کے پوچھا کہ ''میرے نام بکنگھم پیلس سے خط پتر نام کی کوئی چیز تو نہیں آئی ؟ ''اس نے دانت نکالتے ہوئے کہا''اوہ! تو گویا ٹیڈی کی طرح آپ کو بھی شاہی مہمان کی طرح مدعو کیا جا رہا ہے۔ اگر ایسا ہے تو پیشگی مبارک باد قبول کیجئے، امید ہے کہ آپ اس موقع پر ناچیز کو فراموش نہیں کریں گے اور ملکہ کو میرا خصوصی سلام ضرور پہنچائیں گے۔ میرا نام تو آپ جانتے ہیں۔۔ میں۔۔۔''

اب آپ ہی دل پہ ہاتھ رکھ کر کہئے کہ جب ہمارے سرکاری ملازمین کی دلچسپیوں کا مرکز اُن کی پیشہ ورانہ زندگی سے اس قدر مختلف ہوگا تو انگلستان کا بیڑہ غرق ہونے سے کون روک سکتا ہے۔

سات بجے شام

آج لینن گراڈ سے میری عم زاد پینڈورہ نے فون کیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اس کے روسی ڈپلومے کا کیا حال ہے، وہ بولی''تم یقین نہیں کرو گے لیکن یہاں پڑھتے ہوئے مجھے جتنا مزہ آ رہا ہے، بھلا وہ لندن کے بوڑھے اور بوسیدہ ماحول میں کہاں ہے۔ پتہ ہے کل کیا ہوا، مجھے ایک انتہائی اہم مباحثے میں شرکت کا موقع ملا۔''

میں نے تحیر سے پوچھا''گویا تم نے وہاں جا کر بھی باتیں کرنے کی عادت نہیں چھوڑی، کون سا انعام ملا؟''

وہ بولی''ارے نہیں بابا! یہ مباحثہ کوئی کالج میں نہیں ہو رہا تھا بلکہ ایک کھیت میں ہو رہا تھا۔ ہم لوگ کدوؤں کی کیاری کے پاس کھڑے ہوئے تھے۔ وہاں پر موجود کسان اور انٹلیکچوئل چیری کی محرابی وضع قطع کی انسانی نفسیات میں اہمیت پر گفتگو کر رہے تھے۔ میں نے انتہائی شستہ روسی زبان میں نکتہ اٹھایا کہ چیری تو مادر روسی کی آزادی کا آئینہ دار ہے۔ چیخوف کی بہت سے تحریریں اس امر کا بین ثبوت ہیں۔''

میں نے پوچھا''کدوؤں کی کیاری کے پاس کھڑے ہوئے دانشوروں کا ردعمل کیا تھا؟''

وہ بولی''ارے اُن کی بھی بھلی کہی! وہ تو نرے گدھے نکلے! پہلے تو ہونقوں کی طرح میرا منہ دیکھنے لگے اور پھر آرمینی زبان میں ایک دوسرے سے ٹھٹھے بازیاں کرنے لگے۔ ٹھیک کہا ہے ہمارے چرچل بابا نے!! روسیوں میں ہم انگریزوں کے خلاف تعصب کوٹ کوٹ کے بھرا ہوا ہے۔۔۔!''

لائن وقت ختم ہونے پر مدھم پڑنے لگی تھی چنانچہ پینڈورہ کی زبان میں بھی تیزی آگئی اور وہ جلدی جلدی سے کہنے لگی ''۔۔۔اور ہاں ایڈرائن! شاہی جوڑے کی شادی کی ویڈیو بھیجنا مت بھولنا!

اس سے پہلے کہ جواباً میں اپنے دل کا کوئی پھپھولا پھوڑتا ،لائن خاموش ہوگئی رابطہ منقطع ہو چکا تھا۔

۲۲ رجولائی آج سارہ کی تصویر پر نظر پڑی۔ اخبار نے اُسے پہلے صفحہ پر نمایاں طور پر شائع کیا تھا۔ اس نے انتہائی دل روز لباس پہن رکھا تھا۔ خصوصاً لبادے کے بالائی حصے نے تو دل بہت دکھایا۔ اس معصوم فطرت لڑکی نے خاصی ''چاک گریبان'' قسم کی فراک پہنی ہوئی تھی۔ پہلوئے حور میں وہ لنگور یعنی ایںڈریو بھی موجود تھا اور اس قدر گستاخانہ زاویے سے اس کے کندھے پر جھکا ہوا تھا کہ۔۔۔ میرا تو خون کھول اٹھا۔ جب سارہ میری بیوی بن جائے گی تو میں اسے بصد اصرار ایسے کپڑے پہنایا کروں گا جس کی فراک کا گریبان

پوری گردن کو اپنی تحویل میں لئے رکھے۔میں اس معاملے میں مسلمانوں کے ساتھ ہوں۔

کوئی خط نہیں آیا۔ پتہ نہیں کیا بات ہے۔اب تو امیدیں بھی کنی کترا جاتی ہیں۔کل شادی کا دن ہے۔ شہر میں ہر طرف دیوہیکل سکرین لگا دیے گئے ہیں تاکہ شاہی شادی کی تقریبات براہِ راست دکھائی جاسکیں۔۔۔لیکن نہیں !میں تو ہرگز ہرگز نہیں دیکھوں گا۔اپنی تنہائیوں کے گلے میں بانہیں ڈال کر دور کسی ویرانے میں نکل جاؤں گا اور بے مقصد آوارہ گردی کروں گا۔اُف خدایا!ہائے سارہ!

سارہ!سارہ!میری جان!

۲۳ر جولائی میں آج صبح اپنے تکیے سے گلے لگ کر اتنا رویا ،اتنا رویا کہ اگر آنسوؤں کو تکیہ جذب نہ کرلیتا تو لندن ایک اور ٹیمز کا مالک بن جاتا۔

بارش کے بعد جب شہر کا موسم نکھر گیا یعنی رونے سے جی کچھ ہلکا ہوا تو میں آہستہ آہستہ اٹھا۔سیاہ ماتمی لباس پہنا اور ناشتے کے لئے کچن میں جا گھسا۔ناشتہ کیا تھا، چند ڈبل روٹی کے ٹکڑے، مکھن جیم،دو ابلے ہوئے انڈے،ایک چائے کا کپ اور بس! مجبوراً زہر مار کیا۔ممی نے مجھے دیکھا تو سگریٹ کا دھواں مجھ پر چھوڑتے ہوئے پوچھا ''کیوں ابّی تمہارے چہرے کو کیا ہوا؟''

میں نے آہستگی لیکن پروقار انداز میں کہا''مما!آج میں اداسی اور مایوسی کی ڈیتھر بے پر کھڑا ہوں۔''

''اوہ تو گویا تمہاری نئی گرل فرینڈ ماریہ بھی تمھیں داغِ مفارقت دے گئی ہے۔۔۔کیوں؟ یہی بات ہے ناں؟''انہوں نے کھانستے ہوئے کہا۔

ممی سے بحث فضول تھی میں خاموشی سے کچن سے نکل آیا۔ میرا سرماتمی انداز میں اِدھر اُدھر ہو رہا تھا۔دراصل مجھے اپنی ممی کی فراست اور اپنی قسمت دونوں پر بیک وقت ترس آ رہا تھا۔میں نے

اور یہ فقرہ جو ہم نے ابھی ابھی لکھا ہے کہ گندے نالے کو بھی صفائی کا موقع ملنا چاہیے تو یہ غیر ارادی طور پر لکھا گیا ہے کیونکہ ہمارے ہاں گندے نالے کو صفائی کا موقع ہی کہاں ملتا ہے ہمارے ہاں نہ گندے نالے کی صفائی ہوتی ہے اور نہ ''گندے نالے'' کو صفائی کا موقع دیا جاتا ہے۔ جسے ایک دفعہ ''گندہ نالہ'' قرار دے دیا گیا اس کے بعد اس کے مقدر میں غلاظتیں ہی غلاظتیں ہیں جو روزانہ ٹوکریاں بھر بھر کر اس پر پھینکی جاتی ہیں۔مزید ستم یہ کہ اسے صفائی کا موقع بھی نہیں دیا جاتا' جس کے نتیجہ میں اس کا پانی کناروں سے باہر بہنا شروع ہو جاتا ہے یا ''ڈکا'' لگ جاتا ہے۔ان ہر دو صورتوں میں اس درجہ تعفن پھیلتا ہے کہ بو سے لوگوں کے دماغ پھٹنے لگتے ہیں۔گندے نالے کے حوالے سے ایک لطیفہ ہم نے حال میں ہی سنا ہے اور وہ کچھ یوں ہے کہ

ایک سردار جی دفتر جانے لگے تو انہیں خیال آیا کہ ان کا نالہ (ازار بند) گندہ ہے انہوں نے سردارنی سے کہا کہ یہ نالہ بدل دو' سردارنی نے جواب دیا کہ اس وقت آپ کو دفتر سے دیر ہو رہی ہے فی الحال آپ جائیں واپسی پر بدل دوں گی۔

سردار جی دفتر سے عموماً تین چار بجے واپس گھر آ جایا کرتے تھے مگر اس روز وہ شام کو چھ سات بجے گھر پہنچے اور کیفیت یہ کہ سانس پھولی ہوئی' ماتھے پر پسینہ اور لہجے میں تھکاوٹ! سردارنی نے پریشان ہو کر پوچھا کہ سردار جی خیر تو ہے؟ اس پر سردار جی نے غصے سے کہا''تم نے آج ذلیل کروا دیا' میں آج دفتر سے واپسی پر گھر آنے کے لیے بس میں بیٹھا تھا بس ابھی تھوڑی دور ہی گئی تھی کہ کنڈکٹر نے میرے قریب گزرتے ہوئے آواز لگائی' گندے نالے والے یہاں اتر جائیں' میں کان لپیٹ کر وہیں اتر گیا' اور اب 4 میل سے پیدل آ رہا ہوں''

آپ بھی شرمسار ہو از عطاء الحق قاسمی

بڑبڑاتے ہوئے کہا" یارب! رحم کر۔۔۔مجھ پر اور دنیا والوں پر کہ یہ نہیں جانتے کہ کس کے ساتھ کیا کر رہے ہیں۔"

میری یہ بڑبڑاہٹ ڈیڈی کے کانوں میں بھی پڑ گئی۔ وہ سمجھے کہ میں بائبل کا کوئی اقتباس دہرا رہا ہوں۔ افسوس اور حیرانی کے ملے جلے تاثرات میں بولے" خدایا! کہیں اس بدنصیب پر کسی فادر کا آسیب تو نہیں پڑ گیا ہے؟"

گلی کی نکڑ پر میرا سامنا دادی اماں سے ہوا۔ وہ ہمارے گھر کی طرف ہی آ رہی تھیں۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں میں ایک ٹرے اٹھا رکھی تھی جس پر ایک بہت خوبصورت کیک دھرا ہوا تھا۔ اس کیک پر چاکلیٹ کریم سے "ایف۔اے" کے الفاظ تحریر تھے۔ میں سوچنے لگا کہ یہ ایف۔اے کن الفاظ کا مخفف ہے؟

دادی جان نے اپنا سب سے قیمتی لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ ان کے ہیٹ پر کسی بہت بڑے اور انتہائی خوبصورت پرندے کا پر لگا ہوا تھا۔ ہاتھوں پر خلافِ معمول گلابی رنگ کے دستانے تھے۔ مجھے دیکھا تو چلائیں۔۔۔" ہائے ایڈرائن! میری جان! کدھر جا رہے ہو؟ اپنی دادی اماں کو کس نہیں دو گے؟"

میں نے اُن کے بوڑھے اور پرشکن رخساروں پر بڑی عقیدت سے بوسہ ثبت کیا۔ شکر ہے کہ اُن کی قریب کی نظر کچھ اتنی اچھی نہیں تھی ورنہ وہ میری آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک ضرور دیکھ لیتیں۔ انہوں نے جاتے ہوئے کہا" تمہیں بھی شاہی جوڑے کی شادی مبارک ہو!"

دل سے ایک ہوک اٹھی اور حلق میں جا کے اٹک گئی۔ اب مجھے یاد آ گیا کہ ایف۔اے سے مراد تو یقینی طور پر" فرگوسن اینڈریو" ہو گا۔

راستے میں میں نے ایک دوکان سے کچھ چیزیں خریدیں۔ یہی کچھ پھول سارہ اور اینڈریو کی چہرہ کشی پر مبنی ایک مگ اور ایک عدد کالا مارکر۔۔۔ پہلا کام تو میں نے یہ کیا کہ اُس کالے مارکر کو نہایت صفائی سے اینڈریو کے منحوس بوتھے پر پھیر کر اسے اُس کے اندر کا رنگ عطا کیا۔ پھر میں چلتا ہوا شہر کے مضافات میں آ گیا اور ایک نہر کے کنارے بیٹھ گیا۔ مگ میں چند پھول نکال کر ڈالے اور سارہ کو آخری خط لکھنے لگا جو کچھ یوں تھا۔

میرے خوابوں کی شہزادی سارہ!

مجھے پورا یقین ہے کہ تم بہت جلد اپنی شادی شدہ زندگی سے بیزار ہو جاؤ گی۔ مجھ سے پوچھو تو تم نے اینڈریو جیسے چھچھورے شخص سے شادی کر کے اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔ جب تم اس سے اُکتا جاؤ تو یہ بات مت بھولنا کہ لینز کا سٹر میں کوئی تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ میں یہ وعدہ تو نہیں کرتا کہ تمہیں بکنگھم پیلس جیسے ٹھاٹھ باٹھ دے سکوں گا۔ (اگرچہ میرے بینک بیلنس میں اب بھی ایک سو اکتالیس پونڈ اور پچیس پینٹ موجود ہیں) لیکن میں اس بات کی ضمانت ضرور دے سکتا ہوں کہ تمہیں انتہائی ادبی ماحول فراہم کروں گا۔ ہم نئے عصری رجحانات پر بلاتکان گفتگو کریں گے اور جدید نظم کی ہیئت ترکیبی پر سیر حاصل بحث کیا کریں گے۔ اس کے علاوہ بونس کے طور پر میں اپنے آپ کو بھی تمہارے حوالے کر دوں گا۔ اگرچہ میں کوئی یوسفِ ثانی تو نہیں ہوں لیکن پھر بھی پرنس اینڈریو سے تو ہزار درجے بہتر ہوں۔

میں نہیں چاہتا کہ تم میرا خط پڑھنے میں اس قدر محو ہو جاؤ کہ تمہارا خاوند تم پر چیخنا چلانا شروع کر دے اور تمہاری زندگی میں تلخیاں گھل جائیں اس لئے خدا حافظ۔

فقط تمہارا اور صرف تمہارا

ایڈرائن مول (عمر ۳/۴ ۔۱۳ اصرف)

مشہور کالمسٹ، سکرین رائٹر، ناول نگار "سو ٹاؤن سینڈ" انگریزی کی مشہور طنز و مزاح نگار خاتون ہیں۔ ۲؍اپریل ۱۹۴۶ء کو لئی سیسٹر (انگلینڈ) میں پیدا ہوئیں۔ ایڈرائن مول کے کردار کی خالق ہیں اور یہی کردار اِن کی شہرت کا باعث ہوا۔ اِس کردار پر مبنی اُن کی کتب ۱۹۸۰ء کی دہائی میں انگلش کی سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتابیں ثابت ہوئیں۔ اس سلسلے میں اُن کی نو سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ انہیں بے شمار ادبی ایورڈ سے نوازا گیا۔ ۱۰؍اپریل ۲۰۱۴ء میں اُن کا انتقال ہوا۔

ایک شخص کا غیر شخصی خاکہ

ڈاکٹر محمد اشرف کمال

وہ بظاہر دیکھنے میں معمولی سا شخص دکھائی دیتا تھا مگر اس کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ ہمیشہ غیر معمولی لگے۔ اور یہ اُس کا معمول تھا کہ وہ کچھ کچھ لگنے اور دکھائی دینے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ اپنی اس ناکام کوشش کو کامیاب بنانے پر تُلا رہتا تھا۔ اس کے لمبے لمبے کان جو دور سے دیکھنے پر چھوٹے چھوٹے معلوم ہوتے تھے، حقیقت میں بڑے بڑے تھے اور یہ نزدیک آ کر پتہ چلتا تھا مگر قوتِ سماعت سے اتنے محروم کہ جیسے بھینس کے آگے بین بجائے تو وہ ٹس سے مس نہ ہو۔ اس کے کسی وقت بہت گھنے بال رہے ہوں گے مگر روغنِ گیسو دراز کے مستقل اور بے جا استعمال کے باوجود وقت کی دست برد اور تباہ کاریوں کی وجہ سے سر پر صرف رونگٹے باقی بچے تھے جنہیں وہ کھڑے کرنے کی ناکام کوشش میں لگا رہتا تھا۔ اس کے لیے اس نے باقاعدہ ایک کنگھی رکھی ہوئی تھی جو ایک بڑے کنگھے کو درمیان سے دو ٹکڑے کرکے ترتیب دی گئی تھی۔ اس کے خیال میں گھنے بال کبھی بھی باریک یا چھوٹے دندانوں والی کنگھی سے اچھی طرح سنور نہیں سکتے۔ اور یہ کنگھی اسی دور کی عادت تھی جب آتش جوان تھا۔ وہ عادت آج تک نہیں چھوٹی کیونکہ عادتیں تو سر کے ساتھ جاتی ہیں، بقول راجہ مہدی علی خاں۔

بہت خوبصورت بہت نیک تھا وہ
ہزاروں جوانوں میں بس ایک تھا وہ

اس کی ٹانگیں جسم کی طوالت کے مقابلے میں چھوٹی لگتی تھیں کہ چلتے ہوئے بھی چلتی محسوس نہ ہوں، وہ جہاں بیٹھ جاتا اٹھنے کا نام ہی نہ لیتا۔ زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد۔ وہ خود کو اہلِ نظر سمجھتا تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں چندھیائی ہوئی، جو اکثر چھوٹی چھوٹی چیزیں دیکھنے میں بھی ناکام رہتی تھیں۔ کئی بار بھنوؤں کو سکیڑتا اور کن اکھیوں سے دیکھتا۔ بقول اس کے: ''بند آنکھوں سے اسے منظر زیادہ واضح اور صاف دکھائی دیتا ہے۔''

''عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے''

اُس کی ناک اتنی اونچی کہ جیسے کسی بڑے بگڑے ہوئے خاندان کی میک اپ زدہ لڑکی نما عورت کی جو اپنی ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دے، وہ بھی کبھی ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دیتا بلکہ

سر ہلا ہلا کر اڑاتا رہتا۔ وہ اسی تناسب سے اگر کبھی کبوتر اڑاتا تو شاید آج ایک ماہر کبوتر باز ہوتا۔ کبوتر باز نہ سہی مگر کم سے کم چڑی مار ہونے سے اسے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔

اس کے ہاتھ اتنے بڑے تھے کہ دست درازی بھی شرما جائے۔ جتنے بڑے بڑے کام تھے وہ سمجھتا تھا کہ ان سب میں اس کا ہاتھ ہے۔ ویسے اس کی اپنی شخصیت کے بگاڑنے میں اس کا اپنا بڑا ہاتھ تھا۔ اور اس پر اسے فخر بھی بہت تھا۔

قد کے حوالے سے پست قامت ہونے کے باوجود وہ خود کو قد آور شخصیت سمجھتا تھا۔ اور ہر وقت اپنے گن گانے میں مصروف رہتا۔ وہ اپنے تئیں خود کو تیس چالیس مار خان سے کم نہیں سمجھتا تھا۔ بلکہ دو چار ہاتھ آگے ہی سمجھتا تھا۔

وہ کام یاب اتنا تھا کہ اب تک اسے بہت سے کام مل چکے تھے۔ ایک کے بعد دوسرا، دوسرے کے بعد تیسرا اور تیسرے کے بعد چوتھا۔۔۔۔ بس جم کر بیٹھنے کی عادت نہ تھی۔

نہایت ذمہ دار شخص تھا۔ ہمیشہ چھوٹے سے لے کر بڑے بڑے معاملات میں ہر بار وہی ذمہ دار ٹھہرایا جاتا تھا اور وہ اسے اپنی قابلیت سمجھتا تھا اور بڑے فخر کے ساتھ یہ غیر معمولی اور دل کو رنجور کر دینے والے واقعات گلوگیر لہجے میں سناتا رہتا تھا۔

سیاستدانوں کی طرح وعدے کا پکا تھا، کبھی موقع پر کسی کے کام نہ آیا۔ وہ مٹی کا پتلا قدیم شعری روایت کے معشوقوں سے لے کر جدید دور کے دوستوں کی طرح وفا کے حوالے سے نہایت پتلا تھا۔

پڑھائی لکھائی کا بہت شوق تھا ایک ایک کلاس کئی کئی بار پڑھی مگر اس مرد جری نے ہمیشہ عاشقانہ مزاج کی وجہ سے پاس ہونا اپنی شان کے خلاف سمجھا۔ بقول شاعر ؂

عاشقی کا ہو برا اس نے بگاڑے سارے کام
ہم تو اے بی میں رہے اغیار بی اے ہو گئے

اور اس میں کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ عاشقی نے بڑوں بڑوں کو رسوا کیا نکما کیا ؂

عشق نے غالبؔ نکما کر دیا
ورنہ یہ بھی آدمی تھے کام کے

(غالب سے معذرت کے ساتھ)

سارا دن گھر میں پڑے رہنے اور سوئے رہنے کی مصروفیات میں اسے ضائع کرنے کا زیادہ وقت نہیں ملتا تھا۔ قریبی یار دوست اسے کھری کھری سنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے تھے مگر وہ بقول غالبؔ "گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا" کے مصداق ڈھٹائی سے مسکراتا رہتا۔

ڈاکٹر محمد اشرف کمال صاحب کا تعلق بھکر سے ہے۔ درس و تدریس سے وابستہ ہیں۔ گورنمنٹ کالج بھکر میں "صدر شعبہ اُردو" ہیں۔ ان کی شخصیت خاصی ہمہ گیر ہے۔ یہ ادیب، نقاد، عالم، انشاء پرداز، سفرنامہ نگار اور شاعر ہیں۔ بے شمار علمی و ادبی کتابوں کے مصنف ہیں۔ بہت اچھے شاعر ہیں، کئی زبانوں میں شاعری کرتے ہیں۔ اندازِ تحریر خاصا شستہ اور شگفتہ ہے۔ "ارمغانِ ابتسام" سے ان کی قلمی وابستگی ادارے کے باعثِ صد افتخار ہے۔

ظریف جبلپوری

لائلپور کے مچھر

یہ لائل پور کے مچھر جو مل والوں نے پالے ہیں
بہادر، سورما، ساونت، تگڑے اور جیالے ہیں
منظم طور سے مہماں پہ شب خوں مارنے والے
یہ وہ ہیں جو نہیں کونین سے بھی ہارنے والے
فلٹ چھڑکے ہوئے کمروں میں بھی تن تن کے آتے ہیں
وہ سب مل کر خوشی میں فتح کے باجے بجاتے تھے
کبھی وہ چارپائی پر کبھی وہ فرش پر بیٹھے
دماغ اونچا ہوا اتنا کہ اُڑ کر عرش پر بیٹھے
کسی مچھر نے بڑھ کر حضرت مخمورؔ کو کاٹا
خمار اترا تو چھایا عالم ہستی میں سناٹا
کبھی راغبؔ سے رغبت کی کبھی ساحلؔ پہ آ بیٹھے
ثواب حج کی خاطر مولوی ماہرؔ پہ جا بیٹھے
کبھی آزادؔ کو چکھا کبھی احسانؔ کو چاٹا
ستم یہ ہے کہ مجھ سے صاحب ایمان کو کاٹا

میاں سید محمد جعفری کی غیر حالت تھی
جو منہ کھولا گھسے منہ میں لحاف اوڑھا تو شامت تھی
کہا اخترؔ سے پنڈتؔ جی ہمارا بھی بھجن سن لو
بہت ہی مختصر ہے قصۂ دار و رسن سن لو
بہت تنگ آ گئے جب مچھروں کی ڈنک ماری سے
تو سب شاعر تڑپ اٹھے نہایت بے قراری سے
کمیٹی کر کے آپس میں یہی اک بات طے پائی
جوابی حملہ ان پر ہو بصد صبر و شکیبائی
بہت ہشیار ہو کر ان سے لڑنے کی جو باری ہے
کہیں سب شاعروں اور مچھروں کی جنگ جاری ہے
کبھی تالی بجاتے تھے کبھی وہ سر کھجاتے تھے
وہ گھبراہٹ میں مل کر ایک ہی مصرعہ یہ گاتے تھے
ذرا سی جان کی چنگیز خانی دیکھتے جاؤ
اب اٹھا چاہتی ہے لاش فانیؔ دیکھتے جاؤ

مذہب اور گالیاں

فیض آباد دھرنے سے فیضیاب ہونے کے بعد

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

اے دھرنے والو آؤ ذرا پیٹو تالیاں
کانوں کو کھول کر سنو شیریں مقالیاں
ہوں مولوی پر آتی ہیں مجھ کو رذالیاں
لو ابتدا میں آج سنو سالے سالیاں
لے کر خدا کا نام میں دیتا ہوں گالیاں

ہیں یاد مجھ کو صاحبو سب گالیاں اصیل
اور ہے مغلظات کی فہرست بھی طویل
بکتا ہوں پہلے سنتا ہوں میں بعد میں دلیل
غصہ نکالنے کی کروں اور کیا سبیل
جب جوتیاں نہیں ہیں مری جیل والیاں

میں چاہتا ہوں پھیلے یہ آواز دور تک
اس زٹخرے کا بجتا رہے ساز چور تک
ہوں منکشف ہر ایک پہ یہ راز دور تک
سب سر دھنیں سنیں جو مرا وعظ" دور تک
خوش ہو کے لوگ ڈالیں یہاں سب دھمالیاں

الحمد کہ ہوا گالیاں دینے کے فن میں طاق
شائستگی وداع ہو تہذیب الفراق
کرتا ہوں صوفیوں کو میں اپنی طرف سے عاق
قصہ بنا ہے ماضی کا اب تو یہ تڑاق
دیتا ہوں گالیاں میں بہت ہی نرالیاں

جو کہہ رہے ہیں مولوی لیڈر ہے بے شعور
ان سے یہ پوچھیں آیا کہ مجمع ہے بے قصور
پی کر شراب جہل ہوا ہے نشے میں شور
کرتا ہے واہ واہ کہ جیتے رہیں حضور
اور گالیوں کو سن کے بجاتا ہے تالیاں

عید کا دن

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

نہ کھائیں اتنے بھی اب پیچ وتاب عید کے دن
کھِلا دے زوجہ نہ چپلی کباب عید کے دن

کٹھن تھا پہلے تو بکرے کو دام میں لانا
اور اب بنا ہے قصائی عذاب عید کے دن

کباب ، قورمہ ، بریانی ، سیخ اور تکے
ہمارے کھانے کا بدلا نصاب عید کے دن

چچا نہ کہہ دے کہیں ہم کو آج جانِ جہاں
لگایا ہم نے ہے سر پہ خضاب عید کے دن

سنگھار کر کے جو بیگم نے چہرہ دکھلایا
لگا کہ لوٹ کے آیا شباب عید کے دن

جواب مانگا تو "لا" لکھ کے اُس نے بھیج دیا
حسینہ کرگئی یوں لاجواب عید کے دن

بنا ہے گھر مرا باڑہ ، کہوں تو کس سے کہوں
کیا ہے بیل نے "خانہ خراب" عید کے دن

وہ چاند رات مناتے ہیں جاگ کر ساری
مزے سے ہوتے ہیں پھر محوِ خواب عید کے دن

چبا کے چانپ یہ کہتے تھے مولوی صاحب
ہے بکروں دنبوں کا یوم حساب عید کے دن

جو گوشت بھیجتے ہیں ساتھ روٹیاں بھی دیں
کہ ہو پھر ان کو بھی دگنا ثواب عید کے دن

جو شعر لکھتے ہوئے ہم کو دیکھا بیگم نے
تو بولیں چھوڑو قلم اور کتاب عید کے دن

مٹن کی شان

عرفان قادر

آج سوچا ہے کہ کچھ لکھوں مٹن کی شان میں
شاعری پہلے نہ تھی موجود اِس میدان میں
جب نہیں اُردو میں ہے اِس لفظ کا نعم البدل
کیوں نہ انگلش میں یا پنجابی میں ہی کی جائے گل
ہے مٹن کیا چیز، میرے دوست بتلائیں گے کیا؟
سوچ کر ڈھینچوں کا بھی کچھ لوگ شرمائیں گے کیا؟
ٹھیک ہے، خود ہی لُغت سے دیکھ لیتا ہوں جناب
ہاں تو، یہ وہ چیز ہے جس کے بناتے ہیں کباب
ٹیسٹی تکّہ بنے، دم پُخت، بریانی بنے
ہے غرض کھانے سے، دیسی ہو یا افغانی بنے
قورمے سے کتنے لوگوں کا ولیمہ ہو گیا
کوفتے کچھ کے بنے، باقی کا قیمہ ہو گیا
خواہ کشمیری ہو یا پختون بھائی یا بلوچ
ہے مٹن خوری میں ہر بندے کی بالکل ایک سوچ
رحم کر خود پر، نہ کھا پندرہ کلو ہرگز مٹن
''تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن''
اب تلک سمجھا کیے تھے ہم اسے مرغی کا گوشت
آج یہ جانا، مٹن ہے بھیڑ یا بکری کا گوشت
روشنی ڈالوں گا اِن دونوں پہ اب تفصیل سے
لے کے آنے دو مجھے الفاظ کچھ زنبیل سے
بات پہلے ہوگی بکری کی، کہ بکری ب سے ہے
قاعدے میں بعد میں ہے، بھیڑ چونکہ بھ سے ہے
ابتدا تعریف کی، کیوں سینگ سے یا دُم سے ہو
چاند چہرے کا تقابل جب مہ و انجم سے ہو
کون کہتا ہے کہ اُن کو صرف گائے تھی پسند
حضرتِ اقبال کرتے تھے بہت بکری پسند
بے ضرر ہیں بکریاں مارو انھیں ڈنڈے نہیں
ہاں، مگر کھائے بنا گزرے مرے سنڈے نہیں
اور اب کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں بھیڑ پر
دل سے نکلے ہیں، نہیں الفاظ اُگتے پیڑ پر
دیکھیے تو جانور کا ہے ہمیں کتنا خیال
بن چکی ہے چال ہی اِس قوم کی اب بھیڑ چال
کس قدر معصوم تھی، پر بن گئی گالی ہے بھیڑ
جو بہت بدنام بندہ ہے وہی کالی ہے بھیڑ
بھیڑ کا شیدائی آخر اور کیا کہلائے گا
بھیڑ خوری جو کرے گا بھیڑیا کہلائے گا
جرسیاں بنتی ہیں اچھی بھیڑ ہی کی اُون سے
زیبِ تن کر کے لگے کچھ لوگ نامعقول سے
بھیڑ کو بھی بھیڑ ہم پڑھتے رہے کتنے برس
سیڑھیاں یوں علم کی چڑھتے رہے کتنے برس
تذکرہ بکرے کا، اوہو! کس طرح مِس ہو گیا
اب نہ بھولوں گا تجھے ہرگز، پر اِمس ہو گیا
یاد بھی ہوتا اگر بکرا، تو تھیں لیڈیز فرسٹ
ہو نہیں سکتی کبھی کوئی نکمّی چیز فرسٹ
شیخ ہو، راجا ہو، بھٹی، چودھری ہو یا ہو جٹ
سب کو ہی بھاتے نہیں بکرے تری ''باہا'' کی رٹ
خوش نُما ہیں کس قدر، اے ظالما! خم دار سینگ
پیٹ پھٹ جائے جسے تُو مار دے دو چار سینگ
شوخ بکروں نے اگر رکھی ہے داڑھی فیشنی
بکریوں نے کیوں نہیں پہنی ہے ساڑھی فیشنی
تُم اگر شی گوٹ کے سرتاج ہو، ہی گوٹ ہو!
شوہرِ مسکین کی مانند کیا ''روبوٹ'' ہو؟
مختصر کرتا ہوں، لمبی بات کی عادت نہیں
شاعروں کی خامشی سے بڑھ کے کچھ نعمت نہیں
اب خدا حافظ، اے میرے قارئین و سامعین
دیر کتنی ہو گئی ہے، بج چکی ہے کافی تین

میں ایڈمن ہوں

ڈاکٹر عزیز فیصل

دوست دشمن ہوں خبردار، کہ میں ایڈمن ہوں
مت بنیں راہ کی دیوار کہ میں ایڈمن ہوں

جو مری پوسٹ پہ کر سکتا نہیں کوئی کمنٹ
وہ کہاں کا ہے مرا یار، کہ میں ایڈمن ہوں

آپ کے نامہ اعمال سے بھی واقف ہوں
اے مرے سادہ گنہ گار، کہ میں ایڈمن ہوں

سن لیں سب اپنے گنہ گارترین کانوں سے
موچی و درزی و لوہار کہ میں ایڈمن ہوں

حق تو یہ ہے کہ ہمیشہ مجھے سمجھا جائے
سر پہ لٹکی ہوئی تلوار کہ میں ایڈمن ہوں

عین انصاف یہی ہے کہ ہوں میں سب سے بڑا
آپ کی داد کا حقدار کہ میں ر ایڈمن ہوں

سب کا خادم ہوں اگرچہ میں بظاہر پھر بھی
سب مجھے مان لو سروار کہ میں ایڈمن ہوں

یہ مرے پاس جو اعزاز کی اک ریڑھی ہے
تم اسے پھر بھی کہو کار، کہ میں ایڈمن ہوں

کیا ہوا گر مری آواز میں سُر تال نہیں
تم مجھے کہہ دو گلوکار کہ میں ایڈمن ہوں

جانتا ہوں میں تری عشقیہ چیٹنگ کا سبب
سن ری گل خان کی گلنار، کہ میں ایڈمن ہوں

مرے غصے کو بتدریج بڑھا سکتی ہے
داد کی کم تری مقدار، کہ میں ایڈمن ہوں

مجھ سے فورم پہ کوئی شخص اگر بحث کرے
ٹھیک کہنا مجھے ہر بار کہ میں ایڈمن ہوں

انچ بھر آنا نہ آپے سے کبھی باہر تم
اے مرے حاشیہ بردار کہ میں ایڈمن ہوں

"فاختاؤں" کے رقیبوں کو رہے پیش نظر
مرا پستول ہے خودکار کہ میں ایڈمن ہوں

""مری پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے""
ہر کڑی سے ہے مجھے پیار کہ میں ایڈمن ہوں

کس کو ہیضہ ہوا اور کس کو ہوئی درد قولنج
کچھ نہیں مجھ کو سروکار کہ میں ایڈمن ہوں

مجھ کو حالات نے بالجبر بنا ڈالا ہے
صنف نازک کا طلبگار کہ میں ایڈمن ہوں

جو بھی ہدیے میں مجھے بھیجنا چاہے، بھیجے
ڈالر و درہم و دینار کہ میں ایڈمن ہوں

مارنے کے لئے شب خون کئی فورموں پر
خود کو رکھتا ہوں میں بیدار کہ میں ایڈمن ہوں

قوم سے زیادہ جسے نرم کہا جاتا ہے
ہے مری ذات وہ کہسار کہ میں ایڈمن ہوں

زود گو عہد سخن میں ہیں غنیمت فیصل
مختصر سے مرے اشعار کہ میں ایڈمن ہوں

جھوٹ

احمد علوی

ربڑی ملائی کھاتے ہیں سب ماہران جھوٹ
دھنوان میڈیا بھی ہوا جھوٹ بول کے

لو پندرہ پندرہ لاکھ سب کھاتوں میں آگئے
اب چل رہا ہے ملک مرا جھوٹ بول کے

سچوں کا قد گھٹا دیا ہے سر کو کاٹ کر
جھوٹوں کا قد مگر ہے بڑھا جھوٹ بول کے

سچے کسان نے تو یہاں زہر کھا لیا
مودی نے بینک لوٹ لیا جھوٹ بول کے

تھانہ وکیل جج پلس سب کچھ ہجوم ہے
قانون کو تبدیل کیا جھوٹ بول کے

جھوٹے اسی کو ووٹ کریں گے یقین تھا
جس نے ہر اک چناؤ لڑا جھوٹ بول کے

سارے گدھوں نے شیر اسے مان بھی لیا
جب سے بنا ہے شیر گدھا جھوٹ بول کے

سچوں کو دے رہا ہے سزا جھوٹ بول کے
اک شخص بن گیا ہے خدا جھوٹ بول کے

سچے تو چائے بیچ رہے ہیں گلی گلی
جھوٹوں نے ملک بیچ دیا جھوٹ بول کے

ہر سمت سرفرازی ہے جھوٹوں کی ملک میں
منشی وکیل جج ہے بنا جھوٹ بول کے

اُف یہ سپرداری

احمد علوی

ووٹ دے کر ساری طاقت ڈاکوؤں کو سونپ دی
لے کے چوروں سے حکومت ڈاکوؤں کو سونپ دی

جن کو کچھ آتا نہیں ہے ہندو مسلم کے سوا
ہم نے اس دنیا کی جنت ڈاکوؤں کو سونپ دی

نوٹ بندی اور جی ایس ٹی سے یہ ثابت ہوا
بے وقوفی کی وزارت ڈاکوؤں کو سونپ دی

قیمتیں ڈیزل کی یہ قابو میں کر سکتے نہیں
مفلسوں نے ساری؟ دولت ڈاکوؤں کو سونپ دی

خوف و دہشت ہر طرف ہے ہر طرف چیخ و پکار
ملک کی جب سے سیاست ڈاکوؤں کو سونپ دی

آ گئے سارے قلم داں ان پڑھوں کے ہاتھ میں
عقل مندوں نے ذہانت ڈاکوؤں کو سونپ دی

گھر سے جو بھاگے ہوئے ہیں بیوی بچے چھوڑ کر
ہم نے بچوں کی حفاظت ڈاکوؤں کو سونپ دی

کل جو دہشت گرد تھے اب ہیں محبانِ وطن
ایسا لگتا ہے وکالت ڈاکوؤں کو سونپ دی

یخ بستہ دسمبر پر
ایک رومانی نظم

پھر دسمبر ہے

اور

حسن والوں کے رومان چکر میں ہیں

مرکزِ آرزو

اب ستارے نہیں

مونگ پھلیاں بنیں

نوید ظفر کیانی

نحیف بکرا

نوید ظفر کیانی

ہم بھی لائے brief سا بکرا
کچھ نزار و نحیف سا بکرا
دیکھنے میں ضعیف سا بکرا
پر ہے خاصا ظریف سا بکرا

چاپ قدموں کی کب سناتا ہے
چوری چوری قریب آتا ہے
سینگ تشریف پر جماتا ہے
ہائے کیسا ہے thief سا بکرا

گھر میں فدوی کی کب ہے شنوائی
سب کی آنکھوں کا ہے ستارہ یہی
مجھ سے عزت زیادہ ہے اس کی
بن گیا ہے حریف سا بکرا

اس کو مُنا گلی میں لے جائے
تو یہ قابو میں اُس کے کب آئے
اور بکروں سے کشتی فرمائے
بھائی لوگوں کے چیف سا بکرا

اس کی "میں میں" نہ کوئی روک سکا
رات دن بس یہی ہے راگ اس کا
شور کرتا ہے بے طرح، بے جا
خاندانِ شریف سا بکرا

عیدِ قرباں کے آ رہے ہیں دن
اس کی جنت یقینی ہے لیکن
اپنے اعمال ہم نے دیکھے گن
ہم سے نکلا عفیف سا بکرا

یادِ جاناں کی ہے کسے فرصت
جی لبھاتی نہیں کوئی الفت
مرکزِ شاعری ہیں یہ حضرت
ہر غزل کی ردیف سا بکرا

اُف یہ سیاست

کیا شے ہے بی سیاست
اب اس کے میل میں بھی
آئے مزہ اچھوتا
جھوٹوں کے کھیل میں بھی

لگتی ہے بی سیاست
ایسے میں بھی قیامت
نخرے بلا کے دیکھے
اب اس چڑیل میں بھی

ہر رنگ کے ہیں لوٹے
ہر نسل کے ہیں ٹوٹے
کیسی دکاں سجی ہے
اکثر کی سیل میں بھی

کچھ ہیں جو رو رہے ہیں
باقی تو سو رہے ہیں
''ڈس کوالیفائی'' ہیں کچھ
اور کچھ ہیں جیل میں بھی

خوابوں میں کرسیاں ہیں
جس کے لئے ہر سو
بے شرمیاں عیاں ہیں
بے نقط بونگیاں ہیں
گویا چڑھے ہیں سارے
بے محل ریل میں بھی

ارسلان بلوچ ارسل

عہد

ڈاکٹر عارفہ صبح خان

ایک سال کے پہلے۔۔۔رات اڑھائی سے تین بجے کا وقت ہوگا۔ میں تکیے پر سر ٹکائے سو رہا تھا، جب اچانک فون کی وائبریشن سے مجھے اٹھنا پڑا۔

تکیے کے نیچے سے موبائل نکال کر دیکھا، تو اسکرین پر اُس کا نمبر نام سمیت جگمگا رہا تھا۔

بے شک وہ میری زندگی سے چلی گئی تھی، مگر اس کا نمبر آج بھی سیو تھا، بالکل اس کی یادوں کی طرح۔

اتنی رات کو اس کی کال دیکھ کر ایک دم سے نیند چھومنتر ہوگئی اور دل کی دھڑکن بھی جانے کیوں بڑھ سی گئی۔

بڑی مشکل سے خود کو سنبھال کر کال ریسیو کی اور بھرم رکھنے کو بہت غصے سے ''ہیلو'' کہا۔

دوسری طرف سے اُس کی سسکی ابھری اور رونے کی آواز آنے لگی، میرے وجود کو پگھلانے لگی۔

وہ جو غصے اور بے زاری کی تہ چڑھائی تھی، ایک منٹ میں کافور ہوگئی اور میں تقریباً ٹوٹے ہوئے لہجے میں بس اس کے نام سے اسے پکار ہی پایا اور میری منہ سے بس ''مہک'' نکلا۔ پھر میں بھی اس کے ساتھ مل کر رونے لگا۔

چند لمحے یوں ہی گزر گئے۔ پھر وہ روتے ہوئے بولی ''آج سے ایک سال پہلے ایک وعدہ تم نے لیا تھا مجھ سے اور میں نے دوبارہ کبھی تمھیں مڑ کے نہ دیکھا، مگر آج ایک وعدہ مجھے چاہیے تم سے، اس لیے میں نے رابطہ کیا تم سے، ورنہ کبھی تمھاری زندگی میں واپس نہ آتی ایک لمحے کو بھی۔''

میرے دل سے ایک آہ سی نکلی اور بیتے ہوئے ایک سال کا ہر ہر لمحے کے پچے ہوئے سب آنسو سارے بند توڑ کر بہہ نکلے۔

مجھے ایک سال پہلے کا وہ منظر صاف دکھائی دینے لگا، جب بابا کو بستر مرگ پر دیکھ کر ان کی خواہش کے احترام میں، میں نے پھپھو کی بیٹی مریم سے شادی کی حامی بھر لی اور اُس کی تمام محبت اور دیوانگی کو اپنی قسم دے کر ایک وعدے کا پابند کر کے خود سے دور کر دیا۔۔۔اُسے بغیر کچھ بتائے اور وہ پگلی میری محبت میں اتنی جنونی تھی کہ بغیر کچھ پوچھے بس ایک قسم کی خاطر چپ چاپ اس وعدے کی پابند ہوگئی اور دوبارہ کبھی لوٹ کر نا آئی۔

اور آج اچانک پتا نہیں کس جذبے کے تحت کس وعدے کا پابند کرنے لوٹ آئی تھی۔

میں نے لہجے کو مضبوط کیا اور پورے دل سے کہا ''تم جو کہو گی، مجھے ہر بات منظور ہے، جو وعدہ لینا چاہتی ہو۔۔۔میں نبھانے کو تیار ہوں۔ ایک آزمائش تم نے کاٹی اب اپنی محبت کو میں آزماؤں گا۔۔۔بولو! کیا وعدہ چاہیے تمھیں؟؟''

وہ دو لمحے تو چپ رہی، پھر بولی ''وعدہ کرو کہ اس واری عید تے پائے مینوں دیوو گے۔۔۔''

اور ساتھ ہی لائن خاموش ہوگئی۔

جوتا اور میڈیا

ارسلان بلوچ ارسل

چند روز قبل ہونے والے سیاہی اور جوتا حملے کے بعد کچھ دن میڈیا پر ایسی خبریں چلیں گی۔

سرکار نے جوتوں کی خرید و فروخت پر اضافی ٹیکس لگا دیا نیز جوتا خریدنے کے خواہشمند حضرات اپنا شناختی کارڈ ساتھ لائیں۔

ایک شناختی کارڈ پہ زیادہ سے زیادہ پانچ جوتے خریدے جا سکتے ہیں۔

تمام سیاسی دفاتر سیاسی جلسہ گاہوں کے باہر جوتا پارکنگ بنانے کے لیے قرارداد پیش کردی گئی۔

فورسز کی بڑی کامیابی پارلیمنٹ گیٹ سے ایک خودکش جوتا بمبار گرفتار۔

چار عدد جاپانی ساخت کے جوتوں کے جوڑے برآمد۔

چیک پوسٹ سے مشکوک آدمی کو حراست میں لے لیا گیا۔

دو لیٹر سیاہی اور تین فلی لوڈڈ پن برآمد۔

جوتوں کی خرید و فروخت پر لگی پابندی کے بعد خوشی مناتے ہوئے چند شادی شدہ افراد کے پاؤں تلے سے تب زمین نکل گئی جب ہمارے نیوز چینل نے یہ خبر چلائی کہ جوتوں پر لگی تمام پابندیاں صرف مردانہ جوتوں پر لاگو ہوتی ہیں۔

ایک لطیفہ ۔راوی: عبدالمجید ندیم

(نازک اور نفیس طبع لوگوں سے پیشگی معذرت!)

کوئٹہ ایکسپریس سے کراچی جاتے ہوئے پشاور سے آنے والوں کے ساتھ بوگی میں، مَیں واحد غیر پختون تھا۔ پختون مہمان نوازی کے لیے بہت مشہور ہیں۔ چنانچہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ سب قہوہ کا دور چلاتے اور ساتھ ہی مجھے بھی قہوہ پیش کرتے۔ دو چار مرتبہ کے بعد میں نے انکار کیا۔ لیکن ان سب کا اصرار تھا کہ میں اور قہوہ ضرور لوں۔ مجھے قہوہ پینے پر مائل کرنے کے لیے ایک نے انتہائی سادہ لہجے میں کہا "او بابا! پیو پیو! پیشاب ہی تو ہے۔"

نوٹ: مراد یہ کہ قہوہ (پانی) آخر جسم سے نکل ہی جائے گا۔

یہ درخواستیں

۱۔ایک طالب علم نے ہفتے کے پہلے دن لکھ بھیجا کہ

پہلے دن: میں بیمار ہوں، دوا لینے ہاسپٹل جانا ہے

دوسرے دن: کزن کو دیکھنے ہاسپٹل جانا ہے

تیسرے دن: بھابی کو ہاسپٹل لے جانا ہے

چوتھے دن آیا اور میں نے پوچھا کہ کیا کوئی اور نہیں گھر میں؟

بولا۔ ابا باہر ہے، ساری ذمہ داریاں مجھے ہی نباہنا پڑتی ہیں۔

۲۔درخواست آئی:

''آج مرے استاد کی شادی ہے۔ میں سکول نہیں آسکتا۔''

میں نے فوراً اس کے دئے نمبر پر کال کی۔ ماموں نے جونہی کال اٹینڈ کی، میں نے کہا کہ ''میری تو کوئی شادی وادی نہیں۔ بچے نے یہ کیسے لکھ دیا؟''

جواب ملا'' بچہ شام کو جس درزی کے ہاں کام سیکھتا ہے۔ آج اسی ''استاد درزی'' کی شادی ہے۔''

ابا آآآآآآ!

فیملی ہاسپٹل کا موڑ مڑتے ہی رس سے بھری کیتلی نے رُکنے پر مجبور کر دیا۔ گنے کے رس کی خواہش نے جلتے سورج کی برستی گرمی کی پروا بھی نہیں کی ''ایک بڑا گلاس۔۔۔ پیک کر دو۔''

رس بیچنے والے نے میری طرف ایک آشنا مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا۔ شاپر میں رس انڈیلا، تیزی سے مجھے تھما دیا۔ میں نے پیسے پکڑاتے ہوئے دائیں طرف لکڑی کے بنچ پر ایک غریب، سادہ مزدور اور اس کے کے ساتھ چمٹی تین چار سالہ بچی پر نظر ڈالی جو پسینوں میں شرابور شاید کافی دیر سے رس پینے کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ اس نے رس بھرا شاپر میرے ہاتھ میں دیکھا تو اپنے باپ کی قمیض زور سے کھینچ کر تقریباً روتے ہوئے کہا'' اباآآآآآ!''

بھگوڑے

جمعہ کی جماعت کھڑی ہونے سے عین پانچ منٹ پہلے بھاگم بھاگ پہنچ اور دوسری ہی صف میں کھڑے ہو کر چار سنتیں ادا کیں۔ جتنی دیر میں مولوی صاحب نے خطبہ دیا، مسجد کھچا کھچ بھر گئی۔ تمام بجلی کے پنکھوں، ہر کھڑکی کے باہر چلتے ایئر کولرز اور ایگزاسٹ فینز کے باوجود حبس نے سر سے پاؤں تک پسینوں میں شرابور کر دیا۔ فرض کی دو رکعت بصد مشکل، گھر جا کر اے سی کی یخ بستہ فضا میں آرام کے تصور میں ادا کیں اور دعا کے بعد ہاتھ پھیرتے ہی سب لوگ تیزی سے باہر لپکے۔ اوپر تلے، اوندھے سیدھے پڑے جوتوں کو جیسے تیسے پیروں میں اڑسا۔ گرتے پڑتے، ایک دوسرے کو دھکیلتے، آگے پیچھے کرتے نمازی مسجد کے تنگ دروازے سے گولی کی رفتار سے نکلے۔ مسجد کے عین سامنے کھیلتے ننگ دھڑنگ بچوں میں سے ایک نے قہقہہ لگا کر اپنے ساتھیوں سے کہا'' ڈیکھ اوئے! سارے بجھدے پئین'' (دیکھو! سب بھاگ رہے ہیں۔)

کالم گلوچ

سر کا پہلوان اور عقیقہ سلیمانی

اتوار کو ہم قبل از وقت نیند سے بیدار ہوئے تو حسب معمول بجلی بند تھی، بلڈنگ کی ٹینکی سے پانی بھی نہیں آرہا تھا، شدید حبس سختی سے مزاج پوچھ رہا تھا ہم نے تبدیلی کی طرف سے دھیان ہٹانے کیلئے موبائل فون سیٹ کا میوزک پلیئر آن کر کے تیار ہونا شروع کر دیا، فلیٹ کی محدود فضا میں کسی نامعلوم گلوکار کی آواز میں غزل گونجنے لگی ۔

اے باد صبا نہ چھیڑ ہمیں ہم دل کو لگائے بیٹھے ہیں
تنہائی میں کچھ یادوں کی اک دنیا بسائے بیٹھے ہیں
تو کیا جانے اے باد صبا اس تنہائی کی لذت کو
یہ پوچھ ذرا دیوانوں سے جو راز چھپائے بیٹھے ہیں

ہم نے تیار ہو کر فلیٹ کو لاک کیا اور لفٹ کے ذریعے بلڈنگ سے باہر نکل کر خراماں خراماں چلتے ہوئے سڑک پار کر کے پریس کلب میں داخل ہو گئے صحن میں بینچ پر بیٹھے ہوئے کالم نگار ای ایچ خان کے پاس رک کر ہم نے حال احوال پوچھا تو وہ ہمیں اپنا نیا موبائل سیٹ دکھاتے ہوئے پوچھنے لگے ''کیسا ہے؟''

ہم نے خوش ہو کر کہا ''اچھا ہے، کتنے میں خریدا؟''

مسکرا کر بولے ''ہال روڈ سے صرف پانچ ہزار روپے میں خریدا ہے!''

''کیا واقعی؟'' ہم حیرت زدہ رہ گئے

ہنس کر کہنے لگے ''دکاندار تو دس ہزار سے کم نہیں لیتا تھا مگر میں نے لڑ بھڑ کر پانچ ہزار میں لے لیا!''

ہم نے بھی ہنس کر کہا ''گویا آپ کہہ سکتے ہیں ----

حفیظ اہل دکاں کب مانتے تھے
بڑے زوروں سے منوایا گیا ہوں

اردگرد بیٹھے ہوئے صحافی ہنس پڑے ہم کیفے ٹیریا کی سیڑھیاں چڑھ گئے کونے والی میز پر بابائے مانیٹرنگ نوجوان صحافی کے ساتھ بیٹھے چائے پی رہے تھے ہم بھی کاؤنٹر پر کھانے کی سلپ بنوا کر ان کے پاس جا بیٹھے تو نوجوان صحافی ہم سے کہنے لگا ''حقوق نسواں کے حوالے سے چند اہم لکھاری خواتین کے نام تو بتائیں ---!''

> **ویسے عورت کی آدھی گواہی اس لئے رکھی گئی ہو گی کہ خواتین کی کسی بھی بات میں صرف آدھا سچ ہوتا ہے وہ غالباً زیب داستاں کیلئے نمک، مرچ اور مصالحہ لگا کر بات کو بڑھا دیتی ہیں۔**

بابائے مانیٹرنگ ہاتھ اٹھا کر بولے ''کا کا یہ اس کا شعبہ ہی نہیں ہے!''

ہم نے ہنس کر کہا ''حقوق نسواں کے موضوع پر لکھنے والی اردو کی معروف ادیبوں، شاعرات میں فہمیدہ ریاض، زاہدہ حنا اور کشور ناہید کے نام نمایاں ہیں اور دلچسپ اتفاق ہے کہ تینوں کا

تعلق یوپی، سی پی کے اردوداں خاندانوں سے ہے جو آزادی سے پہلے یا تقسیم ہند کے وقت آبائی علاقوں سے نقل مکانی کر کے بالترتیب حیدرآباد، کراچی اور لاہور چلے آئے تھے۔۔۔!''

بابائے مانیٹرنگ ہمیں ٹوک کر کہنے لگے ''لاہور میں مقیم صنف کے حوالے سے لکھنے والی خواتین میں ایک اہم نام محترمہ سعدیہ قریشی کا بھی ہے جن کے کالم کا عنوان ہی ''پوری گواہی'' ہے!''

ہم نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا ''یقیناً یہ عنوان عورت کی آدھی گواہی کا ردعمل ہوگا آپ کی اطلاع کیلئے عرض ہے کہ محترمہ نے جنگ اخبار کے ساتھ ہی ''پوری گواہی'' پر اصرار کرنا بھی چھوڑ دیا تھا اب وہ ملاؤں کے اخبار میں ''امکان'' کے مستقل عنوان سے کالم لکھتی ہیں۔ ویسے عورت کی آدھی گواہی اس لئے رکھی گئی ہوگی کہ خواتین کی کسی بھی بات میں صرف آدھا سچ ہوتا ہے وہ غالباً زیبِ داستاں کیلئے نمک، مرچ اور مصالحہ لگا کر بات کو بڑھا دیتی ہیں!''

دونوں نے زوردار قہقہہ لگایا اور ویٹر کے ہاتھوں سے کھانے کے برتنوں کی ٹرے گرتے گرتے بچی جو ہمارے پیچھے کھڑا غالباً جملہ پورا ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ ہم نے چاول کھا کر میز چھوڑ دی اور کیفے ٹیریا سے نکل کر لائبریری کا رخ کیا جہاں ڈیڑھ دو گھنٹے اخبارات کی خبریں اور کالم پڑھنے کے بعد رپورٹنگ روم میں جا گھسے اور نیا کالم کمپوز کرنے کے بعد پارکنگ سٹینڈ سے موٹر بائیک نکال کر پریس کلب سے نکل کھڑے ہوئے، پاک ٹی ہاؤس پہنچے تو سرکا پہلوان نے اپنی میز پر محفل جما رکھی تھی۔ ڈاکٹر خبیث شیطانی اور چھیدے بونگے کے علاوہ دو نامعلوم دانشور بھی موجود تھے جن میں سے ایک کلین شیوڈ اور دوسرے باریش تھے۔ ہم بھی علیک سلیک کے بعد کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے۔ اسی وقت قریبی مساجد سے عصر کی اذانیں شروع ہوگئیں جن کے مکمل ہونے پر کلین شیو دانشور ہم سے پوچھنے لگے ''آپ کی تعریف؟''

ہم نے شرما کر کہا ''سوری۔۔۔ میں اپنے منہ اپنی تعریف نہیں کر سکتا!''

وہ گڑبڑا کر ہمارا منہ تکنے لگے چھیدا بونگا جلدی سے ہماری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا ''یہ صحافی اور کالم نگار میم سین بٹ ہیں!''

یارو! اخباری کالموں کے لوگو میں چھپنے والی تصاویر پر بھی نادرا کا قانون لاگو ہونا چاہیے زیادہ سے زیادہ پانچ سال پرانی تصویر سے کالم نگار پہچانا جاسکتا ہے!!

وہ دانشور بوکھلا کر ہکلاتے ہوئے کہنے لگے ''ہائیں؟ یہ ہیں میم سین بٹ؟ مگر کالم کے لوگو میں چھپنے والی تصویر میں تو نوجوان لگتے ہیں۔۔۔!''

چھیدا بونگا شرارت سے گنگنانے لگا۔۔۔

عمر بھر کون جواں، کون حسیں رہتا ہے

ہم نے اسے گھور کر دیکھا کلین شیو دانشور بولے ''یارو اخباری کالموں کے لوگو میں چھپنے والی تصاویر پر بھی نادرا کا قانون لاگو ہونا چاہیے زیادہ سے زیادہ پانچ سال پرانی تصویر سے کالم نگار پہچانا جاسکتا ہے؟''

باریش دانشور بھی ہم پر حملہ کرتے ہوئے کہنے لگے ''یہ مجھے سیکولر لگتے ہیں، میں نے چند ہفتے پہلے ان کا جو کالم پڑھا تھا اس کے عنوان کیلئے انہوں نے شعر کا جو مصرع درج کیا تھا اس میں مسجد کا ذکر ہی نہیں موجود تھا۔ پورا مصرع یوں ہے

پل بنا، چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا

ڈاکٹر خبیث شیطانی ان کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے بولے ''میری نشاندہی پر بٹ صاحب نے مجھے بتایا تھا کہ انہوں نے جان بوجھ کر مصرعے میں مسجد کا لفظ نہیں لکھا تھا کیونکہ ہمارے ملک میں پہلے ہی مساجد زیادہ اور نمازی کم پائے جاتے ہیں ویسے مجھے تو آپ خود بھی سیکولر لگتے ہیں نماز پڑھنے مسجد نہیں گئے!''

اس پر محفل کشت زعفران بن گئی اردگرد کی میزوں پر بیٹھے ہوئے دانشور مڑ مڑ کر ہماری میز کی طرف گھورنے لگے، اچانک کلینچی

رنگت والی ایک جواں سالہ خاتون پاک ٹی ہاؤس میں داخل ہوئیں انہوں نے بنفشی شلوار قمیض پر سبز دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا اور پاؤں میں آسمانی رنگ کے سینڈلز پہن رکھے تھے۔ ہماری میز کے قریب رک کر کہنے لگیں ''میرا نام عقیقہ سلیمانی ہے جی اور میں اپنی نثری نظموں کا مجموعہ شائع کر رہی ہوں کیا آپ میں سے کوئی صاحب میری کتاب کا فلیپ لکھ دیں گے۔۔۔!''

ہم نے مسکرا کر کہا ''اتنی کم عمری میں شعری مجموعہ نہیں چھپوانا چاہیے کیونکہ۔۔۔!''

سرکا پہلوان ہماری بات کاٹ کر ان سے ہمارے بارے میں کہنے لگے ''کا کی! ایہہ شاعر نہیں نقاد اے، اچھے تے ایہہ ای مشورہ دینا سی، تینوں اپناں شعری مجموعہ ضرور چھپنا چاہیدا اے!''

شاعرہ مسکرا کر گنگنانے لگیں۔۔۔۔

چھیلا بابو تو کیسا اوازار نکلا
شاعر سمجھی تھی میں تنقید نگار نکلا

سب منہ پھیر کر مسکرانے لگے۔ ہم نے بھنا کر کہا ''محترمہ! آخر آپ کو اتنی جلدی بھی کیا ہے ابھی دس پندرہ برس مزید مشق کریں شاعری میں پختگی ضروری ہوتی ہے!''

جھلا کر بولیں ''میری فیملی میں خواتین کی اوسط عمر بہت کم ہے میری نانی اور ماں دونوں اکلوتی بیٹی کی پیدائش کے وقت فوت ہو گئی تھیں!''

حقوق نسواں کے موضوع پر لکھنے والی اُردو کی معروف ادیبوں، شاعرات میں فہمیدہ ریاض، زاہدہ حنا اور کشور ناہید کے نام نمایاں ہیں اور دلچسپ اتفاق ہے کہ تینوں کا تعلق یو پی، سی پی کے اردو داں خاندانوں سے ہے جو آزادی سے پہلے یا تقسیم ہند کے وقت آبائی علاقوں سے نقل مکانی کر کے بالترتیب حیدر آباد، کراچی اور لاہور چلے آئے تھے۔

ڈاکٹر خبیث شیطانی انہیں مشورہ دیتے ہوئے کہنے لگے ''شعری مجموعہ چھپوانے سے بہتر ہے کہ آپ شادی ہی نہ کریں اور اگر ایمر جنسی میں کر بیٹھیں تو پھر فیملی پلاننگ پر سختی سے عمل کریں!''

سب کھلکھلا کر ہنس پڑے شاعرہ بھی مسکراتے اور شرماتے ہوئے بولیں ''دراصل رواں ماہ اگلے بدھ کو میری سالگرہ ہے اور میں چاہتی ہوں کہ اس موقع پر میری کتاب چھپ کر مارکیٹ میں آجائے۔ ان دنوں جلد بندی ہو رہی ہے۔ بس سرورق اور فلیپ کا مرحلہ باقی رہ گیا ہے!''

ڈاکٹر خبیث شیطانی مسکرا کر بولے ''اس کا مطلب ہے کہ آپ سنبلہ برج رکھتی ہیں تب تو آپ کو اپنی علامت برقرار رکھنی چاہیے اور میرے مشورے کے پہلے حصے پر لازمی عمل کرنا چاہیے اس طرح آپ اپنے برج کے عصر میں قبل از وقت ملنے سے بھی محفوظ رہیں گی!''

عقیقہ سلیمانی ڈاکٹر خبیث شیطانی کو گھورتے ہوئے آگے

بڑھ گئیں، اسی وقت کونے والی میز پر سے جواں سالہ محقق ایل کے کھوجی اٹھ کر ہمارے پاس آئے اور پوچھنے لگے ''کیا آپ میں سے کوئی صاحب بتا سکتے ہیں کہ چیچو کی ملیاں بڑا اور قدیم قصبہ ہے یا چیچہ وطنی۔۔۔؟''

چھیدا بونگا کہنے لگا ''یہ تو وہی بتا سکے گا جس نے یہ دونوں قصبے دیکھ رہے ہوں گے میں تو زندگی میں کبھی شاہدرے سے آگے نہیں گیا!''

ایل کے کھوجی نے ہماری طرف دیکھ کر پوچھا ''سر جی! آپ نے تو دونوں قصبے دیکھ رکھے ہوں گے؟''

ہم نے نفی میں سر ہلا کر کہا ''دونوں نہیں صرف چیچہ وطنی۔۔۔ برسوں قبل دوست رانا عبدالخالق کی بارات کے ساتھ فیصل آباد سے چیچہ وطنی گیا تھا البتہ نان سٹاپ ٹرین پر لاہور سے فیصل آباد جاتے آتے چیچو کی ملیاں ریلوے سٹیشن دیکھنے سے تو یہی لگتا ہے کہ چیچہ وطنی ہی بڑا قصبہ ہوگا۔۔۔!''

چھیدا بونگا ہماری گفتگو میں دخل دیتے ہوئے ان سے کہنے لگے ''آپ نے اپنی تحقیق کا دائرہ شہر بے مثال سے بڑھا کر پنجاب بلکہ مشرقی پنجاب تک وسیع کر لیا ہے لہٰذا اپنا نام ایل کے کھوجی کے بجائے پی کے کھوجی رکھ لیں!''

دونوں کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہنے لگے ''میں ایسا ہرگز ہرگز نہیں کر سکتا۔ میرے استاد مرحوم کی روح ناراض ہوگی۔۔۔۔ مجھے کنفرم پتا چلنا چاہیے کہ دونوں میں سے بڑا قصبہ کون سا ہے اور کیا وہاں قدیم گوردوارے بھی پائے جاتے ہیں؟''

سرکا پہلوان چہلا کر بولے ''تھوڑا جیا خرچہ کر لے تے فکشن ہاؤس جا کے پروفیسر اسد سلیم شیخ ہوراں دی کتاب ''نگر نگر پنجاب'' خرید لے تینوں پنجاب دے سارے قصبیاں تے پنڈاں دا پتا چل جاوے گا!''

ایل کے کھوجی سر ہلاتے ہوئے پاک ٹی ہاؤس سے باہر نکل گئے، برابر والی میز پر بیٹھے ہوئے ایک دانشور سرکا پہلوان کو مخاطب کر کے کہنے لگے ''پہلوان جی! میں اپنے مطبوعہ طنزیہ پنجابی مضامین کا مجموعہ ترتیب دے رہا ہوں کوئی اچھا سا نام تو تجویز کر دیں۔۔۔!''

سرکا پہلوان کچھ دیر سوچ کر بولے ''کتاب داناں ٹھونگے رکھ لے!''

وہ بیگ میں سے کاغذ قلم نکال کر نوٹ کرنے لگے۔ ان کے ساتھی سرکا پہلوان سے پوچھنے لگے ''پہلوان جی! ذاتی سا سوال ہے کیا آپ نے جوانی میں کبھی عشق کیا تھا؟''

وہ انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہنے لگے ''یار دل تے بڑا کردا سی مگر دماغ سمجھا دیندا سی تے میں عقل دی گل من لیندا ساں!''

''دماغ کیا کہتا تھا؟'' چھیدے بونگے نے شرارت سے پوچھا۔

سرکا پہلوان سر اٹھا کر کچھ دیر تک خلا میں گھورتے رہے پھر گردن جھکا کر پنجابی کی نظم سنانے لگے۔۔۔

ناں نی جندڑیے ناں
کدھرے ماہی اگے بھل کے
توں کر ناں بیٹھیں ہاں
رونا پئے گا شام سویرے
وچ دریا روڑ کے تینوں
کسے نمیں پھڑنی باں
ناں نی جندڑیے ناں

اُسی وقت بیرا چائے اور کولڈ ڈرنکس لے آیا جسے پی کر ہم سب نے محفل برخاست کر دی۔

میم سین بٹ یا محمد سرفراز بٹ صاحب صحافت سے وابستہ ہیں۔ روزنامہ ''جناح'' میں ہائیڈ پارک'' کے عنوان سے کالم لکھتے تھے، اب کسی اور اخبار سے وابستہ ہو چکے ہیں۔ غالباً اس کی واحد وجہ یہی ہے جو اس کالم میں بیان کی گئی ہے۔ بٹ صاحب نے لاہور کی تاریخ پر ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ ان کے بیشتر کالموں میں لاہور سانس لیتا ہوا نظر آتا ہے۔ ''ارمغانِ ابتسام'' پر روزِ اوّل سے خصوصی کرم فرما رہے ہیں۔

امر شاہد

زبانِ یارِ من یوسفی

اگر اُس نے کچھ نہ لکھا ہوتا، تو مجھے اُس کی ذاتی زندگی کے بارے میں کچھ جاننے کی خواہش، کبھی پیدا نہ ہوتی!

کیٹس نے یہ شیکسپیئر کے بارے میں کہا تھا، میں اِسے یوسفی صاحب سے معنون کرتا ہوں۔

''حسِ مزاح ہی دراصل انسان کی چھٹی حس ہے،
یہ ہو تو انسان ہر مقام سے آسان گزر جاتا ہے۔''

یوسفی صاحب کا یہ جملہ شاید ان کی زندگی کا نچوڑ تھا۔ ایک ہی جملے میں مسکراہٹ اور غم کو مصور کرنا ان ہی کی ادا ہے۔

ہم جیسوں کے لیے مطالعہ یوسفی خود پر کیے گئے احسان کے مترادف ہے۔ اسی لیے تو ہم قبلہ والدِ گرامی، ناشر و ادیب ''شاہد حمید'' کے شکرگزار ہیں، جنھوں نے کم عمری میں ہی مشتاق احمد یوسفی اور مختار مسعود کی کتابیں تھما دیں۔ اُن کی کتابوں سے متعدد اقتباسات ذہن میں محفوظ کرتے اور احباب کو مزے لے لے کر سناتے۔ پوری محفل کو ہر فقرے پر غور کرنا پڑتا کہ اس بات میں کون کون سے خزانے پوشیدہ ہیں۔ پھر ہوا یوں کہ یوسفی صاحب کی دی ہوئی بہت سی دلچسپ اصطلاحات ہماری گفتگو کا حصہ بن گئیں۔ کتاب سے پہلے مضمون لکھنے بیٹھے تو یوسفی ہی کی بگاڑی ہوئی ضرب الامثال کی طرز پر یہ عنوان دے ڈالا۔۔۔

''زبانِ یارِ من یوسفی''

کہ میرے یار کی زبان یوسفی ہے اور میں یوسفی کو نہیں جانتا تھا، اب کیا ہی اچھا ہو کہ ان کی زبان میرے منہ میں آجائے۔

ہم نے یوسفی سے یہ سیکھا کہ کوئی بات ایسی نہیں جو مہذب طریقے سے بیان نہ ہو سکتی ہو۔ اردو زبان کی چاشنی کیا ہے، اردو میں لکھنا کیسا ہے، یہ تو ہمیں مشتاق احمد یوسفی اور مختار مسعود کو پڑھنے سے معرفت ہوئی۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ اچھے لکھے اور کمال نثر کی پہچان انھی ہستیوں کے مطالعے میں ہے، بس یہی سمجھ نہ سکے کہ یہ دونوں ستارے کبھی کبھی لکھتے تھے۔۔۔ نہ جانے کیوں۔۔۔ اور اچھا لکھتے تھے۔۔۔ نہ جانے کیسے۔۔۔

ذوالفقار احمد چیمہ صحیح کہتے ہیں:

مولانا کوثر نیازی پاکستان سے لکھنو آئے ہوئے تھے۔ مولانا منظور نعمانی کے مکان پر وہ میرے ہمراہ گئے۔ چائے آئی۔ مولانا کوثر نیازی نے چائے کی بے حد تعریف کی اور مولانا نعمانی سے دریافت کیا کہ عموماً مذہبی گھرانوں کے گھروں پر جو چائے بنتی ہے وہ بے حد نفیس ہوتی ہے۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ مولانا منظور نعمانی نے ایک زیر لب بلیغ سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا ''بچارے ایک ہی تو چیز پیتے ہیں، اب کیا اس کو بھی خراب کر کے پئیں؟''
پوری محفل قہقہہ زار بن گئی۔

رقصِ شرر از ملک زادہ منظور احمد

''دو سالوں میں دو بہت بڑے ادیب اُٹھ گئے۔ پچھلے سال جناب مختار مسعود دُنیا سے چلے گئے، جن کے انتقال پر میڈیا نے مجرمانہ خاموشی اور بے نیازی کا مظاہرہ کیا۔ مختار مسعود اور مشتاق احمد یوسفی کے بعد اس پائے کا کوئی ادیب اس ملک میں باقی نہیں بچا۔ نوجوانوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ قوموں کو نئے اور بڑے خواب دکھانے اور ان کی سمت کا تعین کرنے کا کام فلمی ایکٹر، ایکٹریسیں یا مال بنانے والے سیاست باز نہیں، وہاں کے ادیب اور شاعر کرتے ہیں۔ اس لیے ان کے اُٹھ جانے سے اس قوم کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے۔''

مگر اَب تو قحط الرّجال کا دَور دکھائی دیتا ہے۔ ڈر لگتا ہے، کہیں ایسا اچھا لکھنے والے ناپید نہ ہو جائیں۔ آخر کب تک ہم یہ شعر پڑھیں گے ۔

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں، ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم، اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم

اِس بات کا ادراک مختار مسعود کے اس شہرۂ آفاق جملے سے بھی ہوا جو بعد میں ان کی پہچان بن گیا:

''قحط میں موت ارزاں ہوتی ہے اور قحط الرجال میں زندگی۔ مرگ انبوہ کا جشن ہو تو قحط، حیات بے مصرف کا ماتم ہو تو قحط الرجال۔ ایک عالم موت کی ناحق زحمت کا، دوسرا زندگی کی ناحق تہمت کا۔ ایک سماں حشر کا دوسرا محض حشرات الارض کا۔ زندگی کے تعاقب میں رہنے والے قحط سے زیادہ قحط الرجال کا غم کھاتے ہیں۔''

(آوازِ دوست، ص ۴۷)

پھر موجودہ پڑھنے والوں کی حالت دیکھ کر یہ خوف بھی آنے لگتا ہے کہ

''بڑے آدمی انعام کے طور پر دیئے اور سزا کے طور پر روک لیے جاتے ہیں۔''

(آوازِ دوست، ص ۷۰)

مگر یہ سوچ کر خود کو تسلی دیتے ہیں کہ

''بڑے آدمی زندگی میں کم اور کتابوں میں زیادہ ملیں گے۔''

(آوازِ دوست، ص ۵۰)

ایک بڑا ادیب صرف اپنے لکھے سے ہی عظیم نہیں بنتا، وہ اپنی گفتگو اور عمل سے بھی اپنے کردار کی عظمت باور کراتا ہے۔
نجیب حبیب اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں:

''مشتاق احمد یوسفی یو بی ایل کے پریزیڈنٹ رہ چکے تھے۔ جب میری پوسٹنگ یو بی ایل ڈیفنس سوسائٹی برانچ کراچی میں تھی تو آپ کو یوٹیلیٹی بلز جمع کرانے کی قطار میں کھڑا دیکھا۔ اُٹھ کر باہر گیا، کہا سر اندر تشریف لے آیئے، بل جمع ہو جائے گا، آپ تو اس بینک کے سربراہ رہ چکے ہیں۔ اندر آنے سے انکار کر دیا۔ جب بل جمع ہو چکا تو اندر تشریف لائے اور شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ اگر میں ہی کیو (Queue) سے نکل گیا تو پھر یہ قوم کیسے کیو

(Queue) میں کھڑی ہوگی۔"

بعض لوگ یوسفی صاحب کو صرف ایک مزاح نگار کی حیثیت سے لیتے ہیں، اُن کے قلیل مطالعے پر صرف افسوس کیا جا سکتا ہے۔ میری نگاہ میں یوسفی صاحب اُردو نثر کے شہنشاہ ہیں۔ انہیں "ابوالعصر" کہنا چاہیے۔ اُردو شاعری میں جو مقام مرزا غالب کا ہے وہی نثر میں بلاشبہ مشتاق احمد یوسفی کا ہے۔

مشتاق احمد یوسفی کو پڑھنے کا اصل لطف ان کی تخلیقات کو حرف بہ حرف پڑھنے میں ہے، شانِ یوسفی تبھی سمجھ میں آئے گی۔

مشتاق احمد یوسفی طویل علالت کے بعد بدھ کے روز کراچی میں ستانوے برس کی عمر میں انتقال کر گئے۔ یوسفی صاحب تو چلے گئے، ان کا عہد مگر تمام نہیں ہوا، یہ جاری ہے۔ مشتاق احمد یوسفی تو وہ شخصیت ہیں جن کے "چراغ تلے" بھی روشنی ہے۔

ڈاکٹر ظہیر فتح پوری نے بجا کہا تھا کہ

"ہم اُردو مزاح کے عہدِ یوسفی میں جی رہے ہیں۔"

اس میں بس اتنا اضافہ کر لیں کہ

"ہم اُردو مزاح کے عہدِ یوسفی میں زندہ رہیں گے۔"

افتخار عارف نے بھی کہا تھا:

"یوسفی صاحب اور نہ ان کی کتابیں کبھی بوڑھی ہوں گی۔"

بلاشبہ معیار کو میعاد کا کوئی خوف نہیں ہوتا، سو عہدِ یوسفی کو بھی کوئی دھڑکا نہیں۔ یوسفی مرحوم کو بے شمار ایوارڈز سے بھی نوازا گیا اور حق تو یہ ہے کہ اس سے ان ایوارڈز ہی کی قدر و قیمت بڑھی۔ اس لیے ہائے یوسفی اور آہ یوسفی، اناللہ۔۔۔اور مغفرت کی دُعا سے ذرا پرے دیکھنے کی ضرورت ہے۔

ستانوے برس عمر، نہایت تابناک اور کامیاب زندگی، ادیب ایسے کہ تاریخ ادبِ اُردو میں پانچ یا دس چنیدہ نثر نگاروں کا نام لیا جائے تو ان کا نامِ نامی اس میں شامل۔۔۔ایسی حیات کا ماتم نہیں جشن منانا مقصود ہے۔

رضا علی عابدی نے درست کہا ہے کہ

ایک نئی شاعرہ کو لے کر ایک شاعر فراق کے ہاں گئے۔ شاعرہ کی غزل سُن کر فراق بولے "غزل بھی کہنے والے نے غنیمت کہی ہے، آواز بھی اچھی ہے، ماشاءاللہ شکل و صورت بھی بُری نہیں، آپ (شاعر سے) تھوڑا سا چال چلن خراب کر لیجیے، مشاعروں کے حوالے سے ہندوستان گیر شہرت کے حامل ہو جائے گا۔"

"میرا مشورہ ہے کہ یوسفی صاحب کی یاد میں ماتمی جلسے نہ کیے جائیں۔ ایسی کامیاب اور بھرپور زندگی کوئی جی سکتا ہے تو جی کر دکھائے۔"

بقلم یوسفی،

"پھول جو کچھ زمین سے لیتے ہیں، اس سے کہیں زیادہ اسے لوٹا دیتے ہیں۔"

بے شک یوسفی صاحب! آپ نے اپنے حصے سے بہت زیادہ لوٹایا ہے۔

وہ مرا نہیں
میں کہہ نہیں سکتا
اور میں نہیں کہوں گا کہ وہ مر گیا ہے
وہ بس دُور چلا گیا ہے
ایک خوش گوار مسکراہٹ کے ساتھ، ہاتھ ہلاتے ہوئے
وہ ایک نامعلوم دُنیا کی سیر کر رہا ہے
وہ ہمیں خواب دیکھتا چھوڑ گیا ہے

(جیمز وٹکومب)

مبشر علی زیدی بھی صحیح کہتے ہیں:

"بڑے ادیب مرتے نہیں۔ بس لکھنا چھوڑ دیتے ہیں۔"

چراغ تلے، خاکم بدہن، زرگزشت، آبِ گم اور شامِ شعرِ یاراں ایسی کتابوں کے مصنف، کرنل محمد خان، ابن انشا، سیّد ضمیر جعفری اور مشفق خواجہ ایسے لکھاریوں کے ممدوح، ستارۂ امتیاز اور ہلالِ امتیاز ایسے تمغوں کے حامل جناب مشتاق احمد یوسفی ہمیں

شوکت تھانوی نے مولانا اشرف تھانوی کے بارے میں ایک دلچسپ واقعہ سنایا، کہنے لگے کہ میرا مشاعروں میں شرکت کا ابتدائی زمانہ تھا کہ قادیان سے مشاعرے کا دعوت نامہ آیا۔ والد نے جانے کی اجازت نہ دی کہ وہاں کے لوگ قادیانی مذہب کی تبلیغ کرتے ہیں۔ میرا اصرار بڑھا تو وہ مجھے مولانا اشرف تھانوی کے ہاں لے گئے مگر اُنھوں نے مجھے فوراً اجازت دے دی۔ واپسی پر میں نے پوچھا کہ مولانا قادیانی تبلیغ کے خطرے کے باوجود آپ نے مجھے آسانی سے وہاں جانے کی اجازت کیوں دے دی تھی؟
مولانا مسکرا کر بولے ''میاں جب تمھیں اپنے مذہب ہی سے دلچسپی نہیں ہے تو تم دوسروں کے مذہب میں کیا دلچسپی لو گے۔ تمھارا جہاں جی چاہے گھومتے رہو، تم پر کوئی اثر نہیں ہو گا۔

رقصِ شرر از ملک زادہ منظور احمد

سمجھ گئے کہ مزاح کیا ہے!

ظرافت اور فنِ مزاح نگاری کے بارے میں دنیا بھر کے دانشوروں نے لکھا ہے، یوسفی نے بھی اس فن کی وضاحت اپنے مخصوص انداز میں کی ہے:

''یہ کھٹ مٹھے مضامین طنزیہ ہیں یا مزاحیہ یا اس سے بھی ایک قدم آگے، یعنی صرف مضامین، تو یہاں اتنا عرض کرنے پر اِکتفا کروں گا کہ وار ذرا اُوچھا پڑے، یا بس ایک روایتی آنچ کی کسر رہ جائے تو لوگ اسے بالعموم طنز سے تعبیر کرتے ہیں، ورنہ مزاح ہاتھ آئے تو بت، ہاتھ نہ آئے تو خُدا ہے اور جہاں یہ صورت ہو تو خام فن کار کے لیے طنز ایک مقدس جھنجلاہٹ کا اظہار بن کر رہ جاتا ہے۔ چنانچہ ہر وہ لکھنے والا جو سماجی اور معاشی ناہمواریوں کو دیکھتے ہی دماغی باؤنڈے میں مبتلا ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے، خود کو طنز نگار کہنے اور کہلانے کا سزاوار سمجھتا ہے۔ لیکن سادہ و پُرکار طنز ہے بڑی جان جوکھوں کا کام۔ بڑے بڑوں کے جی چھوٹ جاتے ہیں۔ اچھے طنز نگار تنے ہوئے رسّے پر اِترا اِترا کر کرتب نہیں دکھاتے بلکہ
رقص یہ لوگ کیا کرتے ہیں تلواروں پر''

(پہلا پتھر، مقدمہ 'چراغ تلے')

یوسفی صاحب نے ایک انٹرویو میں کہا تھا:

''جو کمزور ہے اس پر مزاح نہیں ہونا چاہیے اور مزاح کا مرکز نہیں ہونا چاہیے۔ آپ اگر حملہ کریں تو اپنے سے طاقتور پر حملہ کریں، تب مزہ ہے۔ اپنے سے کمزور پر یا لاچار پر اس کا کیا مذاق اڑانا۔''

اپنے سے کمزور کے مزاح اتنے نازک ہوتے ہیں کہ آپ کوئی سیدھی بات بھی کریں تو مخاطب اسے اپنے حق میں طنز سمجھتا ہے۔ شاید اسی لیے یوسفی نے کوشش کی ہے کہ طنز و مزاح کی آمیزش کم سے کم نظر آئے۔

مشتاق احمد یوسفی کی تمام تحریروں کا ہر فقرہ جان دار اور مزاح سے بھرپور ہے۔ چند چمکتے جُملے ملاحظہ کیجیے:

- ☆ نشہ اور سوانح حیات میں جو نہ کھلے، اس سے ڈرنا چاہیے۔
- ☆ اپنا مقدمہ بقلم خود لکھنا کارِ ثواب ہے کہ اس طرح دوسرے جھوٹ بولنے سے بچ جاتے ہیں۔
- ☆ کتاب خوب صورت بیوی کی طرح ہوتی ہے۔ دور سے کھڑے کھڑے دیکھ کر داد دینے کے لیے، بغل میں دبا کر لے جانے کے لیے نہیں۔
- ☆ آدمی ایک دفعہ پروفیسر ہو جائے، تو عمر بھر پروفیسر ہی کہلاتا ہے، خواہ بعد میں سمجھ داری کی باتیں ہی کیوں نہ کرنے لگے۔
- ☆ انسان کو موت ہمیشہ قبل از وقت اور شادی بعد از وقت معلوم ہوتی ہے۔
- ☆ دوزخ میں گناہ گار عورتوں کو ان کے اپنے پکائے

مانا کہ مرزا ہمارے مونس و غم خوار ہیں، لیکن ان کے سامنے افشائے مرض کرتے ہوئے ہمیں ہول آتا ہے۔ اس لیے کہ وہ اپنے فقیری چٹکلوں سے اصل مرض کو تو جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر پھینک دیتے ہیں، لیکن تین چار نئے مرض گلے پڑ جاتے ہیں، جن کے لیے پھر انہی سے رجوع کرنا پڑتا ہے اور وہ ہر دفعہ اپنے علاج سے ہر مرض کو چار سے ضرب دیتے چلے جاتے ہیں۔ فائدہ اس طریق علاج کا یہ ہے کہ شفائے جزوی کے بعد جی پھر علالت اصلی کے رات دن ڈھونڈتا ہے۔ اور مریض کو اپنے مفرد مرض کے مرحوم جراثیم بے طرح یاد آتے ہیں اور وہ ان کی شفقتوں کو یاد کر کر کے روتا ہے۔

بائے فوکل کلب از مشتاق احمد یوسفی

ہوئے سالن زبردستی کھلائے جائیں گے۔

☆ مرد کی آنکھ اور عورت کی زبان کا دم سب سے آخر میں نکلتا ہے۔

☆ آج کل تو بغیر ڈاکٹر کی مدد کے آدمی مر بھی نہیں سکتا۔

☆ شام کو چائے اور چلغوزے کے ساتھ غیبت بڑا مزا دیتی ہے۔

☆ محاورے تو زبان کے بڑھے ہوئے ناخن ہوتے ہیں۔

☆ اس کا تلفظ تو چال چلن سے بھی زیادہ خراب نکلا۔

☆ پاکستان کی افواہوں کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ سچ نکلتی ہیں۔

☆ تحفے طوائف دینے کا دستور تو بگڑے ہوئے رئیسوں کے زمانے سے چلا آتا ہے۔

☆ میرا خیال ہے حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ کرتے وقت جو شخص اپنے بلڈ پریشر اور گالی پر قابو رکھ سکے وہ یا تو ولی اللہ ہے یا پھر وہ خود ہی حالاتِ حاضرہ کا ذمہ دار ہے۔

☆ مجھے تو چار پر بھی اعتراض نہیں۔ لیکن چار بیویوں میں قباحت یہ ہے کہ چار دفعہ طلاق دینی پڑتی ہے۔

☆ جس بات کو کہنے اور سننے والا دونوں ہی جھوٹ سمجھیں اس کا گناہ نہیں ہوتا۔

علاوہ ازیں، یوسفی صاحب کسی ایک لفظ کی تبدیلی سے مصرعوں کو کچھ سے کچھ کر دینے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ چند ایسے ہی مصرعے ملاحظہ کریں:

ع تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ سُود خوار ہوتا

ع زمیں کھا گئی بے ایماں کیسے کیسے!

ع چلے بھی جاؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

ع کیا زنانے میں پہنچنے کی یہی باتیں ہیں؟

ع چائے کی پتّی سے گھٹ سکتا ہے عورت کا شکم

ع راحتیں اور بھی ہیں غسل کی راحت کے سوا

ع انسان خطائے نسواں کا پتلا ہے

ع آگ ''تکفیر'' کی سینوں میں دبی رکھتے ہیں

ع زیست مہمل ہے اسے اور بھی مہمل نہ بنا

ع وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ شجر تو نہیں

ع جس کو ہو دین و دل عزیز میرے گلے میں آئے کیوں

ع چہ دلاور است دزدے کہ بہ کف سراغ دارد

موجودہ حالات کو دیکھا جائے تو یوسفی صاحب کا یہ بے مثال جملہ یاد آتا ہے، لکھتے ہیں:

''کاش میرے باپ دادا بھی غدارِ وطن ہوتے تو آج ہم بھی سردارِ وطن ہوتے۔''

محترم امر شاہد معروف ادیب، افسانہ نگار اور نقاد جناب حمید شاہد کے صاحبزادے ہیں۔ تعلق جہلم سے ہے۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات کے مصداق بہت جامع، شستہ اور شگفتہ نثر لکھتے ہیں۔ ان کا مضمون پڑھ کر تازگی کا احساس جاگ اُٹھتا ہے۔ مشتاق یوسفی پر اِن کا یہ مضمون اُن کی وفات کے موقع پر لکھا گیا تھا۔ امید ہے کہ وہ آئندہ بھی ''ارمغانِ ابتسام'' کو اپنی محبتوں سے نوازتے رہیں گے۔

ارمغانِ ابتسام کا اگلا شمارہ نئے قہقہوں کے ساتھ

اردو طنز و مزاح پر مبنی دو ماہی برقی مجلّہ

ارمغانِ ابتسام

جنوری، فروری ۲۰۱۹ء

مُدیر:

نوید ظفر کیانی